

ماہنامہ
کرن
مارچ 2024
www.Pklibrary.com
www.Pklibrary.com

چاند نگر گروپ آف پبلیکیشنز

کرن

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

انٹرویو

ناول

ناولٹ

بانی ——— محمود بابر فیصل
نگراں ——— محمود ریاض
مدیرہ ——— نادرہ خاتون
مدیرِ اعلیٰ ——— عامر محمود
نائب مدیرہ ——— شعاع عمیر
مدیرہ خصوصی ——— امت الصبور
قانونی مشیر ——— نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈوکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

مکمل ناول

افسانے



واٹس ایپ
0317 2266944

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) ——— 1,800 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، یورپ — 25000 روپے
سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں
subscriptions@khawatoondigest.com

کرن کتاب

مستقل سلسلے

مارچ 2024
جلد 45 شمارہ 12
قیمت 150 روپے

خط و کتابت کا پتہ
کرن
37- اردو بازار کراچی

مدیرہ



رمضان المبارک کا آغاز ہو چکا ہے۔ یہ شمارہ ملے گا تو آپ رمضان المبارک کی برکتوں سے فیض یاب ہو رہی ہوں گی۔ رمضان المبارک میں عبادتوں کا دورانیہ بڑھ جاتا ہے۔ پورا سال قرآن پاک کی تلاوت نہ بھی کریں تو رمضان المبارک میں ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ قرآن پاک کی زیادہ سے زیادہ تلاوت کر کے نیکیاں کمائی جائیں۔ قرآن پاک کی تلاوت کا بہت اجر و ثواب ہے۔ اس کی تلاوت سے ہماری نیکیوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہم قرآن پاک پڑھتے تو ہیں لیکن اس کے معنی و مفہوم سے نا آشنا رہتے ہیں۔ اس کتاب میں اللہ تعالیٰ نے زندگی گزارنے اور دین و دنیا کو سنوارنے کے لیے جو احکامات دیے ہیں، ان سے آگاہی نہیں ہوتی۔ کلام الٰہی کو اپنی زندگی کے لیے نظام عمل بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم قرآن پاک کا مفہوم اور معنی سمجھیں۔ قرآن پاک کو ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ پڑھیں، تاکہ اس پیغام الٰہی کو سمجھ سکیں جو اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کے ذریعے ہم تک پہنچایا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا کرم اور احسان ہے کہ کرن نے ایک اور سال کی مسافت کامیابی سے طے کر لی ہے۔ اپنی عمر کے 46 سال پورے کر کے 47 ویں سال میں قدم رکھ رہا ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کی بے مثال پذیرائی کے بعد محمود ریاض صاحب نے کرن کا اجراء کیا۔ محمود بابر فیصل کی ادارت نے اس میں خوب صورت رنگ بھرے اور مصنفین کے تعاون نے اس پرچے کو کامیابی کی منزلوں تک پہنچایا۔

ہم اپنی مصنفین کے تہ دل سے ممنون ہیں جنھوں نے اپنی بہترین تحریروں سے کرن کو نوازا۔ کرن کی کامیابی میں ان کا بڑا حصہ ہے۔

محمود ریاض صاحب، محمود بابر فیصل اور بہت سی مصنفین آج ہمارے درمیان نہیں۔ ہم ان کی مغفرت کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں۔ قارئین سے درخواست ہے کہ وہ دعا کریں اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں اعلا مقام سے نوازے۔ آمین۔

ہم اپنی قارئین کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں جن کی محبتوں اور پذیرائی نے ہماری حوصلہ افزائی کی اور کرن آگے بڑھتا رہا۔ ہماری دعا ہے کہ آپ سب اسی طرح ہمارے ساتھ رہیں۔ آمین

ساجدہ حبیب بھی رخصت ہوئیں

ساجدہ حبیب بہت پیاری شخصیت کی مالک، بہت اچھی مصنفہ اس دار فانی سے رخصت ہو گئیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

ساجدہ حبیب کو اللہ تعالیٰ نے محبتوں کی مٹی سے گوندھ کر بنایا تھا۔ دوستوں، عزیزوں، رشتہ داروں ان کے دل میں سب کے لیے بے پناہ پیار تھا۔ پاکستان سے محبت کا جذبہ تو کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ ان کی تحریریں وطن سے محبت کی آئینہ دار ہیں۔

اللہ تعالیٰ ساجدہ حبیب کی مغفرت فرمائے اور ان کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔ (آمین)



فراقِ نبیؐ میں جب آنسو بہائے
ستارے بہت دیر تک مسکرائے

محمدؐ کا اعزاز اللہ اکبر
خدا اور بندے کے خود ناز اُٹھائے

مرا دل ہے منسوب یادِ نبیؐ سے
شبِ غم سے کہہ دو کہیں اور جائے

شکن در شکن وہ محمدؐ کے گیسو
محیط دو عالم وہ رحمت کے سائے

نظر میں بسی ہے بہارِ مدینہ
خزاں آ کے اب مجھ سے نظریں ملائے

خوشا حسنِ اخلاق شاہِ مدینہ
جو کافر بھی تھے شرما کے ایمان لائے

خمار اس کا بخت رسا اللہ اللہ
مدینے پہنچ کر جو واپس نہ آئے

خمار بارہ بنکوی



تمہیں دیکھا کبھی ہم نے ہے اپنوں کی جفاؤں میں
کبھی غیروں کی عزت میں کبھی ان کی اداؤں میں

حدیثوں کے جواہر میں تو قرآں کی صداؤں میں
جبینِ شوق کے سجدوں میں رحمت کی گھٹاؤں میں

کبھی ماں باپ کی اُلفت، محبت میں وفاؤں میں
کبھی ان کی عطا کردہ حسین میٹھی دُعاؤں میں

کبھی دردِ جگر میں تو کبھی کامل شفاؤں میں
شبِ فرقت کی وحشت میں تو اس دل کی خزاؤں میں

صداقت میں، عدالت میں، سخاوت میں، شجاعت میں
ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ کی ان اداؤں میں

زمانے کی کسی بھی چال پر دل ٹوٹ جائے تو
ترا ہی نام ہوتا ہے مرے دل کی صداؤں میں

مجھے تسلیم ہے سب کچھ لٹا آیا ہوں، گنا ہوں میں
کھڑا ہوں اب فقط "لا تقنطو" کی پاک چھاؤں میں

محمد زبیر نازؔ

سالگرہ نمبر



باتوں سے پھول جھڑتے ہیں

شاہین رشید

ایک فن کار زندگی کو جتنے زاویوں اور جتنی صورتوں میں دیکھتا ہے وہ ایک عام شخص کے دائرے سے باہر ہوتا ہے۔ ان میں خیالات پیدا کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ جو سوچتے ہیں وہ اچھوتا ہوتا ہے اور یہ وہ دیکھ لیتے ہیں جو عام لوگ سمجھ بھی نہیں پاتے۔ ایک فن کار زندگی کے خدوخال کو مختلف کرداروں میں ڈھال کر پیش کرتا ہے۔ وہ مختلف کرداروں میں سانس لیتا ہے، ان کرداروں کے اندر جھانک کر دیکھتا ہے۔ ہماری مصنفین کا شمار بھی انہی حساس فن کاروں میں ہوتا ہے۔

سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں

خواتین کے عالمی دن اور "ماہنامہ کرن" کی سالگرہ کے حوالے سے مصنفین سے دو سوال کیے ہیں۔

1۔ "ماہنامہ کرن" سے آپ کا تعلق کتنا پرانا ہے؟ ماہنامہ کرن میں لکھنے کی وجہ کیا تھی اور پہلی تحریر کون سی تھی۔"

2۔ "وجود زن سے ہے کائنات میں رنگ" آپ اس سے کتنا اتفاق کرتی ہیں؟

نازیہ کنول نازی......رائٹر

1۔ "کرن سے تعلق بہت پرانا ہے۔ یہی کوئی دس پندرہ سال پرانا اور اس میں لکھنے کی جو بنیادی وجہ تھی وہ کرن کی مدیران تھیں۔ ان کی محبت تھی۔ حوصلہ افزائی تھی۔ شفقت تھی اور اپنائیت تھی کہ مجھے حوصلہ ملا۔ اور سب سے مزے کی بات یہ کہ آج تک کرن میں میری کوئی تحریر رد نہیں ہوئی اور جو تحریر بھی شائع ہوئی خواہ وہ میرے اپنے معیار پر پوری نہ اترتی ہو لیکن میرے قارئین نے اور میری مدیران نے نہ صرف پسند کی بلکہ حوصلہ افزائی بھی کی۔ تو جناب کرن کو میں اپنے دل کے بہت قریب پاتی ہوں۔ جہاں تک پہلی تحریر کی بات ہے تو اب یہ بات بہت پرانی ہوگئی ہے اور مجھے ٹھیک طرح سے یاد بھی نہیں

ہے۔ لیکن الحمدللہ میں نے "کرن" میں بہت لکھا اور جتنا بھی لکھا سب شائع ہوا، اور ان سب کا مجھے بہت اچھا فیڈ بیک بھی ملا۔

2۔ "جی ہاں میں اس بات سے اتفاق کرتی ہوں کہ وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ، نہ صرف رنگ ہے، رونق بھی ہے، بہار بھی ہے اور کائنات کا جو سارا سسٹم چل رہا ہے عورت کی وجہ سے ہی چل رہا ہے۔ مرد حضرات کے کاروبار اور روزگار کی وجہ 80 فیصد خواتین ہیں مثلاً جیولری، میک اپ، چوڑیاں اور دیگر لوازمات ان سب سے مرد حضرات وابستہ ہیں اور خوب کمارہے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے تخلیق کا جو مشکل ترین کام ہے وہ بھی عورت کے ذمہ کیا ہے۔ عورت کا اس معاشرے کے اندر بہت اہم ترین رول ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ آپ کسی کے باپ ہیں، بھائی ہیں، بیٹے ہیں اور شوہر ہیں تو اپنا کردار جانفشانی اور ایمانداری سے نبھائیں تاکہ اللہ کی رحمتیں اور نعمتیں آپ پر نازل ہوتی رہیں۔

سمیعہ عمیر......رائٹر



1۔ "2021ء میں میری پہلی کہانی "کرن" میں شائع ہوئی تھی نام تھا "دستور وصل"۔ کہانی لکھی تو طویل ہوگئی۔ اور پھر اس کا موضوع ایسا تھا کہ "شوہر جنسی تشدد کرتا تھا" ایک سینئر رائٹر نے کہا کہ ایسی کہانیاں نہیں لگتیں، کنواری بچیوں میں خوف وہراس پیدا ہوتا ہے۔ میں نے حقیقت سے قریب تحریر لکھنے کے لیے اصلی وکٹمز سے ریسرچ کی تھی۔ اب مجھ پر ان کا بھی قرض تھا کہ اس کو عوام تک پہنچاؤ۔ احتشام شامی، مجھ سمیت بہت سے رائٹرز کے فیس بک پیج چلاتے ہیں۔ بہت ہی نفیس انسان ہیں۔ انہوں نے مجھے "روبینہ آپا" کا نمبر دیا کہ ان سے رابطہ کریں بہت اچھا گائیڈ کرتی ہیں۔ یوں میں کرن کی محفل میں بطور رائٹر آئی۔ کرن میرے نزدیک وہ حوصلہ مند ادارہ ہے، جو تلخ حقیقت کو جگہ دیتا ہے بعد میں، میں نے وقت حاضر کے "قوم لوط" کے فتنے پر قلم اٹھایا تو اس کو بھی کرن نے ہی شائع کرکے بہادری کا ثبوت دیا۔"

2۔ "عورت تو وہ انمول جنس" ہے کہ باہر ایک "Trans" نامی نیا فتنہ چھڑ گیا ہے جوق در جوق لوگ عورت بننا چاہتے ہیں۔ ویسٹ بھی اس سے دکھی ہے۔ ابھی اولمپکس میں بھی خواتین کے سوئمنگ مقابلوں میں ایک ٹرانس پر بین لگا ہے کہ جتنی مرضی سرجری کروالو عورت نہیں بن سکتے۔ مسلمان عورت پردے میں رہ کر منشور بناتی تھی۔ جنگوں میں بھی اترتی تھی۔ آج بھی ہر شعبے میں عورت اپنی ذہانت سے آگے ہے۔ عورت ایک ساتھ چار کام کررہی ہوتی ہے۔ ایک دفعہ میرے میاں نے کہا کہ میں ڈرائیونگ کرتے بچہ کیسے دیکھوں، میں نے کہا کہ جیسے بچہ دیکھتے ہوئے میں دنیا جہاں کے کام کرتی ہوں آپ بھی ویسے عورت بنیں عورت...... یہ تو خیر مذاق تھا۔ اور عورت سے کائنات میں صرف رنگ نہیں ہے جذبات بھی ہیں اور استقامت بھی ہے۔"

عندلیب زہرا......رائٹر

سب سے پہلے تو کرن ڈائجسٹ کو اپنی کامیابیاں سمیٹنے پر مبارک باد۔

1۔ ”کرن ڈائجسٹ ایک شناسا مہربان کی طرح ہمارے گھر آتا تھا جب میں بچوں کے رسائل پڑھتی تھی۔ لیکن ”کرن کتاب۔ مجھے شروع سے ہی پسند تھی۔ باقاعدہ تعلق 2016ء سے قائم ہوا جواب تک قائم ہے۔

سب سے پہلے میں نے کرن کتاب کے لیے ”آپ کا باورچی خانہ“ میں پوچھے گئے سوالات کے جوابات دے کر تین ماہ کے لیے کرن ڈائجسٹ حاصل کیا تھا۔ پھر انہی دنوں افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ پہلا افسانہ ستمبر 2017 میں شائع ہوا۔ جس کا عنوان ”ہم لوگ“ تھا اس کہانی کو پسند کیا گیا اور پھر کرن ڈائجسٹ سے تعلق مضبوط ہوتا گیا۔ مجھے خواتین ڈائجسٹ کے ادارے کے یہ تینوں رسالے معتبر لگتے ہیں اور یہاں سیکھنے کے مواقع بھی ہیں اور یہ تعلق روبینہ واحد صاحبہ نے مزید مضبوط کیا ہے۔ جو میری ہر تحریر کا عمیق جائزہ لیتی ہیں۔ واضح رائے رکھتی ہیں۔“

2۔ ”بالکل جناب۔ کائنات کی تصویر میں رنگ بنت حوا ہی بھرتی ہے۔ یہ جس رشتے میں ہے اس کی موجودگی سے رونق، چہل پہل ہی معلوم ہوتی ہے۔ اگر گھر میں عورت نہیں ہے مطلب بیٹی، بہن، ماں اور بیوی تو وہ گھر سرائے معلوم ہوتا ہے۔ مرد کو جذباتی سہارا عورت کے رشتے سے ہی ملتا ہے۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اس کے بنا تو آدم کی جنت بھی ادھوری، اداس اور بے رنگ تھی۔ لیکن بنت حوا کے رنگ کائنات میں تب ہی چمکدار دکھتے ہیں جب اسے عزت، تحفظ اور بنیادی حقوق حاصل ہوں کیونکہ یہ نازک آبگینہ ہے۔“

عفت سحر......رائٹر

”تمام قارئین کو السلام علیکم اور نئے سال کے لیے نیک خواہشات اللہ کریم یہ سال اور آنے والے ہر سال آپ سب کے لیے برکت و عافیت سے بھرپور رکھے۔ (آمین)“

1۔ ”سروے کے سوالات ملے تو پہلا ری ایکشن یہی تھا کہ ”میں نے تو کبھی ”کرن“ میں لکھا ہی نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیوں نہیں لکھا؟ تو اس کا جواب ازلی سستی ہے۔ خواتین شعاع بچپن سے پڑھ رہی ہوں جب اردو پڑھنا آ گئی۔ خواتین میں 2005ء سے لکھنا شروع کیا یعنی اٹھارہ سال ہو گئے ہیں۔ آج بھی اپنی پیاری دوست مہوش افتخار کا سلسلہ وار ناول پڑھتی ہوں، دل کے بہت قریب ام طیفور کا ناول بھی پڑھتی ہوں۔ ایمل رضا کا ناول بھی میرا پسندیدہ ہے۔

میں اگر صرف افسانے یا مکمل ناول لکھتی تو قارئین کو اندازہ ہو جاتا کہ میں لکھنے کے معاملے میں کتنی سست ہوں مسلسل اکسانا پڑتا ہے مجھ سے کچھ لکھوانے کے لیے۔ خواتین ڈائجسٹ میں یکے بعد دیگرے تین قسط وار ناول لکھے تو پڑھنے والوں کو لگا ہوگا کہ ”ارے واہ، یہ تو ہر ماہ میں لکھتی ہیں۔“ کیونکہ قسط وار لکھنے والی رائٹرز دو تین سال تک قارئین سے مشرف بہ ملاقات رہتی ہیں تو میں لکھنے کے معاملے میں بسیار نویسی کی بالکل بھی قائل نہیں ہوں۔ کرن میں لکھنے کو دل کرتا تھا بلکہ سوچتی تھی کہ ملک میں شائع ہونے والے تمام ہی رسائل میں لکھ کر دھوم مچا دینی ہے یہ وہ۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن سب عزائم کا تعلق سوچوں اور خیالوں تک رہا بہ وجہ سستی و کاہلی، تو بس۔ کرن ڈائجسٹ کی پیاری قارئین میری سستی کی وجہ سے میری تحریروں سے محروم رہیں۔ ورنہ اس ادارے کے سب ہی ڈائجسٹ مجھے بہت پیارے ہیں۔“

2۔ ”وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ۔ واہ واہ کیا ہی مصرعہ کہہ دیا شاعر نے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ اگر عورت نہ ہوتی تو یہ کاٹن، لان لینن اور وول کے خوب صورت شیڈز اور ڈیزائن کہاں دکھائی دیتے۔ مرد ایک دوسرے کے کپڑوں کے سفید، گرے براؤن رنگ دیکھ دیکھ کر ہی

بور ہو جاتے۔ (ہاہاہا)''

''سنجیدہ جواب یہ ہے کہ عورت کے وجود سے ہی مرد کی زندگی مکمل ہے۔ بابا آدم کی دل بستگی اور تنہائی دور کرنے کے لیے اماں حوا کو پیدا کیا گیا اور آج کی عورت گھر بار، شوہر، بچے، سسرال سنبھالنے سے لے کر کھیت کھلیان میں کام کرنے اور جہاز اڑانے تک ہر شعبے میں آگے ہے اور ملکی ترقی اور خوشحالی میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ ''ادارہ خواتین'' کی ہی مثال لیں تو مردوں کے ساتھ ساتھ یہاں خواتین کی محنت پھر ہم بچپن سے دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ تو زندگی کا کوئی بھی شعبہ عورت کے رنگ کے بنا پھیکا ہے۔ اسے اپنے شانہ بشانہ کھڑا کیجیے یہ آپ کو کبھی مایوس نہیں کرے گی۔''

قرۃ العین خرم ہاشمی...... رائٹر



کرن سے وابستہ تمام لوگوں کو سالگرہ کی بہت مبارک باد بلاشبہ کرن ڈائجسٹ نے اپنے معیار کو برقرار رکھتے ہوئے بہت تیزی سے ترقی کا سفر طے کیا ہے امید اور دعا ہے کہ یہ سفر اسی طرح جاری رہے گا۔

1۔ ''کرن سے تعلق تو بہت پرانا ہے۔ ادارے کے زیر نگرانی شائع ہونے والے تینوں شمارے ہمیشہ نظر کے سامنے رہے ہیں۔ کرن ڈائجسٹ میں پہلی تحریر 2015ء میں شائع ہوئی۔ مکمل ناول ''زندگی خاک نہ تھی'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ کرن ڈائجسٹ کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ نئے رائٹرز کی ہمیشہ بہت حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ نئے موضوعات پہ کام کرنے کو یا لکھنے کو پسند کرتے ہیں۔ تحریر کے بارے میں آگاہ بھی ضرور کرتے ہیں۔ ان کے رویے میں اپنائیت ہے جو اس سے جڑے رہنے کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ کرن ڈائجسٹ کے ساتھ گزرا وقت بہت پیارا اور دل کے قریب ہے۔

2۔ اس بات سے اتفاق کرنے سے زیادہ میں مکمل یقین رکھتی ہوں کہ کائنات کے لاکھوں رنگوں میں سب سے پیارا اور انوکھا رنگ ''وجود زن'' کا ہی ہے۔ اس رنگ کی انوکھی تاثیر ہے جو مشکل حالات اور وقت کے اندھیرے کا قصہ بن کر بھی اپنی چمک نہیں کھوتی۔ ہمت، جرأت، بہادری، ذہانت، حسن، نزاکت ہر رنگ اس کے وجود کا حصہ ہے۔ اس لیے ہمیشہ اپنے مقام کو پہچان کر فخر سے حسن اور زندگی کے ہر قدم پر ضرور ثابت کریں کہ وجود زن صرف رنگ نہیں بلکہ اس کائنات کی مکمل اور خوب صورت تصویر ہے۔''

راشدہ رفعت...... رائٹر

1۔ ''سب سے پہلے تو کرن کی سالگرہ پر ڈھیروں مبارک باد قبول کیجیے۔ کرن سے تعلق بہت پرانا ہے بہ حیثیت قاری کے بھی اور بہ حیثیت لکھاری کے بھی۔ بچپن سے لڑکپن کی سرحد پر قدم رکھتے ہی ہم بہنیں خواتین، شعاع اور کرن کی قاری بن چکی تھیں۔ کرن میں پہلی تحریر کون سی چھپی تھی یہ تو اب یاد نہیں ہے کیونکہ یہ بات کوئی اٹھارہ بیس سال پرانی ہے۔ میں نے خواتین، شعاع کی بہ نسبت کرن میں کم لکھا ہے۔ لیکن سال میں ایک یا دو بار افسانے کی صورت میں کرن کی بزم میں حاضری ضرور لگوائی

ہوں۔ اگست 2023 میں آخری افسانہ چھپا تھا۔ نئے سال میں خواہش ہے کہ ناول یا ناولٹ کی صورت میں حاضر ہوں۔"

2۔ "اللہ کی کائنات بلاشبہ رنگین اور حسین ہے اور ان رنگوں کی وجہ یقیناً عورت کا وجود بھی ہے۔ عورت بذات خود خالق کی حسین مخلوق ہے، اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے۔ لیکن میں اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے عورت کے ظاہری حسن کو سامنے نہیں رکھتی۔ عورت کو خود بھی اس مصرعہ کا اہل ثابت کرنا ہوگا۔ اگر عورت ماں ہے تو اسے نسل نو کی بہترین تربیت کر کے اسے زمانے کے حوالے کرنا ہے۔ اگر وہ بیٹی ہے تو اسے ایک باحیا اور باوقار بیٹی بن کر دنیا میں جینا ہوگا۔ عورت بیوی ہے تو اسے صحیح معنوں میں شوہر کا ہمدم و غمگسار رہنا ہوگا۔ لیکن اگر عورت ایک لاپرواماں، جھگڑالو بیوی، خرانٹ ساس یا پھاپھے کٹنی ٹائپ کی نند ہے تو وہ کائنات کے رنگوں کے لیے ایک بھدا رنگ ہے سو یہ فیصلہ خود عورت کو کرنا ہے کہ زمانہ اسے کن القاب سے پکارے۔"

نایاب جیلانی......رائٹر

1۔ "کرن سے تعلق بہت پرانا ہے۔ بہت کم عمری میں ہی کرن کے گرویدہ ہو چکے تھے ہم سب۔ کرن ایک ایسا پلیٹ فارم تھا جس نے ہر لکھاری کو اپنا ٹیلنٹ آزمانے کا موقع دیا۔ سچ پوچھیں تو میں کرن کی شکر گزار ہوں جس نے مجھ جیسے بے شمار لکھاریوں کو اپنی صلاحیتیں منوانے کا بہترین موقع دیا اور ایک پہچان عطا کی۔ میں بچپن سے ہی کرن پڑھتی تھی میری والدہ سے یہ شوق مجھ میں منتقل ہوا تھا۔ 2008 یا شاید 2009 میں میرا پہلا افسانہ بھی کرن میں ہی شائع ہوا تھا۔ وہ عید کے حوالے سے ایک تحریر تھی۔ کرن کی مدیرہ بہت سوئٹ خاتون تھیں اور ان کی محبت اور اخلاق نے ہمیشہ مجھے کرن سے جوڑے رکھا، آج کرن کے حوالے سے میں "ریحانہ علی احمد" کو خراج تحسین پیش کرنا چاہوں گی کہ انہوں نے کرن کے لیے بہت سارے نایاب ہیرے دریافت کیے اور کرن کی دوسری بنیادی وجہ (لکھنے کی) ریحانہ علی احمد تھیں وہ بعد اصرار لکھوایا کرتی تھیں تو ان کے سامنے انکار کرنا ناممکن ہو جاتا تھا۔ کرن میں لکھنے کی ایک وجہ نبیلہ عزیز جیسی دوستیں بھی تھیں کہ ہم ہر مہینے ایک روٹین میں چھاپے جاتے تھے اور اس طرح ہمارے درمیان مقابلے کی فضا طاری رہتی تھی۔"

2۔ "اور میں اس بات سے اتفاق کرتی ہوں کہ وجود زن سے ہی کائنات میں ساری خوب صورتی ہے۔ مجھے تو اپنا آپ آج بھی خوب صورت محسوس ہوتا ہے کیونکہ خوب صورتی، تازگی اور سدا بہار کا تعلق دل اور جذبات سے ہوتا ہے۔ سو اس کائنات کا وجود اس لیے حسین ہے کہ اس کائنات میں ہر روپ کے اندر ایک عورت موجود ہے۔"

قرۃ العین سکندر......رائٹر

"کرن ڈائجسٹ سے تعلق بطور قاری بھی ہے اور لکھاری بھی۔ جب سے شعور کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تب سے کرن ڈائجسٹ کا مطالعہ کر رہی ہوں۔ اور یہی محبت بھراتا تا بعد ازاں لکھنے کی جانب مائل کر گیا۔ میری پہلی تحریر کرن ڈائجسٹ میں 2017 میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد چل سو چل کا معاملہ رہا۔ بہت اچھی مدیرہ ہیں اس ڈائجسٹ کی۔ میں یہاں روبینہ شریف صاحبہ کا بھی ذکر کرنا چاہوں گی کیونکہ جب میں نے لکھنا شروع کیا تو وہ ہی مدیرہ تھیں اور بہت ہی محبت سے پیش آتی تھیں۔ ہم ان کو محبت سے روبی آپی کہتے ہیں۔ ان کے بعد بھی الحمدللہ ڈائجسٹ سے محبت کا وہی ناتا استوار ہے اللہ تعالیٰ پیارے ڈائجسٹ کو دن دگنی رات چوگنی ترقی دے۔ آمین۔"

2۔ "بالکل وجود زن سے ہے کائنات میں رنگ۔ میں اس بات سے سو فیصد اتفاق کرتی ہوں۔ سب سے پہلا تعارف ایک ماں ہوتی ہے ماں کے آنچل کے آغوش سے پروان چڑھتی اولاد بتدریج

بڑھتی ہے۔ بہن کے روپ میں بھائی کا مان رکھتی ہے۔ بیوی کے روپ میں پوری گھر گرہستی سنبھالتی ہے۔ پورے کنبے کو جوڑ کر رکھتی ہے۔ دنیا کے ہر دکھ درد کا مداوا فقط ماں کی گود کی وہ حرارت ہے جہاں ہم عمر کے کسی بھی پڑاؤ پر ہوں سر رکھ کر پرسکون ہو جاتے ہیں اور ہر فکر کو دھوئیں میں اڑا کر خیر باد کہہ دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کو ہر روپ میں مکمل اور پرکشش بنایا ہے فقط شرط لازم ہے کہ وہ ہر رشتے کا مان رکھنا جانتی ہو۔"

بشریٰ احمد...... رائٹر



1۔ سب سے پہلے تو کرن کی سالگرہ پر دلی مبارک باد۔ کرن سے میرا تعلق بہت گہرا اور بہت پرانا ہے۔ میرا پہلا افسانہ کرن کی ہی زینت بنا تھا اور یہ غالباً 2003 یا 2004 کی بات ہے اس کے بعد بہت لکھا کرن میں بھی خواتین میں بھی اور شعاع میں بھی۔ لیکن چونکہ بحیثیت لکھاری میرا پہلا حوالہ اور پہچان کرن ہی تھا سو اس ڈائجسٹ سے میری دلی وابستگی ہے۔ آج کل کچھ معروفیات کے باعث لکھنے کا سلسلہ تعطل کا شکار ہے۔ تاہم اندر کا لکھاری بے چین کیے رکھتا ہے۔ بس ذرا فرصت میسر آ جائے تو کرن کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ لکھ بھیجوں گی۔"

2۔ "شاعر نے تو نہ جانے کس موڈ میں یہ مصرعہ لکھ دیا تھا جو اب ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر آج "اقبال" زندہ ہوتے فیمنسٹ قرار پاتے۔ خواتین بہر حال ای شعر پڑھ کر بہت خوشی محسوس کرتی ہیں اور چونکہ میں بھی ایک عورت ہوں تو بھلا کیوں نہیں اتفاق کروں گی اس سے...... بالکل جناب تصویر کائنات ہم عورتوں کی وجہ سے ہی رنگین ہے۔ عورت کی فطرت کا بغور مشاہدہ کیا جائے تو اس کی شخصیت پرت در پرت کھلتی ہے۔ عموی طور پر عورت کو نازک اندام اور نازک مزاج سمجھا جاتا ہے۔ جس کو سجنے سنورنے اور نخرے اٹھوانے کا شوق ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہی عورت عمر کے ہر دور میں زندگی کے ہر مرحلے پر خود کو ایک نئے سانچے میں ڈھال کر ایک نیا روپ دھار لیتی ہے۔ ایک بیٹی اور بہن سے شروع ہونے والا سفر جب اسے بیوی، بہو او پھر ماں کے درجے تک پہنچاتا ہے تو عورت گھر کا ایک ستون اور معاشرے کا باا ثر حصہ بن جاتی ہے۔ لاابالی پن سے ذہنی بالیدگی کا یہ سفر آسان نہیں ہوتا لیکن عورت یہ انہونی کر دکھاتی ہے لیکن ان سب باتوں کا مقصد مرد کی ذات کی نفی کرنا ہرگز نہیں ہے۔ عورت کے وجود سے اگر کائنات رنگین ہے تو عورت کی اپنی ذات میں رنگ "مرد" بھرتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مرد اور عورت مل کر ہی تصویر کائنات کی تکمیل کرتے ہیں۔ عورت اگر ماں ہے تو مرد فرماں بردار بیٹا ہے، عورت اگر بیٹی ہے تو مرد شفیق اور محبت لٹاتے والا باپ ہے۔ عورت اگر بیوی ہے تو مرد ہمدم و غمگسار شوہر۔ قصہ مختصر عورت اور مرد اس کائنات میں ایک توازن برقرار رکھنے میں ایک دوسرے کے مددگار اور ساتھی ہیں اور یہ ساتھ معاشرے میں مثبت رویے پروان چڑھانے کے لیے بہت ضروری ہے۔"

امت العزیز......رائٹر



1۔ ''ہماری امی خواتین اور شعاع تو منگوایا کرتی تھیں مگر کرن نہیں۔ ان دنوں شگفتہ بھٹی صاحبہ کا ''مڑ آ کے مول نہ جائیں'' کرن میں قسط وار شائع ہو رہا تھا تو امی نے کہیں پڑھ لیا۔ اس کے بعد آج بھی امی کے گزر جانے کے بعد بھی کرن سے تعلق جوں کا توں ہے۔ میرا باقاعدہ تعلق کرن سے بطور قاری نبیلہ ابر راجہ کی تحریر نے جوڑا تھا۔ ''ہیپی نیو ایئر'' میں ان دنوں ٹین ایجر تھی۔ بس نہ پوچھیں اس کے بعد تو نبیلہ ابر راجہ کی ہر تحریر ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھی۔ اور لکھنے کی وجہ۔ تو کوئی سوچی سمجھی پلاننگ نہیں تھی بس لگتا یہ تھا کہ اس ادارے سے لکھنے کی ابتداء کی جاتی ہے۔ پڑھنے کی لت تو لگ ہی چکی تھی۔ لہٰذا یہاں لکھنے کی ابتداء کی تو دو تین سال لگاتار کرن میں مسترد ہونے کے بعد 2008ء میں لکھنے کی شروعات ہوئیں۔ ان دنوں ''ریحانہ علی احمد'' کرن کی ایڈیٹر ہوا کرتی تھیں۔ میری پہلی تحریر مسترد بھی انہوں نے ہی کی۔ اور پہلی لگائی بھی انہوں نے ہی۔''

2۔ جی۔ میں بالکل اس سے اتفاق کرتی ہوں کہ عورت خواہ بیٹی ہو، بہن ہو، ماں ہو یا بیوی ہر رنگ میں ایک مکمل کائنات تصور کرتی ہوں۔ ذرا ایک پل کو اس دنیا کے کینوس سے اس کا وجود منہا کر کے دیکھیے...... ''دیکھ لیا''۔ اب بتایے یہاں دیکھنے کو باقی کیا رہ گیا ہے۔''

عنیزہ سید......رائٹر



1۔ ''اتفاق کی بات ہے کہ میرے طویل کہانی کاری دور میں میری کوئی کہانی بھی کرن ڈائجسٹ میں شائع نہیں ہوئی۔ میں نے اپنی تحاریر ہمیشہ ادارہ خواتین کو بھیجیں لیکن انہوں نے ہمیشہ شعاع اور خواتین میں ہی جگہ دی کرن میں نہیں۔ اب اس میں کیا سائنس ملوث تھی اس کا مجھے اندازہ نہیں ہے۔ شاید کرن کے لیے علیحدہ سے ماہنامہ کرن کو مخاطب کر کے کہانیاں بھجوانی تھیں یا معاملہ کچھ اور تھا۔ بہرحال یہ اتفاق میرے ساتھ ہمیشہ رہا۔ حالانکہ میں ہمیشہ سے ہی کرن کی قاری رہی ہوں اور اس میں شائع ہونے والی کئی کہانیوں کی مداح رہی ہوں۔

2۔ ''اقبال کے اس مصرعہ سے کس بدذوق کو اتفاق نہ ہوگا۔ وجود زن تو اس کائنات میں زندگی۔ روشنی کا۔ رنگوں کا۔ کھلکھلاتی ہنسی اور شام کی شفق جیسی مسکراہٹ کی علامت ہے۔ یہ وجود زن ہی تو ہے جس کی وجہ سے ہم اپنے تئیں مرد کی اس دنیا میں ذائقہ ہیں۔ سلیقہ ہیں۔ حسن ہیں۔ ترتیب ہے۔ تنظیم ہے ذرا لمحہ بھر کے لیے وجود زن کے بغیر اس کائنات کا تصور کر کے تو دیکھیں اللہ ماری کیسی بے رونق، اجڑی ہوئی، مردم بیزاری سی کائنات کا نقشہ ابھرتا ہے۔ پھیکی، نظروں کے سامنے۔ تو بھئی پھر وجود زن ہے تو ہی کائنات میں رنگ بھی ہے۔

☆☆

میری بھی سنئے

حمزہ خان

شاہین رشید

1۔ ''پورا نام/تعارف''

''میرا پورا نام حمزہ اسرار خان ہے۔ لیکن میری پہچان حمزہ خان ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میرا نام بگڑا نہیں بلکہ سب مجھے حمزہ کہہ کر ہی پکارتے ہیں۔ میری تاریخ پیدائش 28 دسمبر 1996ء ہے۔ مادری زبان اردو بھی ہے اور پنجابی بھی ہے۔ ہم چار بہن بھائی ہیں، میرا نمبر پہلا ہے۔ یعنی میں گھر کا بڑا ہوں۔ اور میرا ستارہ جدی ہے اور تعلیم بی بی اے ہے۔''

2۔ ''ٹی وی میں آمد''

''شوق لایا اس فیلڈ میں۔ ٹیلی نار کا ایک کمرشل کیا۔ بس اللہ کا کرم ہو گیا اور گھر والوں کی دعائیں۔''

3۔ ''شہرت؟''

''رمضان پلے ''ستو چدا'' نے شہرت دی اور یہی میرا پہلا ڈرامہ تھا۔''

''حوصلہ افزائی ملی؟''

''یقین کریں پاکستان کے لوگوں نے تو پسند کیا تھا۔ دیگر ممالک سے بھی تعریفی کلمات آئے۔ تو بہت حوصلہ افزائی ملی۔''

5۔ ''ڈرتا ہوں؟''

''صرف اور صرف اللہ تعالیٰ سے۔''

6۔ ''میری بری عادت؟''

''اب تو خیر کوئی نہیں ہے۔ البتہ پھر بھی لوگ بتائیں گے ہاں جب چھوٹا تھا تو بہت ضدی تھا۔''

7۔ ''میرا سورج کب غروب ہوتا ہے؟''

''ہاہاہا۔ صبح فجر کی نماز پڑھ کر سوتا ہوں تو اب آپ خود ہی سمجھ جائیں۔''



8۔ ''پہلی بار کیا کمایا تھا؟''

''پندرہ ہزار ماں کو دے دیے تھے۔ بہت خوش ہوئی تھیں۔''

9۔ ''خوش خوراک ہوں؟''

''جی جی۔ الحمدللہ۔ اور بھوک تو برداشت ہی نہیں ہوتی مجھ سے۔''

10۔ ''اگر ملک چھوڑتا ہوں تو کس وجہ سے؟''

''کیوں چھوڑ دوں۔ مجھے اپنے ملک سے بہت پیار ہے۔ اس ملک پیارے پاکستان نے مجھے نامور کیا ہے۔ چھوڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔''

11۔ ''آج کل کیا آن ایئر ہے؟''

''ڈرامہ سیریل ''دوریاں'' اور ایک دو

پروجیکٹ پر کام ہو رہا ہے۔"

12 "غصہ آجاتا ہے؟"

"جب بھوک لگی ہو اور وقت پر کھانا نہ ملے۔"

13۔ "ایک انوکھی خواہش؟"

"چاند پر پلاٹ لینا چاہتا ہوں۔"

14۔ "شوبز کی فیلڈ کیوں اچھی لگتی ہے؟"

"ایک تو اداکاری کا شوق پورا ہو جاتا ہے۔ مختلف اور قابل لوگوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ مختلف جگہوں پہ جانے کا موقع مل جاتا ہے۔"

15۔ "اور جو بات بری لگتی ہے فیلڈ میں؟"

"کہ یہاں لابی سسٹم اور پرچی سسٹم بہت ہے۔"

16۔ "کون سے دن بہت یاد آتے ہیں؟"

"بچپن کے اور اسکول کے۔ بہت ہی سنہرے دن تھے۔"

17۔ "کن چیزوں پر خرچ کر کے پچھتاوا ہوتا ہے؟"

"اپنی کار پر۔ کہ اگر نہ بھی خرچ کرتا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔"

18۔ "عمر کے ساتھ کیا فرق آیا شخصیت میں؟"

"کہ میں ذمہ داریاں محسوس کرنے لگا ہوں۔ نہ صرف ذمہ داریاں محسوس کرتا ہوں بلکہ نبھانے کی کوشش بھی کرتا ہوں۔"

19۔ "کس طرح کے کردار کرنے کو دل چاہتا ہے؟"

"جس میں جان ہو۔ خواہ وہ نیگیٹو ہوں یا پازیٹو بس چیلنجنگ ہوں۔"

20۔ "مطالعہ کا شوق ہے؟"

"بالکل ہے۔ "رومی" اور "شیکسپیئر" کو بہت پڑھا ہے۔"

21۔ "موڈ خراب ہو جاتا ہے؟"

"میں کسی کے خلاف کوئی بات نہیں سن سکتا۔ مجھے نیگیٹو گفتگو پسند ہی نہیں ہے۔"

22۔ کوئی اہم خبر سب سے پہلے کس سے شیئر کرتا ہوں؟"

"عمران اشرف (آرٹسٹ)، بھائی سے اور اپنی والدہ سے۔"

23۔ "فیلڈ میں سپورٹ کیا؟"

"عمران اشرف بھائی نے۔ سپورٹ کیا بھی اور کرتے بھی ہیں۔"

24۔ "کب دن خراب گزرتا ہے؟"

"جب صبح کے وقت چائے نہ ملے تو۔ پورا دن خراب گزرتا ہے۔"

25۔ "پہناوے میں کیا چیز بہت پسند ہے؟"

"مجھے نت نئی گھڑیوں کا بہت شوق ہے۔ اور موبائل کا بھی۔"

26۔ "کھانا گھر کا پسند ہے یا باہر کا؟"

"پہلے تو زیادہ تر باہر کا ہی کھانا کھاتا تھا مگر اب کچھ عرصے سے گھر کا کھانا اچھا لگنے لگا ہے تو گھر پر ہی کھاتا ہوں۔"

27۔ "کس کا میسج دیکھ کر دل سے خوشی ہوتی ہے؟"

"اپنے دادا کا۔ صبح سب سے پہلے انہی کا میسج آتا ہے، بہت دعائیں دیتے ہیں۔ اللہ ان کی عمر دراز کرے۔ آمین۔"

28۔ "کس آرٹسٹ سے بہت متاثر ہوں؟"

"انڈین آرٹسٹ شاہ رخ خان سے۔ ان کی جدوجہد اور کامیابیوں سے بہت متاثر ہوں۔"

29۔ "گھر میں کون فرینڈلی ہے، کون غصے کا تیز ہے؟"

"والد صاحب ہی فرینڈلی ہیں اور والد صاحب ہی غصے کے تیز بھی ہیں۔ مگر ایسے ہی غصہ نہیں آجاتا بلکہ جائز بات پر ہی آتا ہے۔"

30۔ "کس کی ناراضی برداشت نہیں؟"

"والدین کی۔ میری خواہش ہے کہ میرے والدین مجھ سے ہمیشہ خوش رہیں۔"

31۔ "بچپن کا ایک خواب جو ادھورا رہ گیا؟"

"آرمی میں جانا چاہتا تھا لیکن نہیں جاسکا۔اس کا مجھے افسوس ہے۔"
32۔"ایک کردار جو کرنا چاہتا ہوں؟"
"مجھے آرمی آفیسر کا کردار کرنا ہے۔اگر میں آرمی میں جا نہیں سکا لیکن کردار تو کرسکتا ہوں۔"
33۔"بچت کرتا ہوں؟"
"پراپرٹی کی شکل میں۔"
34۔"شادی میں کن رسموں کے بہت خلاف ہوں؟"
"مجھے جہیز کی رسم یا جہیز لینا اور دینا بالکل بھی پسند نہیں ہے۔سادگی پسند ہوں اس لیے شادی میں شور شرابا پسند نہیں ہے۔"
35۔"لوگوں کی عموماً کیا بات ناپسند ہے؟"
"دوسروں کی چھپ چھپ کر باتیں سننا۔اگر کوئی سرگوشی میں بات کر بھی رہا ہوتا ہے تو میں وہ جگہ چھوڑ دیتا ہوں۔"
36۔"ناپسندیدہ سبزی؟"
"گوبھی۔"
37۔"کب کسی کام کو کرنے کو دل نہیں چاہتا؟"
"جب میں کام پر جارہا ہوتا ہوں اور جب میں کام سے واپس آتا ہوں۔میرا کسی کام کو کرنے کا دل نہیں چاہتا۔"
38۔"گھر میں کھانے کی پسندیدہ جگہ۔"
"عموماً مجھے گھر میں چٹائی پہ بیٹھ کر کھانا کھانا بہت پسند ہے اور یہ سنت بھی ہے۔"
39۔"کون سا کام بور کردیتا ہے؟"
"انتظار۔انتظار میں ایک منٹ بھی بہت طویل لگ رہا ہوتا ہے۔"
40۔آنے والے حکمرانوں سے کیا امیدیں وابستہ ہیں؟"
"میں غیر سیاسی آدمی ہوں۔کچھ نہیں کہہ سکتا۔بس ملک میں امن وسلامتی اور قانون کی بالادستی چاہتا ہوں۔"
41۔"جھوٹ کب بولتا ہوں۔"
"ہاہاہا۔جب کوئی رول کررہا ہوتا ہوں۔"

42۔تقریب کے لیے تیار ہوکر گھر والوں کی رائے لیتا ہوں یا آئینے کی؟"
"دونوں کی۔آئینہ بھی دیکھتا ہوں کہ کیسا لگ رہا ہوں اور تیار ہوکر گھر والوں سے بھی پوچھتا ہوں کہ کیسا لگ رہا ہوں۔"
43۔"ادھار دیتا ہوں۔لیتا ہوں؟"
"دونوں صورتیں ہیں۔کبھی دینے کی ضرورت بھی پڑجاتی ہے کبھی لینے کی۔ویسے مجھے جب بھی ادھار چاہیے ہوتا ہے میں عمران اشرف بھائی سے لے لیتا ہوں۔"
44۔"بے چین ہوجاتا ہوں۔"
"جب کسی بات پر والدین میں سے کوئی ایک بھی روٹھ جائے۔کیونکہ ایک تو ناراضی برداشت نہیں پھر مجھے ہر وقت ان کی دعاؤں کی ضرورت رہتی ہے۔"
45۔گھر کا کون سا کام کرنا پسند نہیں؟"
"استری کرنا۔بہت وقت ہوتی ہے۔"
46۔"پسندیدہ کھانا؟"
"دال چاول پودینے کی چٹنی کے ساتھ۔یہ ڈش تو روز بھی پکے تو کھا سکتا ہوں۔"
47۔"اپنا ڈرامہ دیکھتا ہوں؟"
"بالکل دیکھتا ہوں اور بار بار دیکھتا ہوں۔تاکہ اپنی غلطیوں پر نظر رکھ سکوں۔"
48۔"گھر میں کون ادھر کی ادھر باتیں کرتا ہے؟"
"اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے والدین نے ہماری تربیت بہت اچھے طریقے سے کی ہے۔ہمیں تو عادت ہی نہیں ہے۔بس گھر کے باہر والوں کی کیا بات کروں۔"
49۔"کس سیاست دان کا رول کرنا چاہتا ہوں؟"
"قائداعظم کا۔کیونکہ میری نظر میں ان سے بڑا سیاست دان کوئی نہیں تھا، نہ ہے۔بہترین لیڈر بہترین انسان تھے قائداعظم۔"
50۔"بچت کی عادت کس کو ہے؟"
"امی کو ہے۔میں تو تھوڑا فضول خرچ ہوں۔"
☆☆



سالگرہ نمبر

مہوش افتخار

دامن سحاب

تینتیسویں اور آخری قسط

"بہادر! پیچھے ہٹا اسے، پاگل تو نہیں ہوگیا؟" اس کا بڑا بھائی دہل کر چلایا۔ اسفند نے باپ پر سے نگاہیں ہٹائے بنا پستول کا سیفٹی کیچ ہٹایا۔

"ہائے ہائے! میں مر گئی۔ بہادر ہائے کوئی تے پھڑے!" بی بی نے اپنا کلیجہ پیٹ ڈالا۔ "ملک صاحب کج کرو!" انہوں نے با آوازِ بلند دہائی دی۔

شور کی آواز سن کر اس کی بھابھیاں بھی وہاں بھاگی چلی آئیں لیکن اندر کا منظر دیکھ کر دونوں ہی کے حواس گم ہو گئے۔ روتی ہوئی زمرد کی نظر اپنی جیٹھانیوں پر پڑی تو وہ دیوانہ وار بھاگ کر ان سے جا لپٹی۔ اس کا پورا جسم مارے خوف کے لرز رہا تھا۔ ملک دلاور کو اپنے پور پور سے پسینہ پھوٹتا محسوس ہوا۔ ان کی رنگت زرد پڑ گئی۔

"پ۔ پتر، میری۔ میری گل سن۔ د۔ دیکھ جیسا تو سمجھ رہا ہے ویسا کج بھی نئیں۔ م۔ میں تیرا پیو ہوں میرے بچے۔ میں تجھے تکلیف دینے کے بارے میں سوچ بھی نئیں سکتا!" ان کی آنکھوں میں سراسیمگی اور لہجے میں بھی




pklibrary.com

ہوئی سی لرزش تھی۔
اسفند کے لبوں پہ اک زخم خوردہ سی مسکراہٹ آ ٹھہری۔
"مجھے بھی یہی گمان تھا کہ آپ میرے باپ ہیں۔ میری ہستی کا معتبر ترین حوالہ ہیں۔ آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کوئی تکلیف تو دور کبھی گرم ہوا بھی نہیں چھو سکتی۔ لیکن آپ نے مجھ سے پے در پے جھوٹ بول کے میرا یہ یقین بھی چھین لیا۔ مجھے ایک ایسے دوراہے پہ لا کھڑا کیا جہاں میں نہ جی سکتا ہوں نہ مر سکتا ہوں۔ نہ آپ کو اپنا کہہ سکتا ہوں نہ پرایا مان سکتا ہوں۔ مجھے جو کچھ بھی پتا چلا ہے اس کے بعد میں اگر چاہوں بھی تب بھی آپ لوگوں کا اعتبار نہیں کر سکتا۔ آپ نے مجھے اس لائق ہی نہیں چھوڑا۔ میری لاعلمی میں مجھے اپنے مقصد کے لیے استعمال کر کے آپ نے ہمیشہ کے لیے دنیا کے سب سے پاک اور معتبر رشتے کو داغدار کر دیا اباجی۔ آپ نے مجھ سے میرے ماں باپ چھین لیے ہیں۔ ان کے وجود سے جڑی خالص اور بے غرض محبت کا تصور چھین لیا ہے۔ آپ نے میرے ساتھ وہ کیا ہے جو کوئی دشمن بھی نہ کرے۔"
اس کی آواز میں اتنا سوز اور آنکھوں میں ایسا درد بھرا شکوہ تھا کہ ملک دلاور کو زندگی میں پہلی بار صحیح معنوں میں زیاں کا احساس پنے دامن سے لپٹا محسوس ہوا۔ اپنے کیے عمل پر ندامت اور پچھتاوا محسوس ہوا۔ ان کی عرق آلود پیشانی جل اٹھی اور نگاہیں ملال کے بوجھ تلے دب کر بے اختیار جھک گئیں۔ بی بی نرگس تڑپ کر آگے بڑھیں۔
"مجھے قسم ہے اپنے پیدا کرنے والی کی پتر، میں نے تجھ سے کبھی کوئی جھوٹ نئیں بولا۔ اس رات بھی میں نے جو کچھ دیکھا قرآن اٹھا کے تجھے حرف حرف بتا دیا۔ میرا رب جانتا ہے میں نے کسی کی بچی پر کوئی تہمت نئیں لگائی۔ میں نے تجھ سے کوئی گل نئیں چھپائی بہادر۔"
ان کی آہوں میں درد کا اک سمندر اور نگاہوں میں التجا تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے پستول اپنی کنپٹی سے نہیں بلکہ ماں کے سینے سے لگا رکھی ہو۔ اسفند کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ وہ چند لمحے سسکتی ہوئی ماں کو دیکھتا رہا اور پھر باپ کی جانب پلٹا۔
"آپ کی یہ خاموشی میرے ارادے کو اور بھی مضبوط کر رہی ہے اباجی۔" اس نے اپنے پستول والے ہاتھ کو ذرا سی جنبش دی تو سب بے اختیار چلا اٹھے۔ ملک دلاور کا دل اچھل کے ان کے حلق میں آ گیا۔ وہ ہڑبڑا کر تیزی سے بولے۔
"م۔ میں نے کیا تھا۔ س۔ سلویٰ کا کوئی قصور نئیں۔ اس منڈے کو میں نے اس کے کمرے میں بھیجا تھا۔"
الفاظ تھے یا کوئی صور، ہال میں اچانک ہی موت کا سا سناٹا چھا گیا۔ سب دم سادھے آنکھیں پھاڑے بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگے جو کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والی کیفیت لیے لب بھینچے گئے تھے۔
اسفند کا پستول والا ہاتھ بے جان سا ہو کر اس کے پہلو میں آ گرا۔ اس کے دل کے ایک کونے میں روشن امید کا آخری دیا بھی پھڑ پھڑا کر ہمیشہ کے لیے بجھ گیا۔ وہ چند لمحے پتھرائی نظروں سے باپ کو دیکھے چلا گیا اور پھر شکستہ حال اور نڈھال سا دوزانو زمین پہ آ گرا۔ اس کے گرتے ہی کتنے ہی قدم ایک ساتھ اس کی جانب لپکے تھے لیکن وہ ہر دنیاوی سہارے سے بے نیاز اپنے اندر برستے ملال اور پچھتاووں کے پتھروں سے نبرد آزما تھا جو اسے سنگسار کیے دے رہے تھے۔ مارے دے رہے تھے۔ جو سزا وہ سلویٰ کے نصیب میں رقم کرنا چاہتا تھا۔ قدرت نے آج وہی سزا اسے سنا دی تھی۔ اس کی اپنی زندگی ایک ایسے عذابِ مسلسل میں تبدیل کر دی گئی تھی جس کا کوئی انت، کوئی کنارہ نہ تھا۔ جو ہر لمحہ، ہر پل اسے اس نقصان کی یاد دلانے والا تھا جو وہ اپنے ہاتھوں اپنے مقدر میں لکھ بیٹھا تھا۔ وہ بے اختیار آنکھوں پر ہاتھ رکھے بچوں کی طرح سسک اٹھا۔

"بہادر، میرے بچے!" بی بی نرگس نے تڑپ کر اسے خود سے لگا لیا۔
ماں کے سینے سے لگتے ہی وہ اونچا پورا مرد یوں بکھر کر رو دیا کہ وہاں موجود ہر آنکھ اس کے دکھ پہ اشکبار اور ہر دل اس کے غم میں صدمے سے چور ہو گیا۔
ملک دلاور لڑکھڑاتے قدموں سے صوفے پہ جا گرے۔ ان میں نہ اپنے پیروں پہ کھڑے رہنے کی طاقت بچی تھی اور نہ ہی کسی اپنے سے سامنے کی ہمت۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر گرائے سختی سے آنکھیں میچ گئے۔
اسفند ماں کی آغوش میں منہ چھپائے تڑپتا رہا۔ تل تل اپنی موت کو گلے لگاتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے اندر سے سود و زیاں کا ہر حساب مٹ گیا اور پیچھے اک قبرستان سی ویرانی چھا گئی۔ دھیرے سے سر اٹھاتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کیے اور نرمی سے اپنے گرد لپٹے ماں کے بازو ہٹاتا اٹھ کھڑا ہوا۔
"زمرو! چادر پہنو اور فخر کو لے کر آؤ۔" اس کی بھاری آواز کمرے کی خاموشی میں ابھری تو سب کے دل سہم گئے۔ روتی ہوئی زمرو بنا کوئی سوال کیے پلٹی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔
"ک۔ کہاں جا رہا ہے تُو؟" بی بی نے معدوم ہوتی دھڑکنوں کے ساتھ اس کا ہاتھ تھاما۔ اسفند کی نظریں بے اختیار اپنے قدموں میں بیٹھی ماں پر جا ٹھہریں جو آنکھوں میں سارے جہان کا خوف لیے اسے منہ اٹھائے تک رہی تھیں۔ اس کے دل میں اک ٹیس سی اٹھی۔ اگلے ہی لمحے اس نے جھک کر نرمی سے انہیں دونوں شانوں سے تھام لیا۔
"ب۔ بول ناں پتر۔" بی بی بیٹے کے سہارے اٹھتے ہوئے بھرائی آواز میں بولیں۔ ان کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں مسلسل اپنے لاڈلے کے چہرے پہ جمی تھیں جو اس پل ہر تاثر سے عاری، اتنا خالی اور سپاٹ تھا کہ بی بی نرگس کے پورے جسم میں اک جھرجھری سی دوڑ گئی۔
"پتا نہیں۔ لیکن میں اب یہاں نہیں رہ سکتا۔" وہ دھیرے سے بولا تو بی بی کو لگا جیسے اس نے ان کی جان نکال لی ہو۔
"ایسے نہ کہہ پتر۔ تیری۔ تیری ماں مر جائے گی بچے۔" انہوں نے ملتجی انداز میں اس کی ٹھوڑی کو چھوا۔
اسفند کے لب سختی سے ایک دوسرے پیوست ہو گئے۔ وہ چند لمحے انہیں دکھ بھری نظروں سے تکتا رہا اور پھر محبت سے ان کا ہاتھ تھام گیا۔
"اور اگر میں یہاں رہا تو میری آتی جاتی سانسوں کا یہ سلسلہ بھی رک جائے گا۔"
"تو معاف نئی کر سکتا؟" انہوں نے بے قراری سے اس کے ہاتھ پہ اپنا دوسرا ہاتھ رکھا۔
اسفند کے اندر جھکڑ سے چلنے لگے۔ یہ اس کے بس سے باہر نہیں بلکہ بہت باہر کی بات تھی۔
"کیا کیا معاف کروں بی بی؟" وہ ٹوٹا ہوا سا مسکرایا۔ "اپنی غیرت کا خون معاف کروں یا اپنی رسوائی اور جگ ہنسائی معاف کروں؟ اپنی گرہستی کی بربادی معاف کروں یا پھر اپنی پاک دامن بیوی کے ساتھ ان کا رچایا ہوا گندہ اور شرمناک کھیل معاف کروں؟ میں کیا۔ کیا کچھ معاف کروں بی بی؟"
اس نے شکایت آمیز نگاہوں سے ماں کو دیکھا تو بی بی نرگس کو چپ لگ گئی۔ انہیں اپنے مطالبے کے ظالمانہ حد تک ناجائز ہونے کا احساس ہوا تو وہ اندر تک شرمسار ہو گئیں۔ بیٹے کے ہاتھ پر ان کی گرفت اپنے آپ ڈھیلی پڑ گئی۔
ماں کی انگلیوں کو بے جان ہوتا محسوس کر کے اسفند کی پلکیں نئے سرے سے بھیگ گئیں۔ اپنی جنت سے یہ جبری دوری بھی اس کا ایک اور ناقابلِ تلافی نقصان تھا جس کا سہرا اس کے باپ کے سر جاتا تھا۔ وہ ان کی صورت تو دور ان کی آواز بھی اب دوبارہ کبھی نہیں سننا چاہتا تھا۔

زمرد چادر پہنے فخر کو گود میں اٹھائے اندر داخل ہوئی تو سب کی نگاہیں ایک ساتھ اس پر آٹھہریں۔ بی بی نرگس کو اپنا دل پھٹتا محسوس ہوا۔ وہ بے اختیار دوپٹے میں منہ چھپائے پھپھک کر رو پڑیں۔ اسفند خود پہ ضبط کے کڑے پہرے بٹھائے آگے بڑھا اور بیٹے کو اپنی گود میں لے لیا۔ اسے اپنے فیصلے پر مکمل پیرا ہوتا دیکھ کر ملک دلاور کو اپنے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہوتے محسوس ہوئے وہ ڈوبتے دل کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بہادر!" انہوں نے جھجکتے ہوئے بیٹے کو پکارا۔

اسفند کے پچھتے ہوئے اعصاب پر ان کی آواز کوڑا بن کر گری۔ وہ غضب ناک انداز میں باپ کی جانب پلٹا۔

"خبردار...... خبردار! جو آپ نے دوبارہ کبھی میرا نام اپنی زبان سے لیا۔ آج سے میرا اور آپ کا کوئی تعلق، کوئی رشتہ نہیں۔ ہم ایک دوسرے کے لیے مر گئے۔" اس کی آواز میں اتنی نفرت، اتنی کراہیت تھی کہ ملک دلاور کا پورا وجود سن ہو گیا۔ وہ چند لمحے لب بھینچے اسے دیکھے چلے گئے۔

"تیرے کہنے سے ہمارا رشتہ نہیں ٹوٹنے والا۔ تو میرا پتر تھا، ہے اور قیامت تک رہے گا۔" وہ نم آواز میں بولے۔ اسفند کے لبوں پہ اک زخم خوردہ سی مسکراہٹ آٹھہری۔

"قیامت کی بات نہ کریں ملک صاحب، اس روز تو آپ کا گریبان ہوگا اور اس معصوم اور بے گناہ بچے کی ماں کا ہاتھ جسے آپ نے اپنی عداوت اور نفرت کی چکی میں پیس ڈالا۔ جس کے ساتھ اتنا گھناؤنا کھیل کھیلتے ہوئے آپ کو ایک لمحے کے لیے بھی خدا کا خوف نہیں آیا۔ یہ خیال نہ آیا کہ آپ خود بھی بیٹیوں، بہنوں والے ہیں۔ کاش۔ کاش کہ مجھے آپ کی اس منتقمانہ ذہنیت اور کھوٹی نیت کی خبر پہلے ہو جاتی تو میں کبھی بھی آپ کے کہنے پر سلوئی کو اس حویلی میں لے کر نہ آتا۔ میں کبھی بھی آپ پر بھروسا نہ کرتا۔"

اس کی آواز گزرے وقت کے ملال تلے دب کر دل گرفتہ اور بوجھل ہو گئی۔

"آپ نے نا صرف اپنی دنیا اور آخرت برباد کی بلکہ مجھے بھی اس لڑکی کا گنہگار بنا دیا جسے میں نے ٹوٹ کر چاہا تھا۔ جس نے صرف میری محبت میں میرے ہر دھوکے کو معاف کیا۔ مجھ سے جڑا ہر رشتہ پوری ایمان داری سے نبھایا۔ جس نے میری خاطر اپنے ماں باپ چھوڑے، گھر چھوڑا، اپنے خاندان سے ہر رشتہ توڑا۔ اور بدلے میں، میں نے اسے کیا دیا؟ کچھ بھی نہیں۔ اعتبار اور یقین تو دور میں نے اسے ایک موقع بھی نہیں دیا۔ میں نے اس وقت اس کا ساتھ چھوڑا جب اسے میرے ساتھ کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ کیونکہ مقابل میرے ماں باپ کی گواہی تھی، اللہ کی وہ کتاب تھی جسے حاضر ناظر جان کر مجھے ساری بات بیان کی گئی تھی اور آپ دیکھیے گا، دیکھیے گا ملک صاحب کہ آپ کو کلام پاک کی یہ جھوٹی قسم کتنی بھاری پڑے گی۔ کیونکہ میری طرح میری ماں بھی آپ کی بدنیتی اور مکاری کا شکار ہوئیں۔ انہوں نے وہی دیکھا جو آپ نے انہیں دکھانا چاہا۔ انہوں نے وہی سمجھا جو آپ نے انہیں سمجھانا چاہا۔ آپ نے ہم سب کو دھوکا دیا، ہم سب کو استعمال کیا۔

میں نہیں جانتا کہ آج کے بعد بی بی کا آپ کے ساتھ کیا رویہ ہوگا لیکن مجھے اتنا ضرور پتا ہے کہ مجھے آپ کی اولاد اور آپ کا خون ہونے پر تاعمر شرمندگی اور افسوس رہے گا۔ میں اب اپنی زندگی کی آخری سانس تک دوبارہ کبھی آپ کی صورت نہیں دیکھنا چاہوں گا۔ کبھی بھی نہیں!"

وہ سرخ چہرہ لیے خاموش ہو گیا تو ماحول پہ چھائی رنجیدگی میں دردناک حد تک اضافہ ہو گیا۔

ملک دلاور کسی بت کی طرح اپنی جگہ پر استادہ رہ گئے۔ اس کا کہا ہر جملہ، بیان کی گئی ہر سچائی انہیں اپنی ہی نظروں میں گرانے اور پاتال میں دھکیلنے کے لیے کافی تھی۔ وہ اپنی اولاد تو کیا اپنے پوتے پوتیوں کے آگے نظریں اٹھانے کے قابل نہیں رہے تھے جو اپنی معصوم آنکھوں میں حیرت لیے اپنے چچا اور دادا کے درمیان ہونے والی

اس بحث کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن کب تک؟ آخر ایک نا ایک دن تو ان کی اس ناسمجھی نے سمجھ داری میں بدلنا ہی تھا اور تب بھلا ان کی نظر میں اپنے دادا کی کیا عزت رہ جانی تھی؟

بے شک اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے اور اس لاٹھی نے ان کی فرعونیت سے تنی گردن کو ایک ہی وار میں زمین سے لگا دیا تھا۔ انہوں نے سلوی گردیزی کے خلاف سات پردوں میں چھپ کر سازش رچائی تھی۔ اللہ نے ان سے سرِعام جواب طلب کرلیا تھا۔ انہوں نے بڑی عرق ریزی اور راز داری سے اس کا گھر توڑا تھا۔ اللہ نے بابنگِ دہل ان کا شیرازہ بکھیر دیا تھا۔ ان کی ذلالت اور اخلاقی گراوٹ کی اس داستان کو طشت از بام کر دیا تھا۔ ایک دنیا ان سے آنے والے وقت میں سوال کرنے والی تھی، ایک زمانہ ان کے گھر کی زبوں حالی پہ باتیں بنانے والا تھا۔ وہ اس جگ ہنسائی کا کیسے سامنے کرنے والے تھے ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنا منہ کہاں چھپانے والے تھے انہیں یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

ملک اسفندیار بہادر نے ایک آخری اور تلخ نظر اپنے باپ کے جھکے ہوئے شانوں اور بے جان چہرے پر ڈالی تھی۔ وہ کہیں سے بھی اسے کسی فاتح کا چہرہ نہیں لگ رہا تھا۔ بلکہ ان سے زیادہ شکست خوردہ انسان شاید اس نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ ان کی انتہاپسندی نے انہیں کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ محبت اور جنگ میں کبھی بھی سب جائز نہیں ہوتا اور جو ایسا سمجھتے ہیں وہ خود کو انسانیت کے درجے سے نیچے گرا لیتے ہیں۔

اسفند نے اک گہری سانس لیتے ہوئے خود کو آنے والی منزلوں کے لیے تیار کیا تھا اور آگے بڑھ کر روتی ہوئی ماں کا سر چوم لیا تھا۔ اس کے دونوں بڑے بھائی بے قراری سے اس کی جانب بڑھے تھے لیکن اس نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا تھا۔ وہ اب رکنے والا نہ تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ پلٹا تھا اور اپنی بیوی اور بیٹے کو ساتھ لیے سرخ اینٹوں سے بنی اس حویلی سے نکلتا چلا گیا تھا جہاں اب زندگی کی رونقیں شاید کبھی بحال ہونے والی نہ تھیں۔

☆☆☆

کچن میں چائے تیار کرتی حیا کی نظریں اپنے دھیان میں انھیں تو سامنے کھلی کھڑکی سے نظر آتے منظر پر جا ٹھہریں جہاں لان میں ڈھلتی دھوپ تلے کرسیاں رکھے خولہ اور ایلیا، عنایہ کو اٹھائے اس سے اٹھکیلیاں میں مصروف تھیں۔ اس کے لب مسکرا دیے۔ اس نے بے اختیار ایک طرف رکھا موبائل اٹھا کر کیمرا کھولا اور اس دلکش منظر کو زوم کر کے ایک تصویر لے لی اور اسے متعلقہ بندے کو بھیج کر مڑ کے اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

چند لمحے بھی نہ گزرے تھے جب دوسری طرف سے جواب نہیں بلکہ بہت سے جواب ایک ساتھ موصول ہوئے تھے۔ اس نے فٹافٹ ہاتھ صاف کرتے ہوئے میسج کھولے جہاں ہادی کے روتے دھوتے پاؤں پٹختے کتنے ہی اسٹکرز آگے پیچھے موجود تھے۔ وہ بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

ہادی ان دنوں ایک پراجیکٹ کے سلسلے میں پنڈی گیا ہوا تھا تب ہی حیا کے اصرار پہ ایلیا گردیزی ہاؤس آئی تھی ورنہ منگنی کے بعد سے اس نے یہاں آنا ترک کر دیا تھا۔ اپنے دیور کو چند ایک مزید ار قسم کے چڑانے والے کارٹون بھیج کر اس نے موبائل نیچے رکھا اور سارے لوازمات ٹرے میں سجا کر خود سلوی کے کمرے کی طرف چلی آئی جس کی خاطر اس نے یہ سارا اہتمام کیا تھا۔ دروازے پہ دستک دے کر اس نے اندر جھانکا تو نگاہیں سیدھی سلوی سے جا ٹکرائیں جو بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ حیا کو دیکھ کر اس نے سرعت سے اپنے آنسو صاف کیے۔

"آؤ حیا۔"

حیا نے ایک نظر اس کے سرخ چہرے اور بھیگی پلکوں کو دیکھا اور اپنے پیچھے دروازہ بند کرتی اندر چلی آئی۔

اس کی ساری شگفتگی آن کی آن میں افسردگی میں بدل گئی۔ سلوئی کو لوٹے آج تقریباً ڈیڑھ ماہ ہونے کو تھا لیکن وہ تا حال خود کو سنبھال نہ پائی تھی۔ وہ دل گرفتہ سی اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

"آؤ باہر چلیں۔ چائے تیار ہے۔" وہ قصداً ہلکے پھلکے لہجے میں بولی۔ سلوئی نے اک گہری سانس لی۔

"میرا دل نہیں کر رہا۔"

حیا کی آنکھوں میں ہمدردی پھیل گئی۔ مسلسل ذہنی اور جذباتی دباؤ، نیند اور خوراک کی کمی نے سلوئی کو جیسے نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کی خوب صورت آنکھوں کے گرد مستقل حلقے پڑ گئے تھے۔ وہ جیسے اپنی ہی پرچھائیں میں تبدیل ہو کر رہ گئی تھی۔ حیا دھیرے سے اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"میں مانتی ہوں کہ تمہارا دکھ بہت بڑا ہے سلوئی۔ تم نے نا صرف اپنی محبت، اپنا گھر کھویا ہے بلکہ دن رات اپنی اولاد سے دوری کی اذیت میں بھی مبتلا ہو۔ اور یہ غم، یہ درد ایک ماں کے لیے کتنی بڑی آزمائش ہے میں اچھی طرح سے سمجھ سکتی ہوں۔ لیکن سلوئی تمہاری ذات پہ تمہارے ماں باپ کا بھی حق ہے۔ اپنی خاطر نہ سہی ان کی خاطر حوصلہ کرو۔ ان کی طرف دیکھو، ان کا سوچو۔ تمہارے صدمے نے ان دونوں کو ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ پلیز خود کو سنبھالو۔"

اس کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھے وہ نرمی سے بولی تو سلوئی کے اندر اک لہر سی اٹھی۔

"کیسے سنبھالوں؟" وہ آنکھوں میں آنسو لیے کرب سے بولی۔ "جب سے مجھے یہ پتا چلا ہے کہ اسفند کی محبت ایک جھوٹ ایک سوانگ تھا، میرے زخم جیسے ناسور بن گئے ہیں۔ مجھے اس کی بے مہری، اس کی سنگ دلی ہر چیز قبول ہے لیکن یہ بات کہ اس نے مجھ سے سرے سے کبھی محبت ہی نہیں کی تھی یہ۔ یہ مجھے قبول نہیں۔ اس نے ہماری خاندانی دشمنی میں اپنے باپ کے ساتھ مل کر مجھے محبت کے نام پر دھوکا دیا تھا میرا دل اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔" اس نے بے چارگی سے حیا کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا۔ یہ انکشاف کہ اسفند ان کے پرانے دشمن ملک دلاور کا بیٹا تھا سلوئی کو اندر تک ہلا گیا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر گنگ سی اپنے باپ کو دیکھے چلی گئی تھی جو ماضی کو دہراتے خود بھی بے حد رنجیدہ ہو گئے تھے۔

حیا نے اک بوجھل سی سانس لی۔

"تو پھر اس نے تمہارا یقین کیوں نہیں کیا؟ کیوں آنکھیں بند کر کے اپنے گھر والوں کے اتنے غلیظ الزام کو سچ مان لیا؟" اس کی جانب دیکھتی ہوئے وہ دھیرے سے بولی تو سلوئی لب بستہ سی خاموش ہو گئی۔

سب کچھ اتنا الجھ چکا تھا کہ وہ اب کچھ بھی یقین سے کہنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ ہاں لیکن ماضی کی اس کڑی کے کھلنے کے بعد وہ اتنا ضرور جان گئی تھی کہ اس رات اس کے کمرے میں آنے والا امر یقیناً ملک دلاور کا بھیجا ہوا آدمی تھا۔ کیونکہ اس روز وہ واحد تھے جو اسے بہانے سے بلا کر کمرے سے باہر لے گئے تھے اور جب وہ واپس لوٹی تھی تو وہ منحوس انسان اسے حیران کرنے کو وہاں موجود تھا۔ اس دوران نہ اس نے کسی چیز کو ہاتھ لگایا تھا اور نہ ہی سلوئی کی طرف کسی غلط نیت سے پیش رفت کی تھی۔ وہ اسے ڈراتا دھمکاتا ایک طرف بیٹھا رہا تھا تا وقتیکہ اسے ایک کال موصول نہ ہوئی تھی۔ جس کے چند لمحوں بعد ہی بی بی نرگس نے اس کے دروازے پر دستک دے ڈالی تھی۔

ملک دلاور کی اس چال میں اور کون کون شامل تھا وہ نہیں جانتی تھی لیکن اس آدمی کی اپنے کمرے میں اچانک موجودگی کا راز اور محرک دونوں ہی اب سلوئی پر واضح ہو چکے تھے اور اس وضاحت نے اسے جیسے پتھر کا کر دیا تھا۔

وہ سب ڈیڑھ سال تک اس کے ساتھ کھیل کھیلتے رہے تھے اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اس سے بھی بڑھ

کر بے یقینی کی بات یہ تھی کہ ان کے اس مکروہ کھیل کا مرکزی کردار اسفند تھا۔ وہ اسفند جس کی محبت کو ہر آن اس نے خود پہ برستا محسوس کیا تھا۔ جس کے جذبوں کی سچائی اس کی آنکھوں سے عیاں ہوتی تھی۔ جس کی سنگت، جس کی قربت میں کہیں کسی جھوٹ، کسی فریب کی آمیزش نہ تھی۔ نہیں۔ وہ کسی طور اتنے اعلیٰ درجے کا اداکار نہیں ہو سکتا تھا اور اگر ایسا تھا تو سلویٰ گردیزی اپنی زندگی کی آخری سانس تک اب کسی مرد پہ بھروسا کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

"میں نہیں جانتی۔ میں سچ میں اب کچھ بھی نہیں جانتی۔" وہ بے بس سی آنکھیں بند کیے پھپھک کے رو پڑی تو حیا نے بے اختیار اسے خود سے لگا لیا۔

پورے گھر میں وہ واحد تھی جو سلویٰ پہ بیتے گئے ظلم کی اصل داستان سے واقف تھی۔ اس بارے میں اس نے کسی سے بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ یہ الزام کہ وہ اپنے شوہر کی امانت میں خیانت کی مرتکب ہوئی تھی سلویٰ کو زمین میں گاڑنے کے لیے کافی تھا۔ وہ مر کر بھی اس گھٹیا تہمت کو اپنے والدین یا گھر والوں کے سامنے دہرانا نہیں چاہتی تھی۔ ہاں لیکن ایک کمزور لمحے کی زد میں آ کر، جب اس کی وحشت اپنے عروج پر تھی، اس نے حیا کو اپنا رازدار بنا لیا تھا۔ اور اس نے بھی اس کے اس راز کی بہن بن کر حفاظت کی تھی۔

"مت رو۔ اللہ ہے ناں۔ تم دیکھنا وہ ان ظالموں سے کیسے تمہارا بدلہ لے گا۔"

اس کی پشت سہلاتے وہ گلوگیر لہجے میں بولی تو سلویٰ کے آنسوؤں میں کچھ اور بھی شدت در آئی۔ حیا اسے خود سے لگائے تسلی دیتی رہی یہاں تک کہ سلویٰ کی بے قراری میں کمی آنے لگی۔

"مجھے۔ مجھے معاف کر دو۔ میں تمہاری گنہگار ہوں۔ میری وجہ سے تمہیں ایک ایسے بندھن میں بندھنا پڑا جو شاید تمہارے لیے کسی امتحان سے کم نہ تھا۔" وہ حیا کے ہاتھ تھامے ندامت سے بولی۔

"ایسے مت کہو۔ ہمارے نصیب میں یہ سب شاید یونہی ہونا لکھا تھا۔ ورنہ میں اور جرار تو ایسا کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔" وہ دھیمے سے بولی۔

"تم۔ تم خوش تو ہو ناں؟" اس نے بے قراری سے پوچھا۔

"بہت۔"

اور سلویٰ کو لگا جیسے اس ایک لفظ نے اس کے ضمیر پہ پڑا بہت بڑا بوجھ ہٹا دیا ہو۔ اس کے لبوں سے بے اختیار اک اطمینان بھری سانس ٹوٹ کر فضا میں بکھر گئی۔

مکروفریب، رنجشوں اور خود غرضی کے اس اذیت بھرے کھیل میں زندگی کسی پر تو اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت سایہ فگن ہوئی تھی اور سلویٰ گردیزی کو خوشی تھی کہ وہ حیا سکندر کی ذات تھی۔ شاید جو لوگ اپنے وجود سے جڑا ہر رشتہ یونہی پورے خلوص، نیک نیتی اور ایمان داری سے نبھاتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں ایسے ہی کامیابیوں اور آسانیوں سے نوازتا ہے۔ وہ انہیں ایسی ہی سرخروئی اور عزت عطا کرتا ہے جیسی کہ حاتم گردیزی کو نصیب ہوئی تھی۔

سلویٰ کی لاعلمی میں جو کردار انہوں نے بخت چوہدری کے ساتھ مل کر، اس کی زندگی میں ادا کیا تھا۔ جس طرح باپ بن کر انہوں نے اس کی حفاظت کی تھی، اس کے حق کے لیے ایک زمانے کے سامنے آواز بلند کی تھی اس سب نے سلویٰ کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ وہ ان کے سامنے نظریں اٹھانے کے لائق نہیں رہی تھی۔ بلکہ ایک حاتم صاحب تو کیا وہ گھر میں کسی سے بھی سامنا کرنے کی ہمت نہیں پاتی تھی۔ ان سب کی اعلیٰ ظرفی اور بڑائی کے آگے اسے اپنی ذات اور اپنا عمل اور بھی چھوٹا لگنے لگتا تھا۔ وہ ان سب سے معافی مانگنے کے لیے بے چین ہو گئی تھی۔

"چلو اب بس کرو۔ میں تمہیں مزید یہاں اکیلے بیٹھنے نہیں دوں گی۔" حیا نے اٹھتے ہوئے زبردستی اسے اپنے ساتھ کھینچا تو ناچار سلویٰ کو اس کے ساتھ جانا پڑا۔ ان دونوں کو ایک ساتھ لان میں داخل ہوتا دیکھ کر خولہ اور ایلیا نے بایک وقت ان کی جانب دیکھا۔

"ہم خود ہی جا کر اپنی چائے لے آئے تھے۔ کہاں رہ گئی تھیں آپ محترمہ؟" خولہ نے مصنوعی خفگی سے بھاوج کو گھورا۔ حیا بے اختیار مسکرا دی۔

"ہم اپنی بیٹی کی خالہ کو لینے گئے تھے......" وہ سلویٰ کا ہاتھ تھامے اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ "اجازت ہے پھوپھو جان؟" وہ خولہ کی گود میں موجود عنایہ کی جانب جھکی تو اس نے پل بھر کی ہچکچاہٹ کے بعد بچی اس کی طرف بڑھا دی۔ حیا نے بیٹی کو لیا اور سلویٰ کی گود میں دے دیا۔

اسے اپنی بانہوں میں لیتے ہی سلویٰ کے لبوں پہ اک غم زدہ سی مسکراہٹ آ گئی۔ وہ جب بھی عنایہ کو اٹھاتی تھی اسے اپنے بیٹے کی یاد کچھ اور بھی شدت سے ستانے لگتی تھی۔ نم ناک نظروں سے اس کی من موہنی صورت کو تکتے ہوئے اس نے بے اختیار اسے سینے سے لگا لیا تو ایک پل کو ان تینوں کے چہروں پہ افسردگی چھا گئی۔

ایلیا کی نگاہیں حزن و یاسیت کی تصویر بنی کھڑی سلویٰ کے وجود پہ ٹھہر سی گئیں۔ جو خود کو اپنی عدت کے باعث بڑی سی چادر میں لپیٹے ہوئے تھی۔ گو کہ اس کی واپسی بے حد تکلیف دہ حالات میں ہوئی تھی لیکن اس کی موجودگی نے ناچاہتے ہوئے بھی اسے اپنے بھائی کی طرف سے پریشان کر دیا تھا جو اس تمام عرصے میں بے حد خاموش ہو گیا تھا۔ اس کی اداسی اس کی آنکھوں سے چھلکتی تھی۔ وہ اس سارے معاملے کو کس نظر سے دیکھتا تھا، اس بارے میں کیا سوچتا تھا ایلیا کوشش کے باوجود جان نہیں پائی تھی۔ اور اس غیر یقینی صورت حال نے اسے اندر ہی اندر مضطرب کر دیا تھا۔ وہ اپنے بھائی کا حالِ دل جاننے کے لیے بے چین ہو گئی تھی اور اسی سلسلے میں آج حیا سے بات کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

حیا کی کوششوں سے جلد ہی سلویٰ کا دھیان بھی بٹ گیا اور تھوڑی ہی دیر میں وہ چاروں چائے پیتے ہوئے ادھر ادھر کی باتوں میں مشغول ہو گئیں۔ اسی دوران گیٹ پر اچانک ہارن کی آواز سن کر چوکیدار نے آگے بڑھ کر گیٹ کھولا تو جرار کی گاڑی روش پر دوڑتی پورچ میں آ رکی۔ سلویٰ نے بے اختیار اپنی چادر پیشانی تک کھینچتے ہوئے نظریں جھکا لیں۔

گاڑی سے نکلتے جرار کی نگاہیں سیدھی ان چاروں پر آ ٹھہریں۔ سلویٰ کی گود میں اپنی بیٹی کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ناگواری چھا گئی۔ اس نے ایک خفگی بھری نظر بیوی پر ڈالی اور تیوریاں چڑھائے اندر کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

حیا چائے کا کپ لیے کمرے میں داخل ہوئی تو نظریں سیدھی جرار سے جا ٹکرائیں جو جینج کر کے بیڈ پہ نیم دراز ہاتھ میں موبائل پکڑے ہوئے تھا۔ اس کی آمد پہ اس کی مصروفیت میں کوئی خلل نہ آیا تھا۔ اس کی توجہ پوری طرح سامنے کھلی اسکرین پر مرکوز رہی تھی لیکن وہ اپنے چہرے کے تناؤ میں اضافہ ہونے سے خود کو روک نہ پایا تھا۔

حیا نے بغور اس کے بگڑے ہوئے تیور ملاحظہ کیے۔ وہ جتنا بے نیاز بن رہا تھا اتنا تھا نہیں۔ بلکہ اس کی پوری توجہ اس وقت صرف حیا پر تھی اور یہ بات وہ اچھی طرح سے محسوس کر سکتی تھی۔ اس نے بامشکل تمام اپنی امڈتی مسکراہٹ کا گلا گھونٹا اور سہج سہج قدم اٹھاتی اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔"

بنا نظریں اٹھائے خاصے خشک سے لہجے میں جواب دیا گیا تو حیا نے ہاتھ میں پکڑا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور اک گہری سانس لیتی اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"آپ کا موڈ کیوں آف ہے؟"

"تمہیں پروا ہے میرے موڈ کی؟" وہ اسکرالنگ جاری رکھتے ہوئے بے نیازی سے بولا۔

حیا نے نرمی سے اس کے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنی ٹھوڑی اس پہ جما دی۔

"مجھے نہیں تو اور کسے ہوگی؟" اسے محبت پاش نظروں سے تکتے ہوئے وہ دھیرے سے مسکرائی۔

جرار نے ہاتھ میں پکڑا موبائل سامنے سے ہٹایا تو نگاہیں سیدھی اس کی سنہری آنکھوں سے جا ٹکرائیں۔ جو اس کی محبت میں ڈوب کر کچھ اور بھی سنہری اور قاتل لگ رہی تھیں۔ اس کے دل پہ پڑی حیا سکندر کے عشق کی کمندیں کچھ اور بھی مضبوط ہونے لگیں۔

"اگر ہوتی تو تم یہ نوبت ہی نہ آنے دیتیں۔" اس کا انگوٹھا اپنے آپ اس کے دائیں گال کو سہلانے لگا۔

حیا نے بے اختیار اپنی پلکیں موندتے ہوئے اس کے لمس کو پوری شدت سے محسوس کیا۔ اسے جرار کی محبت کا یہ انداز بے حد پسند تھا۔ وہ چند لمحے اس دل فریب احساس کو اپنی روح میں جذب کرتی رہی اور پھر اک آسودہ سی سانس لیتی دھیرے سے اس کا ہاتھ تھام گئی۔

"میں مانتی ہوں کہ میری غلطی ہے۔ لیکن اگر وہ کچھ دیر عنایہ سے اپنا دل بہلا لیتی ہے تو اس میں کیا مضائقہ ہے؟" آہستگی سے سیدھے ہوتے ہوئے اس نے نرمی سے سوال کیا۔

"مضائقہ ہے۔ میں اپنی بیٹی کو اس جیسی عورت کے قریب نہیں دیکھنا چاہتا۔" وہ خفگی سے بولا۔

"ایسے نہ کہیں۔ آخر سلویٰ بھی کسی کی بیٹی ہے۔" اس نے دھیرج سے ٹوکا۔ جرار کے لبوں پہ اک تلخ مسکراہٹ آٹھہری۔

"یہی تو رونا ہے کہ وہ ایک ایسی بیٹی ہے۔ جس کا کردار کسی بھی طور قابلِ تقلید نہیں۔ اس نے اپنے ماں باپ کو سوائے دکھ اور شرمندگی کے اور کچھ نہیں دیا۔"

"غلطیاں انسانوں سے ہی ہوتی ہیں جرار۔ کیا آپ اسے معاف نہیں کر سکتے؟" وہ بے بسی سے بولی۔

"معاف؟ میری معافی سے اس کا کیا لینا دینا؟ وہ یہاں آ چکی ہے۔ رہ رہی ہے۔ میں نے تمہارے اس کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے، ہنسنے بولنے پر کوئی پابندی نہیں لگائی، کیا یہ کافی نہیں؟" اس نے پیشانی پہ بل لیے سوال کیا۔

حیا پھیکا سا مسکرا دی۔

"نہیں۔ یہ کافی نہیں ہے جرار۔ سلویٰ آج اپنی زندگی کے جس کڑے اور تلخ ترین دور سے گزر رہی ہے وہاں اسے ہم سب کے ساتھ، ہماری دل جوئی کی از حد ضرورت ہے۔ اس کا صرف یہاں آ جانا ہی کافی نہیں ہے، ہمارا اسے دل سے قبول کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ ہم سب کے رویے اس کے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ شاید ماضی میں ایسا نہ ہو لیکن آج وہ ہماری ابرو کی جنبش سے لے کر ہماری پیشانی کے بل تک گننے پر مجبور ہو چکی ہے۔ اور ایسا صرف اس لیے ہوا ہے کہ قسمت نے اس کے فیصلے کو غلط ثابت کیا ہے اور جسے اللہ ملال اور پچھتاووں میں مبتلا کر دے اسے مزید تکلیف پہنچانے اور شرمندہ کرنے کا ہمارا کوئی حق نہیں بنتا۔ اس لیے پلیز آپ بھی اب اپنا غصہ تھوک دیں اور کوشش کریں کہ اپنے اندر تھوڑی سی وسعت، تھوڑی سی گنجائش پیدا کر سکیں۔ ایسا نہ ہو کہ اللہ پاک کو ہماری کوئی بات بری لگ جائے۔"

اس کی آنکھوں میں دیکھتی وہ ملتجی انداز میں بولی تو جرار بے اختیار خاموش ہو گیا۔

صحیح تو کہہ رہی تھی وہ، جزا اور سزا کا مالک صرف اللہ ہے۔ اور یہ عمل اسی کی ذاتِ پاک کو بجتا بھی ہے جو گناہوں سے پاک اور ہر عیب سے مبرا ہے ورنہ ہم انسان تو سب ہی خطا کے پتلے ہیں۔ ایسے میں اس اختیار کو اپنے ہاتھ میں لینا سراسر ایک حماقت ہے۔ وہ حیا کے معاملے میں یہ غلطی کر چکا تھا اس لیے ایک بار پھر اسے دہرا کے اپنے رب کی ناراضی نہیں مول لینا چاہتا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟" حیا نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"یہی کہ بعض لوگوں کا وجود کتنا روشن، کتنا پرسکون ہوتا ہے۔" اس کے چمکتے چہرے پر نگاہیں جمائے وہ دھیرے سے بولا تو حیا الجھ سی گئی۔

جرار نے اس کی گرفت میں موجود اپنے ہاتھ کی انگلیاں اس کی انگلیوں میں پھنساتے ہوئے اس ربط، اس تعلق کو کچھ اور بھی مضبوط بنایا۔

"پتا ہے حیا، میں جب تم سے ملا تھا تو ایک کم عمر بچہ تھا۔ میرے لیے تمہارا تعارف صرف اتنا تھا کہ تم اس ہستی کی بیٹی تھیں جس کی ذات میری ماں کے آنسوؤں، اس کی تکلیف اور میرے باپ کے وجود کے بٹوارے کی وجہ بنی تھی۔ اس سے آگے تمہیں جاننے کی نہ مجھے کبھی کوئی خواہش محسوس ہوئی اور نہ ہی ضرورت۔ میرے پاس تم سے نفرت کرنے کی بڑی معقول وجہ موجود تھی جو ہر گزرتے دن کے ساتھ مجھ سے اپنا آپ منواتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ہم سمجھ دار ہو گئے۔ لیکن میرے اندر رکا وہ ناراض و نادان بچہ اپنی جگہ پر ڈٹا رہا۔ وہ تمہیں تکلیف میں دیکھ کر، تمہیں چوٹ پہنچا کر اپنے اندر ایک عجیب سی تسکین اترتی محسوس کرتا تھا یوں جیسے اس نے اپنے باپ سے اس کی زیادتیوں کا بدلہ لے لیا ہو۔ لیکن یہ نفرت، یہ کڑواہٹ دھیرے دھیرے میری ذات کو بھی تلخ بنانے لگی یہاں تک کہ مجھے احساس بھی نہ ہوا اور میرے اندر باہر چلچلاتی ہوئی دھوپ بھر گئی۔ جو میرے ساتھ ساتھ مجھ سے جڑے لوگوں کو بھی جلانے پر اتر آئی لیکن پھر میری قسمت نے ایک انہونی سی کروٹ لی اور ایک مہربان بادل کا ٹکڑا مجھ پر سایہ فگن ہو گیا۔ جانتی ہو وہ ٹکڑا کون ہے؟"

اس نے پل بھر کو رکتے ہوئے حیا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس کا سر اک ٹرانس کی کیفیت میں نفی میں ہل گیا۔ جرار کے لبوں پہ بڑی دلفریب سی مسکراہٹ آٹھہری۔

"تم۔ وہ بادل، وہ ابر، وہ سحاب کا ٹکڑا تم ہو حیا جرار، جس نے میرے جلتے ہوئے وجود پہ اپنی نرم اور بے غرض فطرت کا ٹھنڈک بھرا سایہ دراز کر کے مجھے اپنے اندر کی تمازت کا احساس دلایا۔ اس بات کا احساس دلایا کہ زندگی بے جا نفرتوں، کڑواہٹوں، بغض اور بیر سے کئی گنا بڑھ کر اونچی اور قیمتی چیز ہے۔ اس کا اصل مصرف محبت، اور اصل مقصد اللہ کی رضا ہونا چاہیے۔ درگزر اور آسانیاں بانٹنے کا جذبہ ہونا چاہیے۔ اپنوں کے لیے خلوص اور اپنے رشتوں کے لیے اخلاص ہونا چاہیے۔ مجھ پہ کامیابی کے یہ راز کھولنے، میری بدگمانیوں کو معاف کرنے اور میری ذات کو میری تمام تر کمزوریوں سمیت اپنانے کے لیے تمہارا بہت شکریہ جانِ جرار۔"

اس کی سنہری آنکھوں میں جھانکتے اس نے بے خودی کے عالم میں اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا تو حیا، جو دم سادھے اسے سن رہی تھی، اپنے اشکوؤں کو بہنے سے روک نہ پائی۔

اگر کوئی چیز زندگی کا حاصل تھی تو وہ حیا جرار کے لیے یہیں، ان ہی مضبوط بانہوں کے گھیرے میں تھی۔ ان انمول لمحوں میں بھی جب اس کی ذات کو اتنا معتبر کر دیا گیا تھا کہ اسے اپنا آپ سچ میں ابر کا ایک ٹکڑا بن کر آسمان کی وسعتوں میں اڑتا محسوس ہو رہا تھا۔

جرار نے جذب سے اسے خود میں مزید سموتے ہوئے آسودگی سے اپنی پلکیں موند لیں۔ اس کا دل اپنے رب کے حضور شکر گزار تھا جس نے اسے ایک نیک، باحیا اور باوفا بیوی عطا کی تھی۔ جس نے اس کی بے چینیوں کو

قرار بخشا تھا اور جس نے اس کی ذات کو اولاد کی نعمت سے نواز کر مکمل کیا تھا۔

☆☆☆

صبح ناشتے کا وقت تھا۔ سب ہی افرادِ خانہ ڈائننگ روم میں موجود تھے۔ سلویٰ البتہ اپنے کمرے میں تھی۔ وہ اپنی عدت کی وجہ سے باہر نکلنے میں احتیاط برتی تھی۔ ایسے میں ملازم نے اندر آ کر کسی صاحب کے آنے کی اطلاع دی تو سب اپنی اپنی جگہ پر چونک گئے۔

"اس وقت کون آ گیا؟" حاتم صاحب نے الجھ کر سامنے کھڑے ملازم کو دیکھا۔ "کیا نام ہے؟"

"انہوں نے نہیں بتایا سر جی۔ لیکن ہیں کوئی اونچی ہستی۔ ان کے ساتھ ان کے دو گن مین بھی ہیں۔" وہ مرعوب سا بولا۔ حاتم گردیزی کی پیشانی پہ بل آ ٹھہرے۔

"کیا؟" وہ اسے گھورتے ہوئے تیزی سے کرسی سے اٹھے۔ "یہ کسے اندر لے آئے ہو بے وقوف۔"

ان کے ساتھ ہی شاہ صاحب سمیت سبحان گردیزی، جرار اور ہادی نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ تب ہی لاؤنج سے اچانک ٹرے گرنے اور برتن ٹوٹنے کی زوردار آواز بلند ہوئی تو ان سب کے دل دھک سے رہ گئے۔ وہ سب وحشت زدہ سے ہو کر باہر کی جانب لپکے لیکن لاؤنج میں پہنچ کر سب ایک لمحے کو بھونچکے رہ گئے۔ سلویٰ ایک اونچے لمبے خوبرو نوجوان کا گریبان پکڑے کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔ حیا کی نظر اس شخص کے چہرے سے ٹکرائی تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ ملک اسفندیار تھا۔

"تم؟ تمہاری ہمت کیسے ہوئی یہاں آنے کی؟" اس کی آنکھوں میں دیکھتی وہ حلق کے بل چلائی تو باقی سب کو بھی ساری صورت حال سمجھنے اور اس اجنبی کو پہچاننے میں لمحہ نہیں لگا۔ سبحان گردیزی تیر کی سی تیزی سے آگے بڑھے اور بیٹی کو پیچھے دھکیلتے ہوئے اسفند پہ پل پڑے۔

"ذلیل، کمینے انسان! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" ان کے دائیں ہاتھ کا ایک بھرپور مکا اسفند کے چہرے پڑا تو وہ بے اختیار لڑکھڑا گیا۔

شور کی آواز سن کر اس کے باہر کھڑے آدمی تیزی سے اندر داخل ہوئے لیکن اسفند کی ایک سخت نگاہ نے انہیں اپنی جگہ پر ساکت کر دیا۔ وہ سر جھکائے فوری طور پہ واپس نکل گئے تو اسفند نے ایک نظر اپنے سامنے کھڑے سبحان صاحب کو دیکھا جو آنکھوں میں نفرت کے شعلے لیے، دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچے اپنے اگلے وار کے لیے تیار تھے۔ وہ بے اختیار ایک قدم آگے بڑھ آیا۔

"ماریں اور ماریں۔ بلکہ اگر ہو سکے تو اپنے کہے کو پورا کر دیں۔ میرے لیے اب اس زندگی میں ویسے بھی کچھ نہیں رہا۔" وہ یاسیت سے چور غم زدہ سی آواز میں بولا تو اب تک ساکت کھڑے حاتم صاحب اس کے مقابل آ کھڑے ہوئے۔

"بے فکر رہو۔ ہم تمہاری یہ خواہش بھی ضرور پوری کریں گے۔ لیکن اس سے پہلے تمہیں اپنی اس جرأت کی وجہ بتانی ہو گی۔ تم نے کیا سوچ کر یہاں قدم رکھا ہے ملک اسفندیار بہادر؟" اس کی آنکھوں میں دیکھتے وہ سرد لہجے میں غرائے تو اسفند کی پیاسی نگاہیں بے اختیار پیچھے خواتین میں گھری اس دشمنِ جاں پر آ ٹھہریں جسے اس سے بچھڑے محض ڈیڑھ ماہ ہوا تھا لیکن یوں لگتا تھا جیسے اسے دیکھے، اسے چھوئے صدیاں بیت گئی ہوں۔ وہ اس کے پاس جانے، اسے اپنے سینے سے لگانے کے لیے بے چین ہو گیا۔ لیکن افسوس کہ وہ ایسا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنے نصیب میں لکھی اس بھیانک سزا، ان دردناک دوریوں کو چاہ کر بھی پاٹ نہیں سکتا تھا جو اس کے اپنے ہاتھوں اس کا مقدر بنی تھیں۔

"مجھے۔ مجھے آپ کی بیٹی کو اس کی امانت لوٹانی ہے۔" وہ اپنے دل کی دہائیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے

دھیرے سے بولا تو حاتم صاحب کی پیشانی کے بل گہرے ہو گئے۔

"کون سی امانت؟"

ان کے سوال پہ اسفند نے اک گہری سانس لی۔ یوں جیسے خود کو آنے والے مرحلے کے لیے تیار کرنا چاہتا ہو۔

"سلطان۔"

اس کی پکار پہ باہر کھڑا آدمی سرعت سے اندر داخل ہوا۔ اسفند نے اسے دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا تو وہ الٹے قدموں باہر نکل گیا۔ چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ سب بے چینی سے ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ تب ہی وہ واپس آیا لیکن اب کی بار وہ اکیلا نہ تھا۔ اس کی گود میں ایک چھوٹا سا بچہ بھی تھا۔

"ف۔ فخر۔" سلوئی کے لبوں سے جیسے کوئی حسرت ٹوٹ کر بکھری تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ دیوانہ وار اپنے بچے کی جانب بھاگ کھڑی ہوئی تھی اور اسے جھپٹ کر اپنے سینے سے لگا گئی تھی۔ اس کی والہانہ محبت ننھے فخر کو گھبرانے اور رونے پر مجبور کر گئی تھی لیکن سلوئی کو کچھ ہوش نہ تھا۔ اس کے آنسو، اس کی آہیں اپنے عروج پر تھیں۔ اس کی تڑپ، اس کا درد دیکھ کر سب ہی کی آنکھیں بھر آئیں۔ منیرہ تیزی سے آگے بڑھیں اور بے قراری سے بیٹی اور نواسے کو خود سے لگا گئیں۔

سبحان گردیزی نے اک خوں خوار نظر اپنی بچی کے مجرم پر ڈالی۔

"تمہیں اندازہ بھی ہے کہ تم نے کتنا بڑا ظلم کیا ہے؟" وہ انگارے کی مانند دہکتا چہرا لیے بولے۔ اسفند کی آنکھوں میں ٹھہرا دکھ اور ملال کچھ اور گہرا ہو گیا۔

"جانتا ہوں تب ہی تو مداوا کرنے آیا ہوں۔" وہ اپنے حلق میں اٹکے آنسوؤں کو بدقت تمام نیچے اتارتے ہوئے بولا تو سبحان صاحب کے چہرے پر پھیلی نفرت اور حقارت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔

"مداوا؟" وہ پھنکارے۔ "مداوا غلطی کا ہوتا ہے ملک اسفند، گناہ کا نہیں۔ تم نے اپنے باپ کے حکم پر میری بیٹی کے ساتھ جو گندہ کھیل کھیلا وہ کوئی معمولی غلطی نہیں بلکہ ایک عظیم گناہ ہے۔ ایک ایسا گناہ جس کی سزا تم جیسے گرے ہوئے لوگوں کو نا صرف اس دنیا میں ملے گی بلکہ آخرت میں بھی تمہاری شدید پکڑ ہو گی۔"

"میں نے سلوئی کے ساتھ کوئی کھیل نہیں کھیلا، کوئی چال نہیں چلی۔"

وہ اچانک حلق کے بل چلایا تو ایک پل کو سب کو سانپ سونگھ گیا۔ حتیٰ کہ سلوئی بھی اپنا رونا بھلائے اس کی طرف آنسوؤں بھری نظروں سے دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔

"میرا اللہ گواہ ہے کہ میں نے سلوئی کو اپنے جذبوں کی تمام تر سچائی اور اپنی روح کی گہرائی سے چاہا ہے۔ میں نے ایک پل کے لیے بھی اسے کبھی کوئی دھوکا نہیں دیا، کسی مقصد کے لیے استعمال نہیں کیا۔ میرا اپنے باپ کی دشمنی، ان کے بدلے سے کوئی تعلق، کوئی واسطہ نہیں۔" وہ سرخ چہرہ لیے با آواز بلند گرجا۔

"جھوٹ۔ بالکل جھوٹ......" سلوئی تیزی سے فخر کو پیچھے ہٹاتی غراتی ہوئی آگے بڑھی۔ "اگر ایسا ہوتا تو تم مجھے یوں ساری دنیا کے سامنے ذلیل و رسوا نہ کرتے، مجھے یوں رات کے اندھیرے میں اپنے گھر سے مار پیٹ کر باہر نہیں پھینکتے۔ تم مجھ سے میرا بچہ، میرا مان، میری گرہستی نہیں چھینتے۔" اس کے روبرو آتے ہوئے وہ دوبدو چلائی تو اسفند کے چہرے پر بے بسی پھیل گئی۔

"مانتا ہوں۔ مانتا ہوں کہ مجھ سے یہ سب گناہ سرزد ہوئے ہیں۔ لیکن مجھے اپنے بچے کی قسم ہے سلوئی، کہ میں نے یہ سب جان بوجھ کر نہیں کیا۔ میں بھی تمہاری طرح ملک دلاور کی سازش کا شکار ہوا ہوں۔ ان کے ظلم کا نشانہ بنا ہوں۔ مجھ پہ ان کی حقیقت، ان کا ماضی، ان کا بغض، ان کا بیر سب کچھ تمہارے جانے کے بعد کھلا

ہے۔"

"ہونہہ! تم نے کہا اور میں نے مان لیا۔ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟" سلویٰ نے اسے کاٹ دار نظروں سے دیکھا۔ اسفند کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔

"کوئی ثبوت نہیں۔ اس رب کی ذات کے سوا میرے پاس کوئی ثبوت، کوئی گواہ نہیں۔ میں آج اتنا ہی بے بس ہوں جتنا کہ اس رات تم تھیں۔ میں اتنا ہی اکیلا ہوں جتنا کہ اس رات تم تھیں۔ ایک صرف اللہ کی ذات ہے جو میری بے گناہی، میرے درد، میرے پچھتاوؤں کو جانتی ہے۔ جو یہ جانتی ہے کہ تمہیں کھونے کے بعد میں کیسے کرب، کیسے ملال میں مبتلا ہوں۔ نہ مجھے دن کو قرار ہے نہ رات کو سکون۔ میں ہر لمحہ، ہر پل اس گھڑی کو کوستا ہوں جب میں نے تم پر شک کیا تھا۔ تمہیں خود سے جدا کرنے کا وہ منحوس قدم اٹھایا تھا۔"

اس کی آنکھوں میں دیکھتا وہ بولتا چلا گیا تو سلویٰ کو لگا جیسے اس کا دل دھڑکنا بھول گیا ہو۔ وہ پتھرائی نظروں سے اپنے سامنے کھڑے اسفند کو دیکھے چلی گئی جس کی آنکھوں میں تیرتی نمی اس کی پلکوں کو بھگوتی اس کے چہرے پر پھسل آئی تھی۔

"میں نہیں جانتا کہ تم مجھے کبھی معاف کر پاؤ گی بھی یا نہیں لیکن میں تمہیں اپنی ذات سے مزید کوئی دکھ دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس لیے میں نے فخر کو تمہیں لوٹانے کا فیصلہ کیا ہے۔ آج کے بعد سے اس پر تمہارے سوا کسی کا کوئی حق نہیں۔"

اس کی جانب دیکھتا وہ مضبوط لہجے میں بولا تو سلویٰ کے لیے اپنی سماعتوں پر یقین کرنا مشکل ہو گیا۔

"میں جانتا ہوں کہ میں نے تمہارا بہت دل دکھایا ہے۔ تمہیں بہت مایوس کیا ہے لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ میں نے یہ سب کبھی کسی کے کہنے پر اور کسی پلان کے تحت نہیں کیا۔ میرے بس میں اگر ہوتو میں پل بھر کا توقف کیے بنا وقت کو پیچھے لے جاؤں، وہاں جہاں ہم دونوں ایک تھے۔ جہاں ہمارے درمیان کوئی بدگمانی، کوئی تلخی، کوئی دوری نہ تھی۔ لیکن چونکہ اب یہ ممکن نہیں رہا تو میں تم سے صرف اتنی درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ ہو سکے تو مجھے۔ مجھے معاف کر دینا اور میرے سکون کے لیے بھی دعا کرنا۔"

آنسوؤں کی یلغار نے اس کا حلق بند کر دیا تو وہ بے اختیار مٹھیاں بھینچے چہرہ موڑ گیا۔

سلویٰ کے لبوں سے گھٹی گھٹی سی ایک سسکی نکلی جو دیکھتے ہی دیکھتے آنسوؤں کی جھڑی میں تبدیل ہو گئی۔ اگلے ہی لمحے وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تو اسفند کے دل میں موجزن درد اپنے عروج کو جا پہنچا۔ کیسی بے بسی، کیسی مجبوری تھی کہ وہ چاہ کر بھی اس کے سسکتے ہوئے وجود کو اپنی بانہوں میں نہیں سمیٹ سکتا تھا۔ وہ چند لمحے وہاں کھڑا اپنی ہمت مجتمع کرتا رہا اور پھر اک گہری سانس لیتا ہمیشہ کے لیے سلویٰ گردیزی اور اپنے بیٹے کی زندگی سے نکلتا چلا گیا۔

☆☆☆

رت بدلی، دن آگے بڑھے۔ سردیاں بہار میں، بہار گرمی اور گرمی خزاں کی سرخ سرحدوں میں مدغم ہونے لگی۔ شاہ مخدوم کی ایما پہ ہادی اور ایلیا کی شادی کی تاریخ رکھ دی گئی جس کے باعث ماحول پہ چھائی ساری کلفت، ساری اداسی اپنے آپ دم توڑ گئی اور زندگی اپنا ہر دکھ بھلائے ایک بار پھر نئے سرے سے متحرک ہو گئی۔

خوشی کی یہ لہر سارے گھر والوں کے لیے کسی تازہ ہوا کے جھونکے سے کم نہ تھی۔ سب کا دھیان غیر محسوس انداز میں گزشتہ تمام تکلیفوں سے ہٹ کر آنے والی خوشیوں پر مرکوز ہو گیا جس کی دونوں جانب بھرپور تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ ابھی بھی بسیط اسی سلسلے میں گردیزی ہاؤس آیا ہوا تھا۔ شاہ صاحب اور

حاتم گردیزی سے مل کر وہ باہر آیا تو نظر لان میں بیٹھی سلویٰ پر جا ٹھہری جو فخر کو پاس بٹھائے کچھ کھلانے اور اس سے باتیں کرنے میں مصروف تھی۔ اس کے لبوں پر بے اختیار اک مسکراہٹ آٹھہری۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ان دونوں کے پاس چلا آیا۔

"السلام علیکم۔"

جانی پہچانی آواز پہ سلویٰ نے سر اٹھایا اور خود سے تھوڑے فاصلے پر بسیط غوری کو کھڑا دیکھ کر وہ خوش دلی سے مسکرادی۔

"وعلیکم السلام۔ کیسے ہیں آپ؟"

"بے حد تھکا ہوا۔ مت پوچھیں کہ ان شادی کے کاموں نے کیسا گھن چکر بنادیا ہے۔"

وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھا اور کرسی کے سہارے کھڑے ننھے فخر کو جھک کر اٹھالیا جو اسے دیکھتے ہی خوشی سے ہمکنے لگا تھا۔ سلویٰ کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

"آج کل آپ کا آنا جانا لگا ہوا ہے ناں اس لیے آپ کو بھی پہچاننے لگا ہے۔"

"صرف پہچاننے نہیں لگا جناب بلکہ ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست بھی بن گئے ہیں۔ کیوں چیمپئن، ہم دوست ہیں ناں؟"

فخر کی جانب دیکھتے ہوئے بسیط نے اپنا سر ہلایا تو وہ بھی اس کی تقلید میں زور و شور سے اپنا سر ہلانے لگا۔ سلویٰ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اس کی ہنسی کی آواز بسیط کے اندر جل ترنگ سا بجا گئی۔ وہ اسے مسحور نظروں سے تکتا کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس کے بیٹھتے ہی فخر صاحب اس کی گود سے اترنے کے لیے نیچے کو سرک آئے۔ اسے جب سے پاؤں لگے تھے وہ چلنے کے لیے یونہی اتاؤلا رہتا تھا۔

"آج کس سلسلے میں آنا ہوا آپ کا؟" سلویٰ نے بیٹے پر سے نگاہیں ہٹاتے ہوئے بسیط کی جانب دیکھا۔

"اصل میں فرنیچر والے کا فون آیا تھا امی کو۔ اس نے بتایا ہے کہ حاتم انکل اس کے شوروم پر آئے تھے اور انہوں نے وہاں سارے آرڈر کی پیمنٹ خود کردی۔ میں اسی سلسلے میں ان سے دو دو ہاتھ کرنے آیا تھا۔"

اس کی بات سن کر سلویٰ مسکرادی۔

"ہاں تو ایلیا ان کی بیٹی کی طرح ہے۔ آپ کیوں بیچ میں ٹانگ اڑا رہے ہیں؟"

"کیسے نہ اڑاؤں؟ انکل نے تو مجھے پریشان کردیا ہے۔ ساری شادی ہائی جیک کرلی ہے۔ کچھ کرنے ہی نہیں دے رہے۔" اس نے دہائی دی۔

"تو آپ بھی اچھے بچوں کی طرح ان کی بات سن لیں ناں۔ اور اگر اتنا ہی شوق ہو رہا ہے خرچ کرنے کا تو اپنی شادی کی تیاریاں شروع کرلیں۔" وہ شرارت سے بولی تو بسیط بے اختیار مسکرادیا۔

"مجھ سے کون شادی کرے گا؟"

"لیں آپ میں کس چیز کی کمی ہے بھلا۔"

سادگی سے کہتے ہوئے سلویٰ نے بیٹے کو قابو کر کے اس کے منہ میں ابلے ہوئے انڈے کا ٹکڑا ڈالا۔ اسے احساس بھی نہ ہوا تھا کہ وہ کتنے حساس علاقے میں قدم رکھ چکی ہے۔ اس کے بھول پنے پہ ڈاکٹر صاحب کا دل عش عش کر اٹھا۔ اس کے عشق میں وہ ایک دشت کی خاک چھان آئے تھے اور یہاں حسنِ بے

نیاز کو خبر ہی نہ تھی۔ سچ ہے، کبھی کبھی لاعلمی بھی کسی نعمت سے کم نہیں ہوتی۔
"آپ کو ایسا لگتا ہے کیا؟" اس نے محظوظ نظروں سے اس غافل کو دیکھا۔
"مجھے کیا سب ہی کو لگتا ہے۔ میں ایک زمانے سے آپ کی کزن سے آپ کی تعریفیں سنتی آرہی ہوں۔" اس نے حیا کا حوالہ دیا تو بسیط مسکرا دیا۔
"آپ نے آگے کا کیا سوچا ہے؟" اس نے گفتگو کا رخ قصداً سلوئی کی جانب موڑا تو وہ بے اختیار تھم سی گئی۔
"کس بارے میں؟" اس نے سنبھل کر دریافت کیا۔
"اپنی زندگی کے بارے میں۔"
"میری زندگی؟" اس کا چہرہ اچانک پھیکا پڑ گیا۔ "ابھی۔ ابھی تو فخر چھوٹا ہے۔ تھوڑا بڑا ہو جائے تو پھر اپنی پڑھائی مکمل کرنے کا سوچا ہے میں نے۔" وہ بجھی بجھی سی مسکراہٹ لیے بولی۔
"یہ تو بہت اچھی بات ہے......" بسیط نے کھلے دل سے سراہا۔ "جاب کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں کیا؟"
"جی......" وہ پل بھر کو رکی۔ "میں اپنے بیٹے کو اپنے بل پر پروان چڑھانا چاہتی ہوں۔" اس کے لہجے میں ایک عزم تھا۔ بسیط نے اثبات میں سر ہلایا۔
"اچھی سوچ ہے۔ لیکن زندگی کا سفر بہت طویل، بہت دشوار ہے۔ کیا اسے تنہا گزارنا مشکل نہ ہو جائے گا؟" اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس نے ایک انتہائی نجی سوال کیا تو سلوئی ایک پل کو حیران رہ گئی۔
عجیب بات تھی کہ اس حیرت کے سوا اس وقت اور کچھ محسوس نہ ہوا تھا حالانکہ یہ پہلا موقع تھا جب اسے بسیط غوری کے ساتھ یوں تنہا بیٹھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ لیکن اس کی بات پہ نہ تو سلوئی کو ناگواری کا احساس ہوا تھا اور نہ ہی اس کی جرأت پر غصہ آیا تھا۔ شاید یہ اس کی سلجھی ہوئی اور نفیس شخصیت کا کمال تھا یا پھر مہذب اندازِ گفتگو کا اثر، مگر جو بھی تھا سلوئی کو اسے جواب میں دینے میں کسی قسم کی کوئی قباحت محسوس نہیں ہوئی تھی۔
"شاید آپ کا کہنا صحیح ہو۔ لیکن میرا تجربہ کچھ اور ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ انسان کی مشکلات کا تنہائی سے کوئی تعلق نہیں۔"
وہ مضمحل سی بولی تو بسیط چند لمحے اسے گہری نظروں سے تکتا رہا اور پھر جیسے کسی نتیجے پہ پہنچ گیا۔
"ایک بار کے تجربے کو زندگی بھر کے لیے تو خود پہ لاگو نہیں کیا جا سکتا ناں۔" وہ رسان سے بولا تو سلوئی کے لبوں سے اک تھکی تھکی سی سانس ٹوٹ کر فضا میں بکھر گئی۔
"اور اگر ایک بار کا تجربہ ہی انسان کے خوابوں، اس کے حوصلوں اور اس کی ہمت کو توڑ کر اسے حال سے بے حال اور تھکن سے نڈھال کر گیا ہو تو؟" اس نے شکستگی سے سوال کیا۔
"تو میں کہوں گا کہ اسے پھر بھی امید کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اپنی خوشیوں سے دستبردار نہیں ہونا چاہیے۔ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے سلوئی اسے یوں کسی ایک غلط فیصلے، ایک تلخ تجربے کی نظر نہیں کیا جا سکتا۔" وہ نرمی سے بولا۔ سلوئی کو اپنے حلق میں آنسوؤں کا گولا سا اٹکتا محسوس ہوا۔
"آپ کو شاید اندازہ بھی نہیں کہ یہ ایک غلط فیصلہ مجھے کتنا مہنگا، کتنا بھاری پڑا ہے۔" اس کی آنکھوں کے گوشے تیزی سے بھیگنے لگے تو وہ لب دبائے رخ موڑ گئی۔
اس کی دکھ میں ڈوبی نگاہیں اپنے بیٹے پہ جا ٹھہریں جو قسمت کی ہر ستم ظریفی سے بے نیاز لان میں بیٹھا اپنے کھلونوں سے کھیل رہا تھا۔ اس معصوم کو علم بھی نہ تھا کہ وہ اپنے باپ کے سائے سے محروم ہو کر کتنے

بڑے نقصان سے دوچار ہو چکا ہے۔
سلویٰ کے دل میں موجزن درد کی لہریں کچھ اور شدت اختیار کر گئیں۔ وہ بالکل اسفند کا پرتو تھا۔ خاص طور پہ اس کی آنکھیں تو لگتا تھا جیسے اسفند کی آنکھیں ہوں۔ وہی زندگی اور ذہانت سے بھرپور چمکتی ہوئی ساحر آنکھیں، جو ایک دنیا کو تسخیر کرنے کا ہنر جانتی تھیں۔ جو اتنی حسین اور گہری تھیں کہ سلویٰ بعض اوقات انہیں بے خود ہو کر چوم لیتی تھی اور بعض اوقات اسے ان سے ایسی وحشت ہوتی تھی کہ وہ بے اختیار رخ موڑ لیتی تھی۔
ایسے میں وہ بسیط غوری کو کیا بتاتی کہ اس کی رات کا ایک بڑا حصہ اب بھی سسکتے ہوئے کٹتا تھا۔ اس کا دن اب بھی سود و زیاں کا حساب لگاتے گزرتا تھا۔ کس نے کیا کھویا، کیا پایا تھا؟ کون کہاں غلط ہوا تھا؟ کب راہ سے بھٹکا تھا؟ اس کا دماغ جیسے اندر ہی اندر پکارتا رہتا تھا۔ اسفند کی آخری ملاقات جیسے اس کی روح سے چپٹ گئی تھی۔ وہ ظالم تھا یا مظلوم وہ اب تک فیصلہ نہ کر پائی تھی۔ اور یہ کشمکش اس کی تھکن میں مسلسل اضافہ کر رہی تھی۔ اس کی بے قراریوں کو بڑھا رہی تھی۔ اگر اسے اپنے بچے کا ساتھ نہ ملتا تو وہ شاید اب تک پاگل ہو چکی ہوتی۔
اسے چپ چاپ ضبط کی کڑی منزلوں سے گزرتا دیکھ کر بسیط کے دل میں اک ٹیس سی اٹھی۔ جی کیا کہ وہ اس پاگل لڑکی کو اپنے اندر کہیں چھپا لے جہاں کوئی فکر، کوئی غم، کوئی سوچ تو دور اسے گرم ہوا بھی نہ چھو سکے۔
" آپ صحیح کہہ رہی ہیں۔ مجھ سمیت کوئی بھی شخص اس درد، اس نقصان کی حد کو نہیں پہنچ سکتا جو آپ نے جھیلا ہے اور نا حال جھیل رہی ہیں۔ لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں سلویٰ کہ رات چاہے کتنی ہی تاریک، کتنی ہی وحشت بھری کیوں نہ ہو، ڈھل ہی جاتی ہے۔ زخم چاہے کتنے ہی گہرے، کتنے ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہوں، بھر ہی جاتے ہیں۔ یہ قدرت کا نظام ہے۔ جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ مجھے بھی یقین ہے کہ ان شاء اللہ آپ کی زندگی میں ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب آپ اس سب سے مکمل طور پہ ابھر آئیں گی۔ لیکن اگر تب تک آپ کے ان اندھیروں میں، میں آپ کا ساتھ نبھا سکوں آپ کے درد، آپ کے دکھ کو بانٹ سکوں تو مجھے اچھا لگے گا۔"
اس کی جانب دیکھتا وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا تو سلویٰ گردیزی کو لگا جیسے اس سے سمجھنے میں کوئی غلطی ہو گئی ہو۔
" کیا مطلب؟" اس نے الجھ کر اسے دیکھا۔
"میں آپ کو پسند کرتا ہوں سلویٰ اور آج سے نہیں بلکہ اس وقت سے کرتا ہوں جب آپ کی زندگی میں کسی اسفند کا گزر نہیں ہوا تھا۔ جب آپ جرار گردیزی کی امانت تھیں اور چونکہ مجھے امانت میں خیانت کی عادت نہیں اس لیے میں نے آپ سے منسوب اپنے ہر جذبے، ہر خواہش کو اپنے اندر ہی کہیں دفن کر لیا تھا۔ میں آپ سے اپنی محبت کو سب سے چھپا گیا لیکن اپنی دوست سے نہیں چھپا پایا۔۔۔ حیا جانتی ہے کہ میں آپ سے محبت کرتا تھا، کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔"
اس کی آنکھوں میں دیکھتا وہ بنا کسی تامل کے بولا تو سلویٰ ایک پل کو اپنی پلکیں جھپکنا بھول گئی۔
" کیا؟ ل۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟" اس کا انداز سراسر خود کلامی کا سا تھا۔ بسیط غوری کے لبوں پہ اک زخم خوردہ سی مسکراہٹ آ ٹھہری۔
" یہ پہیلی تو آج تک میں بھی بوجھ نہ پایا کہ یہ سب کیسے ہوا۔ لیکن یہ سچ ہے کہ میرے دل نے آپ کی

آرزو کے بعد پھر کسی اور کی تمنا نہیں کی۔ تب بھی نہیں جب آپ جرار سے منسوب تھیں۔ اور اس کے بعد بھی نہیں جب آپ نے اس سے اپنی راہیں الگ کرلیں۔ آپ اپنی زندگی میں بہت آگے بڑھ گئیں لیکن یہ دل آج بھی وہیں کھڑا ہے جہاں اول روز سے تھا۔ یہ آپ سے کسی صورت دست بردار ہونے کو تیار نہیں سلوئی گردیزی۔"

وہ اپنے جذبات کی تمام تر شدت کے ساتھ بولا تو سلوئی اس کی آنکھوں سے عیاں ہوتی سچائی کے آگے گنگ ہوگئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اسے کیا کہے۔

"میں......" وہ لحظہ بھر کو رکی۔ اس کے خیالات اتنے بکھرے ہوئے تھے کہ اس کے لیے انہیں کسی ایک نکتے پر مرکوز کرنا مشکل ہورہا تھا۔ "میں آپ کے قابل نہیں بسیط۔ مجھے آپ کے اخلاص، آپ کی نیت پر کوئی شبہ نہیں۔ نہ ہی مجھے آپ کے جذبوں کی سچائی سے انکار ہے لیکن ان کی پذیرائی میرے لیے ممکن نہیں۔ میرے پاس آپ کو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں۔" وہ جیسے بے بسی کی انتہا پر تھی۔

"کیا امید کی ایک ننھی سی کرن بھی نہیں؟" بسیط کی آنکھوں میں یاسیت کے گہرے رنگ اتر آئے۔ سلوئی کو اپنا آپ اس کا مجرم محسوس ہونے لگا۔

"مجھ سے امید لگا کر کیا کریں گے؟ میں ایک طلاق یافتہ اور بچے کی ماں ہوں۔ میرا اور آپ کا کوئی جوڑ نہیں بنتا۔" وہ آزردگی سے بولی۔ بسیط کی پیشانی پر بل آ ٹھہرے۔

"پلیز، یہ سب دقیانوسی باتیں ہیں......" اس نے ناگواری سے اسے ٹوکا۔ "ہمارے خاندان کی کبھی بھی ایسی گری ہوئی سوچ نہیں رہی نہ ہی آپ کے بڑوں کا ایسا ماننا ہے۔۔۔۔ اگر ایسا ہوتا تو حاتم انکل کبھی بھی طیبہ پھپھو کو قبول نہ کرتے۔ ان دونوں کی کامیاب ازدواجی زندگی ہمارے سامنے ایک بہترین مثال ہے۔ اس لیے پلیز، دوبارہ میرے سامنے خود کو یوں بے توقیر مت کیجیے گا۔ مجھے خود سے منسوب لوگوں اور ان کی عزیز ہستیوں کی عزت کرنا اور کروانا باخوبی آتا ہے۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا تو سلوئی خاموش سی ہو کر نگاہیں جھکا گئی۔ بسیط نے ایک نظر اس کی جھکی پلکوں پر ڈالی اور گہری سانس لی۔

"میں سمجھ سکتا ہوں کہ آپ کے لیے فی الوقت کسی نئے تعلق، نئے رشتے کے بارے میں سوچنا ممکن نہیں۔ لیکن میں چاہوں گا کہ زندگی میں آپ جب بھی خود کو، ذہنی اور جذباتی طور پہ، آگے بڑھنے کے لیے راضی کر پائیں، تو مجھے ایک بار ضرور پکار لیجیے گا۔"

اس کے مطالبے پر سلوئی حیرت زدہ سی رہ گئی۔ محبت میں صبر، انتظار، قربانی اور یکتائی جیسی تمام صفات تو عورت ذات سے منسوب تھیں پھر بھلا یہ کیسا مرد تھا جو فی زمانہ خود کو باخوشی لاحاصل انتظار کی سولی پر چڑھانے کے لیے تیار تھا۔

"اور اگر آپ تب تک تھک کر اپنی راہیں بدل چکے ہوئے تو؟" اس نے نگاہیں اٹھاتے ہوئے بغور اسے دیکھا۔ اس کی نادانی بسیط کو مسکرانے پر مجبور کر گئی۔

"ابھی تک تو نہیں تھکا۔"

اس کی آنکھوں میں دیکھتا وہ باور کرواتے انداز میں بولا تو سلوئی لاجواب سی ہوگئی۔ اس کے ارادوں کی مضبوطی، لہجے کی سچائی اور آنکھوں سے چھلکتا عزم سلوئی کے انکار کی بنیادیں ہلانے لگا، اسے پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کرنے لگا۔ وہ چند لمحے لب دبائے اسے پرسوچ نظروں سے دیکھے چلی گئی اور پھر اک گہری سانس لیتی اثبات میں سر ہلا گئی۔

اس کی ذرا سی یہ جنبش، ذرا سی گنجائش بسیط غوری کو خوشی کے بھرپور احساس سے دوچار کر گئی۔ اسے یوں

لگا جیسے کسی نے پل بھر میں اس کی سالوں پرانی ریاضتوں کو قبولیت کی سند عطا کر کے اس کی بے ثمر محبت کو بہاروں کی نوید سنادی ہو۔

اس کی چمکتی نگاہیں سلوی کے چہرے پر جم سی گئیں جو نا چاہتے ہوئے بھی تمتما اٹھا تھا۔ اس کے عارضوں کی قوس قزح اور پلکوں کی لرزش اس بات کی گواہ تھی کہ وہ دن دور نہیں تھا جب اس کے سچے اور کھرے جذبوں کا انتظار تمام ہونا تھا اور جب اسے اپنے رب کے حکم سے اپنی منزل نصیب ہونا تھی۔

☆☆☆

"خواتین وحضرات، ائیر کینیڈا کی فلائٹ......"

"چلو آؤ۔" اسفند کا ہاتھ زمرد کی کھوئی کھوئی سی نگاہوں کے سامنے آٹھہرا تو اس کے اندر اک ہوک سی اٹھی۔ آج یہ فضائیں اور ان فضاؤں سے جڑا ہر احساس، ہر ساتھ ہمیشہ کے لیے چھوٹنے کو تھا۔ وہ اک سرد سی آہ بھرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسفند نے اس کا ہاتھ تھاما اور میکانگی انداز میں تمام مرحلوں کو پار کرتا جہاز میں آ بیٹھا۔

گہری اداسی کی بڑی جان لیوا سی کیفیت تھی جس نے اسے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ایسے میں عملے نے کیا کہا کیا نہیں اسے کچھ سنائی نہیں دیا تھا وہ تو جب جہاز رن وے پر رینگنے لگا تھا تب ملک اسفندیار بہادر کے لیے اپنی اگلی سانس لینا مشکل ہو گیا تھا۔ اپنی محبت اور اپنے بیٹے سے دائمی جدائی کا کرب ناک احساس اسے پوری شدت سے خود پہ حاوی ہوتا محسوس ہوا تھا، یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا دل درد سے پھٹ جائے گا۔

وہ مٹھیاں بھینچے اپنی جلتی ہوئی آنکھیں سختی سے بند کر گیا۔ اس کے لیے اس مرحلے سے گزرنا اتنا ہی دشوار تھا جتنا کہ فخر سے مکمل دست برداری کا فیصلہ۔ وہ نئے سرے سے لہولہان ہونے لگا۔ تب ہی اپنے بازو پر کسی کے آنسوؤں کی نمی کا احساس اسے اپنی اذیت پس پشت ڈالنے پر مجبور کر گیا۔ اس نے دھیرے سے اپنی آنکھیں کھولیں۔ زمرد کا نازک سا وجود اس کے ساتھ لپٹا ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ وہ خود پہ ضبط کے کڑے پہرے بٹھاتا سیدھا ہو بیٹھا۔

اس تمام قصے میں اگر کسی نے اس کے ساتھ بنا کسی قصور کے ہر سزا جھیلی تھی تو وہ زمرد تھی۔ اس کا بازو بے اختیار اس کے گرد آٹھہرا۔ کاش کہ وہ اس کے دکھ کا مداوا کر سکتا۔ اس کی جھولی میں اس کا بیٹا، اس کا فخر واپس ڈال سکتا لیکن چونکہ ایسا ممکن نہ تھا اسی لیے اسفند نے اس کی اور اپنی آزمائش ختم کرنے کی ٹھانی تھی۔ اس نے ان سب جھمیلوں سے دور، بہت دور اپنی اور زمرد کی ایک نئی دنیا بسانے کا فیصلہ کیا تھا جہاں وہ اسے اپنی بھرپور توجہ دے پاتا۔ اسے محبت اور عزت سے بھری ایک ایسی رفاقت دے پاتا جو کم از کم اس کے معاملے میں اسفند کو اپنے اللہ کے حضور سرخرو کر پاتی۔ اس کے دل پہ دھرے بوجھ اور روح میں پنپتے پچھتاووں کو کم کر پاتی۔ وگرنہ سلوی کے معاملے میں تو وہ اپنے دامن میں آگ بھر ہی بیٹھا تھا۔ اب تو صرف رحمتِ خداوندی سے ہی امید تھی جو اس کی توبہ کو بارگاہِ ایزدی میں قبولیت کی سند عطا کروا سکتی تھی۔ جو اسے نئے سرے سے خود کو جوڑنے اور اپنے لیے ایک نیا جہان تلاشنے کا حوصلہ عطا کر سکتی تھی۔ اسے اب اپنی ادھوری زندگی کو ایک بار پھر مکمل بنانا تھا۔ ایک نئی زمین، نیا آسمان تراشنا تھا۔ اور یہ سب اسے اس بار سلوی گردیزی کی قربانیوں اور اس کی محبت کے بنا تنہا اور اکیلے کرنا تھا۔ یہی اس کی سزا بھی تھی اور شاید اس کی بخشش کا سامان بھی۔

☆☆

سالگرہ نمبر



نازنین فردوس

سگھڑ لڑکی

"بہن۔ وہ خالہ رشیدہ کی بیٹی کیسی ہے۔ اپنے فہد کے لیے۔"

"وہ نغمہ۔ رہنے دو، وہ تو بالکل بھی سگھڑ نہیں ہے۔"

"کیا...... سگھڑ نہیں ہے۔ پھر رہنے دو۔ کوئی اچھی سگھڑ لڑکی ہو تو بتاؤ۔"

"لڑکی خوب صورت ہو اور سگھڑ ہو۔ بس۔"

"اگر لڑکی سگھڑ نہیں تو رہنے دو۔ اچھی صورت۔ کو لے کر کیا کریں اگر سلیقہ مندی ہی نہیں۔"

"سگھڑ لڑکی چاہیے۔"

"سگھڑ لڑکی۔"

"سگھڑ، سگھڑ......"

ہم جہاں جاتے ہمارے کانوں میں بس یہی لفظ گونجتے۔

"سگھڑ لڑکی۔"

"سگھڑ لڑکی۔" اور ہم سوچتے آج کے زمانے میں اور سگھڑ لڑکی...... رہنے دیں، اس طرح کی کوئی مخلوق آج کل نہیں پائی جاتی۔ ہاں کسی زمانے میں اس طرح کی لڑکیاں ہوتی تھیں۔ اور ان کی بے حد قدر و قیمت تھی۔ لیکن آج کل ان کا کال پڑ گیا ہے نجانے زمین کھا گئی کہ آسمان، سگھڑ لڑکیوں کو ڈھونڈنا تو جوئے شیر لانے کے مترادف ہو گیا ہے۔ ویسے سگھڑ لڑکیوں نے شاید ٹھان لیا تھا کہ بس بیسویں صدی تک ہی پیدا ہونا ہے۔ اس کے بعد نہیں۔

شاید ان کی قسم سے ہی ہم جیسے پھوہڑ پیدا ہوئے تھے۔ بلکہ کچھ تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ سو پھوہڑ لڑکیاں مری ہوں گی تب یہ پیدا ہوئی ہو گی۔ اب ہم پیدا ہوئے تو اس میں ہماری غلطی تھوڑی ہے۔ اگر اس بارے میں پتا ہوتا تو ہم کچھ احتیاطی تدابیر کے ساتھ پیدا ہوتے۔ اب کیا کریں، اب تو جو ہونا تھا ہو گیا۔

چلیے، اب اپنے بچپن کی بات کرتے ہیں۔"

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔" کی طرح ہمارا پھوہڑ پن بھی بچپن میں ہی ظاہر ہونے لگا تھا۔ وہ اس طرح کہ جب اسکول جانے کے لیے بال بنانا ہوتا تو بجائے امی کے ہاتھوں سے بال بنانے کے ہم خود اپنے بال بنا لیتے تھے۔ لیکن جب اسکول جاتے تو ہمارے پیچھے اکثر بچے ہمارے بال دیکھ کر ہنس رہے ہوتے تھے۔ ہماری کم عقلی کی بدولت بات بہت دیر سے سمجھ میں آئی۔ جب ایک سینئر خیر خواہ نے ہمیں بتایا۔

"جب بال بنایا کرو تو پیچھے کے بال بھی اچھی طرح سلجھا لیا کرو، تم سامنے تو بال اچھے بنا لیتی ہو لیکن پیچھے سے وہ ابابیل کا گھونسلہ نظر آ رہا ہوتا ہے۔"

آپ یقین مانیں گھڑوں پانی پڑ گیا یہ سوچ کر کہ اتنے دن سے ہم ابابیل کا گھونسلہ سر پر رکھے اسکول جا رہے تھے۔ اس تاریخ سے ہم نے خود سے بال بنانا چھوڑ دیا۔

خیر جیسے تیسے بڑے ہو گئے بڑے ہوتے تے ہمارے پھوہڑ پن پر کوئی اثر نہیں ڈالا بلکہ بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ ہم اور زیادہ پھوہڑ ہوتے گئے۔ کپڑوں کی الماری اور ہماری بھی بنی نہیں، ہمیشہ چھتیس کا آنکڑہ رہا۔ ہم کپڑے الماری میں دھکیلتے، بدلے میں الماری سارے کپڑے باہر دھکیلتی۔ یہ ڈراما روز چلتا۔ کسی دن امی صلح کا فرض نبھانے آ جاتیں، تو الماری ہم سے ڈھنگ سے پیش آتی لیکن پھر چند دنوں بعد وہی رفتار بے ڈھنگی، ہماری بھی اور الماری کی بھی۔

الماری کی طرح فریج سے بھی ہماری بنتی نہیں۔ ایک "سرد جنگ" ہمیشہ سے رہتی ہے۔ ادھر فریج میں ہم نے کچھ لاپروائی سے رکھ چھوڑا ادھر فریج ہماری لاپروائی کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیتی۔ اور گھر کے سارے بڑے ہمیں ڈھونڈنا شروع کر دیتے۔

"ارے یہ فریج میں خربوزہ رکھ کر بھول گئی،

سارے فریج میں خربوزہ کی بو ہوگئی۔ کچھ عقل نہیں اس کو نجانے کب سدھرے گی۔" (لو بھلا، بگڑی بھی کبھی بنتی ہے)

"ہم غصہ سے فریج سے ساری اشیاء نکال پھینکتے اور فریج سے بدلہ لینے کے لیے باڈی اسپرے مار دیتے۔ اور پیدا کر بدبو، ایسے ہی باڈی اسپرے کرتے رہیں گے۔ لیکن فریج بھی ہماری طرح ایک نمبر کا ڈھیٹ وہ ویسے ہی رہتا جیسے اس کا دل چاہتا۔

ایک بار ایسا ہو کہ ہم ہمارا والٹ یعنی بٹوا کہیں بھول گئے اب یاد ہی نہیں آرہا کہاں رکھ دیا۔ آتے جاتے الماری کھولتے جاتے اور بٹوا ڈھونڈتے لگتے ہیں۔ الماری ہر بار ہمیں منہ چڑانے لگی تھی۔ تھک ہار کر ہم نے پانی پینے کے لیے فریج کھولا تو والٹ وہاں رکھا تھا۔ سر پیٹنے کو جی چاہا ہمارا۔ تو یہ تو یہ ان دونوں نے کیسے ملی بھگت سے ہمیں ستایا، ایک طرف الماری تو دوسری طرف فریج، ہم نے بے دھیانی سے بٹوا فریج میں رکھ دیا۔ (کیا پتا دھنیا الماری میں رکھ دیا ہو) وہ تو اچھا ہوا ہم نے والٹ فریج میں رکھ دیا اگر مائیکروواوون میں رکھ دیتے تو!

☆☆☆

امی کو اب ہمیں سلیقہ مند بنانا تھا۔ اس لیے انہوں نے ہمیں سلائی کا کام سیکھنے کا مشورہ دیا۔

"امی ہم سے مار کٹائی وغیرہ نہیں ہوگی۔" ہم نے سرے سے انکار کر دیا۔

"ارے سینے پرونے کی بات کر رہی ہوں۔ میں آنٹی سے بات کروں گی۔ وہ سینٹر چلاتی ہیں۔ تمہارا کچھ تو بھلا ہوگا۔"

اب ہمارا بھلا ہوتا تھا کہ برا، یہ تو ہم کچھ نہیں سکے لیکن بہر حال ہمیں جانا پڑا۔

اب آنٹی کو کیا پتا تھا کہ سلائی وغیرہ میں ہم کتنے کند ذہن ہیں۔ تین مہینے تک تو سوئی میں دھاگا ڈالنا ہی سیکھتے رہے۔ آنٹی کو بھی اندازہ ہو گیا کہ مقابل انہیں ناکوں چنے چبوانے والا ہے۔ سلائی کے معاملہ میں آخر چھ مہینے گزر گئے انہوں نے ہمیں کپڑا دیا۔ اور کہا کہ آپ گلا کاٹیں میں دوسری بچیوں کو دیکھتی ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ہماری طرف پلٹیں۔

"کیا ہوا گلا نہیں کاٹا۔"

"جی وہ کس کا گلا؟"

"آپ تو بس اب میرا گلا ہی کاٹ دو......" انہوں نے جل کر کہا۔ "غضب خدا کا، چھ مہینے سے تمہارے پیچھے دماغ کھپا رہی ہوں۔ اور یہاں سادگی کا یہ عالم تو یہ توبہ...... تو بس معاف کر دو مجھے۔"

وہ سیدھے سیدھے ہمیں جانے کو کہہ رہی تھیں۔ ہم بھی الٹے قدموں گھر آگئے اور آتے ہی چلا کر کہا۔

"ہم سے نہیں ہوگا گلا کاٹنا، جیب کاٹنا۔ وہ آنٹی تو ہمیں سیدھا سیدھا مجرمہ بنانے پر تل گئی ہیں۔" ہماری باتیں سن کر امی تو سر پیٹتے رہ گئیں۔

☆☆☆

ایک طرف رمضان کی آمد تو دوسری طرف امی کی طبیعت خراب ہوگئی۔ اور کچن کی ذمہ داری ہمارے نازک کندھوں پر آپڑی۔ ہم نے بھی سوچ لیا کہ یہی وقت ہے کچھ کر دکھانے کا۔ ہم کچن میں "سبز انقلاب" لانے کے لیے بے چین تھے۔

کچن میں ہماری آمد کے ساتھ کئی قسم کے حشرات نے دھاوا بول دیا۔ امی بھی کچن میں جھانکتیں تو ہمیں باتیں سنانے لگتیں۔

"یہ چوہے دیکھو، کیسے دندناتے پھر رہے ہیں جیسے کہ ان کے باپ کا کچن ہو۔ تم نے تو کچن ان کے حوالے ہی کر دیا۔ دیکھو کیسے کود رہے ہیں۔"

"تو امی ہم نے انہیں دعوت تھوڑی نا دی ہے۔ وہ بن بلائے آگئے ہیں۔ بے غیرت کہیں گے۔" ہم نے چوہوں کو کوسا۔

''تم جو روٹی کے ٹکڑے، ٹماٹر وغیرہ ادھر ادھر پھینک رہی ہو نا وہ ان کے لیے دعوت جیسا ہی ہے۔''

''ارے امی، آپ بھی ناں......'' ہم ہنسے۔'' وہ تو ہم ایسے ہی ڈال رہے تھے۔ اب بے چارے روزی روٹی کے لیے کہاں دھکے کھاتے پھریں گے۔''

اس کے جواب میں امی نے جو گھور کر دیکھا تو ہم کھسیا سے گئے۔ وہ بھی اپنی جگہ درست تھیں۔ کچن میں زبردست قسم کی حشرات کی فوج نے دراندازی کر دی تھی۔ مکڑیاں لینڈ گرابر بنے یہاں وہاں جالے بن کر دیواروں پر قبضہ کر رہی تھیں۔ چونٹیوں نے الگ ناک میں دم کر رکھا تھا۔ وہ ہر میٹھی چیز پر اپنا ہی حق سمجھ رہی تھیں۔ شکر پر تو ان کا پیدائشی حق ہے ہی مگر آٹے، چاول پر بھی اپنا حق ملکیت جتا رہی تھیں۔ چوہیاں تو چوہیاں تھیں، مچھر نے بھی ہمارے کچن پر حملہ بول دیا تھا۔ اور ہم نہتے ان تمام سے نبرد آزما تھے۔

☆☆☆

ایسے میں اپیا معہ اپنے دو بچوں کے ساتھ وارد ہوئیں۔ بچے کیا تھے آفت کے پرکالے تھے۔ ہمیشہ کچھ نہ کچھ اوٹ پٹانگ کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے ہمارے ناک میں دم کر دیا تھا۔ لیکن بہن کی خاطر برداشت کر رہے تھے۔ لیکن یہی بات وہ بھی بڑے دھڑلے سے کہتے تھے۔ ''ہم آپ کو اپنی ماں کی بہن ہونے کی وجہ سے برداشت کر رہے ہیں۔''

یہ سن کر تو ہم نے خوب دھنائی کی تھی، بدلہ میں امی نے ہماری کھنچائی کر دی۔ امی سے شکایت جو کر دی تھی ان شیطانوں نے۔

ہم لوگوں کی حرکتیں دیکھ کر ہی اپیا نے اپنے بچوں کو شیطان اور ہمیں شیطان کی خالہ کا لقب دے دیا تھا۔ اس دن بھی جب امی اور اپیا بازار گئی تھیں اور ہم گدھے گھوڑے بیچ کر خواب خرگوش کے مزے لینے کا ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ ان شیطانوں نے شور مچایا کہ ہمارے لیے جوس بنائیں۔ ہم ''کاہلوں کے سردار'' نے کہا۔

''ہم سو رہے ہیں خبردار جو ہمیں جگایا تو! جوس ووس پینا ہے تو جاؤ کچن میں جا کر خود بناؤ۔''

لیکن ہمیں کیا پتا تھا کہ ہم اپنی شامت اعمال کو دعوت دے رہے ہیں۔ ہم تو سو گئے اور جب اٹھے تو امی اپیا بھی آ گئی تھیں۔ ہم نے کچن میں جھانکا، اپیا نے سب سامان وغیرہ اپنی جگہ پر رکھ دیا تھا گویا کہ اپنے لاڈلوں کے کرتوتوں پر پردہ ڈالا تھا۔ ہم نے بھی سکھ چین کی سانس لی۔ اپیا شام تک چلی گئیں اور ہم بہت دیر تک ان کے جانے کا جشن مناتے رہے۔ لیکن ہمیں یہ پتا نہیں تھا کہ آگے ہمارا بینڈ بجنے والا ہے۔

☆☆☆

رمضان ختم ہو چکا تھا اور اب عید آ گئی تھی، امی نے ہمیں حکم دیا کہ شیر خرمہ تم بنا لو میں گھر کی صفائی وغیرہ کر لوں گی۔ ہم نے اثبات میں سر ہلایا اور بڑی تندہی سے شیر خرمہ بنانے لگے۔ اصلی گھی، مغزیات اور نمکین سویوں سے بگھار کر شیر خرمہ دم پر رکھا اور خود سارے مہمانوں کے استقبال کو جا کر کھڑے ہو گئے۔ تایا، اپیا بھائی جان سب آ گئے اور ہم شیر خرمہ سب کو پیش کرنے لگے۔ لیکن حیرت کی بات تھی کسی نے بھی شیر خرمہ کی تعریف نہیں کی۔ بس دو دو چمچے لیتے اور چھوڑ دیتے۔ ہمارا ماتھا ٹھنکا تو امی نے بھی سوالیہ نظروں سے ہمیں دیکھا۔ ہم نے حسب عادت کندھے اچکائے۔ امی نے کچن میں ہمیں بلایا اور شیر خرمہ چکھایا۔

''توبہ'' ہمارے منہ سے نکلا۔ یہ کیسا ذائقہ ہے امی۔''

''میں نے یہی پوچھنے کے لیے بلایا ہے کہ یہ کیا ہے۔'' امی کا قہر برساتا لہجہ۔ ہم سر کھجانے لگے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شیر خرمہ میں کیا کمی رہ گئی۔

"شاید شکر کم پڑ گئی۔"
ہم نے اپنے کٹورے میں شکر ملادی مگر شیر خرمہ کے ذائقہ میں کوئی زیادہ فرق محسوس نہ ہوا۔
"یہ شیر خرمہ یا ہے قورمہ؟" امی نے غصہ سے پوچھا۔
"امی سچ میں یہ شیر خرمہ میں نمک کیسے پڑ گیا۔" ہم الٹا ان ہی سے پوچھنے لگے۔
"اب یہ تو تم بتاؤ مجھے کہ یہ خرمہ "قورمہ" کیسے بنا۔ کیا بنے گا تمہارا، سارے خاندان میں ناک کٹوادی۔ اب تمہاری تائی سارے خاندان میں ڈھنڈورا پیٹیں گی کہ ہمارے ہاں میٹھا نہیں نمکین شیر خرمہ بنا تھا۔ میری مت ہی ماری گئی تھی جو تمہیں بنانے کے لیے کہا خود ہی بنالیتی تو یہ نوبت ہی کیوں آتی۔"
امی کی گولا باری شروع ہو گئی تھی۔ اور ہم منہ کان دبائے سن رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ شکر نمک میں کیسے بدلی۔ ویسے بھی شیر خرمہ نا میٹھا تھا نا کھارا۔ بس شکر نمک کا ملا جلا محلول لگ رہا تھا۔
ہم دوبارہ جائے واردات پر پہنچے اور سارے کچن کا دوبارہ جائزہ لیا تب جا کر عقدہ کھلا کہ ہم نے جو شکر کا ڈبا لیا تھا وہ روزانہ استعمال میں آنے والا ڈبا نہیں تھا۔ بلکہ یہ الگ رکھا ہوا تھا اور ہم نے شیر خرمہ کے لیے جو شکر ڈالی تھی۔ وہ اس میں سے ڈالی تھی۔ چونکہ شکر اس ڈبے میں زیادہ تھی۔ اس ڈبہ کو دیکھتے ہی جیسے ساری گتھیاں سلجھنے لگیں۔ منظر، پس منظر سب سمجھ میں آنے لگا ہمیں یاد آ گیا۔
جب ہم سونے جا رہے تھے۔ امی اپیا بازار گئی ہوئی تھیں اور اپیا کے شیطانوں نے جوس کی فرمائش کی تھی۔ ہم نے سوئے سوئے ہی ان کو خود جوس بنانے کے لیے کہا تھا۔ انہوں نے جوس تو بنالیا مگر شرارتاً شکر میں پسا ہوا نمک ملادیا۔ چونکہ شکر تو موٹی تھی مگر نمک پسا ہوا تھا اس لیے شکر میں نمک نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ ہماری شامت آئی تھی جو ان کو جوس بنانے کے لیے کہا تھا۔ ہم نے ان دونوں شیطان کو کانوں سے پکڑا۔
"ہم صرف تجربہ کر رہے تھے۔" ان دونوں نے دہائی دی۔
"شکر میں نمک ملا کر تم کون سے سائنسدان بن جاتے۔" ہم نے دونوں کے کان مروڑے۔
"ان معصوموں کو چھوڑو۔ ان سے زیادہ تو تمہیں تجربہ ہو گیا ہوگا کہ اس طرح بچوں کو کچن میں نہیں بھیجنا چاہیے۔ بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں کچھ بھی غلط ہو سکتا تھا۔ کچھ بھی سنگین حادثہ ہو سکتا تھا۔" امی نے ہمیں لتاڑنا شروع کیا۔
"اور نہیں تو کیا خالہ؟" بچوں نے ہاں میں ہاں ملائی۔ ان کی ہنسی دیکھ کر ہمارے تو تن بدن میں آگ ہی لگ گئی۔
"اس سے زیادہ اور کیا سنگین حادثہ ہونا تھا۔ عید کا شیر خرمہ اور وہ بھی نمکین۔" ہم بسورے۔
تمہاری ان لاپروائیوں نے یہ دن دکھایا ہے۔ امی کی گولا باری جو رک گئی تھی پھر سے شروع ہو گئی۔
امی! ہم آپ کو "پکی سگھڑ لڑکی" بن کر دکھائیں گے۔ ہماری بات پر امی نے ہمارے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔
"نا بابا نا، تم رہنے دو پتا چلے سگھڑ کے بجائے تم کچھ اور بگڑ گئی ہو۔ اللہ سب پر رحم کرے۔"
لو، امی تو ایسے دعا کر رہی ہیں جیسے ہم نہ ہوئے کوئی بلا ہو گئے کہ "اللہ محفوظ رکھے۔"
ہم جیسے بھی ہیں ہیں بس سگھڑ نہیں ہیں۔ کیا کریں۔ ویسے ہم سوچ رہے ہیں کہ سگھڑ بننے کا کوئی کریش کورس ہی کر لیں، کم سے کم امی کے طعنوں سے تو نجات ملے گی۔ ہے ناں......

☆☆

سالگرہ نمبر



آسیہ رئیس خان

ایک بنچ دو اجنبی

اس نے ہاتھ میں بچا آخری پتھر پوری قوت سے پھینکا تا کہ وہ دور جا کے گرے لیکن وہ 'ڈب' کی آواز پیدا کرتا پچھلے تمام پتھروں سے قریب ہی پانی میں ڈوب گیا۔ دل میں سوچے نشانے تک پتھر پھینکنے میں اس کے اپنی قوت کم پڑ گئی تھی۔

"جب مجھ میں ہی صلاحیت نہیں تو پتھر کیوں میری خواہش کا احترام کرے!" اس نے اداسی سے سوچا اور کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ "کاش یہاں رات گزاری جا سکتی!" پر آشوب اور بھاگتے دوڑتے شہر کے اس پرسکون گوشے نے اس کے اندر یہ کاش جگایا تھا۔

آج اتفاق سے اسے اس جگہ کا علم ہوا تھا۔ دفتر کی ساتھی نیلیما اچانک چکرا کے گر گئی تھی۔ چوں کہ وہ تین ماہ کی حاملہ تھی لہٰذا اس کے سنبھلنے کے بعد سب نے احتیاط کے مدنظر اسے ٹیکسی سے گھر جانے کا مشورہ دیا۔ ٹرین کے اس 'ہاربر لائن روٹ' پر وہ اور نیلیما ہی رہتی تھیں اور اس کا اسٹیشن نیلیما کے بعد آتا تھا۔ نیلیما کو اکیلے بھیجنا مناسب نہیں تھا اس لیے سب نے ساتھ اسے بھی بھیج دیا کہ اسے گھر چھوڑ کر وہ ٹرین سے آگے اپنے گھر جا سکتی تھی۔

مکمل ناول





دفتر سے وہ دونوں اوبر سے نکلی تھیں۔ اسٹیشن قریب تھا اس لیے وہ نیلیما کو گھر چھوڑنے کے بعد پیدل ریلوے اسٹیشن جا رہی تھی کہ راستے میں اس خوب صورت پارک پر نظر پڑی۔ وہ یونہی ٹہلتے ہوئے اندر چلی آئی۔ پارک میں داخل ہوتے ہی مختلف انداز میں لگے خوب صورت پودے، سبلک جم اور گھاس کا قطعہ نظر آیا جہاں ہر عمر کے افراد بیٹھے تھے۔ وہ درمیانی روش پر چلتی آگے بڑھی، آگے ایک اور بڑا سا رقبہ پکے فرش کا تھا جس کے دائیں بائیں گھاس اور باغیچہ تھا۔ یہیں سے اسے تالاب دکھائی دیا۔ یہ پارک تالاب سے لگا تھا جس کے دوسری طرف مصروف شاہراہ تھی اور تالاب کے گرد کئی کلو میٹر لمبا جاگنگ ٹریک بنایا گیا تھا۔ وہ بھیڑ اور شور پیچھے چھوڑتی خالی ٹریک پر چلنے لگی۔ ٹریک پر تالاب کی طرف چھوٹے چھوٹے پھولوں والے پودے تھے اور دوسری سمت بڑے بڑے بوگن ویلیا اور گل مہر کے پیڑ۔ جن کے زرد، کیسری، سرخ، سفید، گلابی پھول شاخوں سے روٹھ کے ٹریک پر بکھرے تھے۔ وہ چلتے چلتے قدرے خاموش حصے میں پہنچی جہاں تک پارک سے اٹھ رہے شور اور ہنگامے کی رسائی نہیں تھی۔ ٹریک پر مخصوص دوری پر بنچ رکھے تھے۔ وہاں بھی ایک بنچ تھا۔ یہاں کے سکوت میں ارتعاش بھی گھنے پیڑوں سے ابھرتی پرندوں کی آواز سے پیدا ہو رہا تھا یا پھر دور سے سنائی دیتے گاڑیوں کے ہارن سے۔ ڈھلتا دن خوب صورت شام کی صورت کچھ دیر کا مہمان بنا اسے اس گوشے میں بیٹھ کر کچھ وقت اپنے ساتھ گزارنے کی دعوت دے رہا تھا۔ اس نے دعوت قبول کی اور وہ وہیں بنچ پر بیٹھ گئی۔ تالاب میں ڈوبتے سورج کے عکس سے لطف اندوز ہوتے جیسا فرحت انگیز کام وہ زندگی میں پہلی بار کر رہی تھی۔ کبھی کبھی اکا دکا بندہ اس کے سامنے ٹریک سے تیز تیز چلتا یا دوڑتا گزر جاتا۔ ان آتے جاتے اجنبیوں میں بے فکری سے بیٹھے رہنا اسے بڑی عیاشی لگ رہا تھا۔

وصی دور سے ہی اپنا بنچ 'انگیج' دیکھ کر رک گیا۔ ڈوبتے سورج کی سنہری کرنوں سی وہ لڑکی اس قدر آس پاس سے بے گانہ لگ رہی تھی کہ اسے وہاں جانا مناسب نہیں لگا۔ اگر وہ خود یوں تنہا ہوتا تو کسی کی آمد اسے برداشت ہوتی نہ اسے بنچ پر کسی کے ساتھ بیٹھنا گوارا تھا۔ وہ پلٹ کر باغیچے میں گھاس پر بیٹھ گیا۔ اس نے ایسی جگہ منتخب کی تھی وہ زرد اور سفید لباس والی لڑکی پارک سے باہر جاتی تو اسے دکھائی ضرور دیتی کہ آنے جانے کا ایک ہی راستہ تھا۔ جلد ہی فون اسکرول کرتے ہوئے انتظار سے اکتا کر اس نے بیگ کھول کر اپنی 'سڈوکو' کی کتاب اور پینسل نکالی اور شروع ہو گیا تاہم جلد ہی چند خانے بھرنے کے بعد کتاب بند کر دی۔ عوامی جگہ کے اس حصے میں یکسوئی ناممکن تھی اور اسے مزا بھی نہیں آ رہا تھا، گویا یہ تفریح اس بنچ سے مشروط تھی۔ یہ کام وہ کئی ہفتوں سے اس بنچ پر ہی کرتا تھا۔ اس نے اٹھ کے ایک بار پھر آگے جا کے دیکھا، وہ لڑکی اب تک وہیں شام کی سنگت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

''کیا پتا اس کے اٹھنے تک اندھیرا ہو جائے۔''

اس نے فون نکال کر ٹرین کا وقت دیکھا۔ سات منٹ بعد اگلی ٹرین تھی۔

''آج کی شام تمہیں دے دی۔'' اس نے اجنبی لڑکی کو دیکھتے ہوئے اپنی شاہانہ مروت کا اظہار کیا اور باہر کی طرف چل پڑا۔ اسے کہاں علم تھا یہ شام، شاموں کی اس زنجیر کی پہلی شام تھی جو اسے مقید کرنے کے لیے تیار ہونے جا رہی تھی۔

اندھیرا ہونے لگا تو ثمرین کو ایک دم احساس ہوا گھر پہنچتے تک مغرب قضا ہو جائے گی۔ وہ تیزی سے پرس اٹھا کر باہر کی طرف دوڑی۔

وہ فون میں قریبی مسجد دیکھ رہی تھی کہ اکثر بازار والے علاقے میں مسجد ہو تو وہاں خواتین کا الگ انتظام مل جاتا تھا۔ آس پاس کوئی مسجد تو نہیں تھی لیکن ایپ اسٹیشن کے قریب شاپنگ پلازہ میں نماز کی جگہ دکھا رہا تھا، جو پارک کے سامنے ہی تھا۔ وہ فون پرس میں رکھ کر اسی عمارت کی طرف بڑھ گئی۔

اپنے اسٹیشن کے باہر وہ رکشا کے لیے قطار میں لگی تو روز کے مقابلے آج چہرہ تھکاوٹ کے باوجود

کھلا سا تھا۔ ورنہ ٹرین کے دھکے کھانے اور دفتر کے کام کے بعد روز اس وقت اس پر اتنی تھکن سوار ہوتی تھی کہ وہ کسی روبوٹ کی طرح ہاتھ پیر ہلا کر گھر پہنچتی تھی۔ آس پاس پھیلی چہروں کی بھیڑ اور آوازوں کا بازار ہوتے ہوئے بھی وہ اس وقت ساری دنیا میں تنہا ہوتی۔ لوگوں کی ہنسی، اکتاہٹ، غصہ، جھنجلاہٹ کچھ بھی اس پر اثر انداز نہیں ہوتا تھا۔ اسے گھر پہنچ کر بستر پر جانے کی جلدی ہوتی تاکہ اگلی صبح وہ وقت پر بے دار ہو اور اس کی ٹرین نہ چھوٹے۔ صبح دفتر جانے والوں کے لیے منٹ منٹ کا حساب قیمتی ہوتا ہے کہ ایک منٹ کی دیری سے ٹرین چھوٹ گئی تو آگے کا سارا معمول بگڑ جاتا ہے۔ اس معمول میں بھی ایسے وقت میں اس کی حسیات جاگ جاتی تھیں جب گھر سے کسی کا فون یا میسج آ جاتا۔ اس کی خیریت یا سفر کا احوال نہیں بلکہ فون یا پیغام آتے ہوئے کسی کام کو نپٹانے یا کچھ لیتے ہوئے آنے کے لیے ہوتے تھے جیسے اس وقت فرزانہ نے فون کیا تھا۔

”آتے ہوئے 'لکی' سے سالن لیتی آنا میرے سر میں درد ہے۔“

اور وہ چور نظروں سے آس پاس کے لوگوں کو دیکھنے لگی، کہیں کسی نے سن تو نہیں لیا کہ اس کی حیثیت گھر میں اتنی ہی ہے، وہ کمائے اور ان کا حکم بجا لائے۔ اس کے اندر یہ ڈر بڑا گہرا تھا کہ گھر والوں کے رویے پر اس کے اندر کی شرمندگی باہر کسی کو پتا نہ چلے۔ یہ خواہش بھی اس کے اختیار میں نہیں رہی تھی۔ جہاں گھر سے کسی کا فون یا پیغام آتا، اس کی ساری حسیات جاگ جاتیں۔ اسے لگتا ہر کوئی اسے دیکھ رہا ہے، اس کے فون کو سن رہا ہے، اس کے فون میں موصول ہوا پیغام پڑھ چکا ہے اور اب سب اسے طنزیہ مسکراہٹ اور تمسخرانہ ہنسی کے ساتھ دیکھنے لگیں۔ اس خود ساختہ تصور کو حقیقت میں دیکھنا اس کی زندگی کا سب سے بڑا خوف تھا۔

گھر چلانے میں اس کا سب سے بڑا حصہ تھا لیکن اس کا صلہ و توصیف تو دور کوئی اعتراف تک نہیں کرتا تھا۔ ان سب میں وہ واحد تھی جو اپنی ضروریات پر ہی خرچ کرتی تھی۔ اکثر ہی اکاؤنٹ بیلنس اور کارڈ کا بل دیکھ کر اسے اپنا من مارنا پڑتا جس کے خالی اور لمبا ہونے میں اس کا ہاتھ نہیں ہوتا تھا۔ اگر وہ گھر بیٹھ جاتی تو باقی تینوں کے شوق اور شاہ خرچیاں ناممکن تھیں لیکن مع اس کے وہ تینوں بھی جانتے تھے کہ ایسا وہ کبھی کرے گی نہیں۔

اسے اپنے اور باقی سب کے کھانے کے لیے خود ہی جاتے ہوئے سالن لینا تھا اور سر درد کا مطلب تھا روٹی بھی نہیں بنی ہوگی۔ چاول دن کے بچے ہو تو مل سکتے تھے ورنہ گھر جا کے کپڑے بدلنے سے پہلے اسے پریشر کوکر میں چاول رکھنا ہوں گے۔ اس خود غرضی، بے حسی سے زیادہ وہ اپنی ناقدری ساری دنیا سے چھپانا چاہتی تھی۔

قطار آگے کھسکی اور وہ رکشا میں سوار ہو گئی۔ اپنی گلی سے قریبی موڑ پر اتر کے اس نے ڈرائیور کو کرایہ دیا اور گھر کی طرف چل پڑی۔ 'لکی' پر رک کر سالن لیا تو ساتھ تندوری روٹی بھی لے لی کہ بھوک بہت لگی تھی اور اس کی خوشبو نے آج تندوری روٹی کھانے کی خواہش جگا دی تھی۔

اندر ٹی وی پر چل رہے 'بگ باس' کی آوازیں باہر تک آ رہی تھیں۔

”السلام علیکم۔“ اس کی آواز اس شور میں گم ہو گئی۔ سب نے ایک نظر اس پر ڈال کر رخ پھر ٹی وی کی سمت کر لیا۔ اس نے چپلیں اتاریں اور پہلے باورچی خانے میں جا کر پرس سے اپنا چھوٹا سا ٹفن اور 'پارسل' سلیب پر رکھا جہاں شام کی چائے کے برتن پھیلے تھے ساتھ ہی 'سانبھر' کی نچڑی پلاسٹک کی تھیلی اور اڈلی کی باقیات بھی موجود تھیں۔ کمرے میں آ کر اس نے پرس رکھا، دوپٹا اتارا، کان سے ایئر رنگز اور کلائی سے گھڑی اتار کے ہال کے گوشے میں بنے غسل خانے میں چلی گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلی تو 'بگ باس' ختم ہو گیا تھا اور افضل باورچی خانے میں تھا۔

”عنبر! دستر بچھا لو۔“ فرزانہ نے دیوان پر لیٹے لیٹے ہی ریموٹ سے چینل بدل رہی عنبر کو آواز دی۔

اس نے کمرے میں آ کر تولیے سے ہاتھ منہ

پونچھا اور دروازہ بند کر کے کپڑے تبدیل کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد کاٹن کی نائٹی پر دوپٹا گلے میں ڈال کر باہر آئی تو افضل دیوان پر پلیٹ میں کھانا لیے تیزی سے نوالے نگل رہا تھا۔

"دو منٹ رک جاتے سب بیٹھ ہی رہے ہیں۔"

اس نے فریج سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے کہا۔

"مجھے باہر جانا ہے، دیر ہو جائے گی۔" اسے دیر 'بگ باس' ختم کرنے کے بعد ہی ہو رہی تھی۔

"روٹیاں کیوں لیں؟ تمہیں صرف سالن کہا تھا......" فرش پر بیٹھتے ہوئے فرزانہ کو دستر خوان پر رکھی روٹیاں نظر آئیں۔ "اتنی مہنگی دیتا ہے وہ۔"

انہوں نے دو روٹی اٹھا کے اپنی پلیٹ میں رکھی۔ وہ کچھ کہے بنا اپنی پلیٹ میں سالن نکالنے لگی۔

"اس سے اچھا تھا کوک ہی لے آتیں۔" عنبرین نے بیٹھتے ہوئے چاول کا پیالہ، اچار کی بوتل دستر خوان پر رکھی اور سالن پلیٹ میں نکالنے سے پہلے فوائل میں رکھی آخری روٹی اٹھالی۔

ثمرین نے اسے ذرا دیر دیکھا کہ شاید نظروں سے ہی اسے احساس ہو جائے لیکن وہ عنبر تھی۔ آخر اسے دوپہر کے چاولوں کا پیالہ قریب کھینچنا پڑا۔

اس کی معقول ملازمت تھی، ابو کی پینشن ملتی تھی، افضل بھی کالج کے ساتھ ساتھ کوئی نہ کوئی کام کرتا رہتا تھا اب عنبر بھی اپنے کام سے کما رہی تھی لیکن مہینے کا آخر آتے آتے کتنے ہی کام اس کی اگلی تنخواہ کے محتاج ہو جاتے تھے۔ جس کی سب سے بڑی وجہ تھی تو ان کی شاہ خرچیاں تھیں، لیکن وہ بھی سنبھالی جا سکتی تھیں اگر گھر چلانے کا کوئی نظام اور بجٹ ہوتا۔ وہ تینوں ہی پیسے، بچت اور مستقبل کی پروا کیے بنا اپنی دنیا اور خواہشات کی تکمیل میں گم تھے۔ 'جو ہے بس آج ہے' وہ اسی اصول کے تحت اپنی زندگی جی رہے تھے۔ ان کی لغت میں 'کامپرومائز' جیسا لفظ نہیں تھا۔

کھانے کے بعد اس نے دستر خوان اور باورچی خانہ سمیٹا۔ عنبرین اگر کھانا لگا دیتی تو پھر اٹھاتی نہیں تھی اور وہ اسے مل جل کر کام کرنے کی عادت کہتی تھی۔ اس نے پہلے فریج میں صبح کے لیے کچھ ہے یا نہیں دیکھا۔ دو شملہ مرچ اور ٹماٹر تھے۔ اسے شملہ مرچ پسند تو نہیں تھی لیکن اب کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ 'لکی' سے سالن لینے کی فکر میں سبزی لینا بھول گئی تھی۔ اس کے بعد کمرے میں آ کر اس نے اگلے دن کے کپڑے نکال کر استری کیے اور پھر عشاء پڑھ کے بستر پر آ گئی۔ کچھ دیر فون میں مختلف سوشل میڈیا ایپس دیکھتی رہی پھر بتی بجھا کے کروٹ بدلتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

"کل بھی اس ٹریک پر جاؤں گی۔" بند آنکھوں کے پیچھے وہ منظر جھلملایا تو اس نے فیصلہ کیا۔

روز کی طرح افضل جا چکا تھا، فرزانہ باہر نکل کر پڑوسیوں کے ساتھ غیر حاضر پڑوسنوں اور سہیلیوں پر تبادلۂ خیال میں مصروف تھیں اور عنبرین ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

غریب طبقے کے علاقے میں ان کی 'چال' ہی تھی جہاں متوسط اور مالی طور پر مستحکم طبقہ آباد تھا۔ وہ سب اس امید پر برسوں سے ٹکے تھے کہ کبھی تو وہاں 'چال' ٹوٹ کر 'ٹاور' بنے گا اور انہیں اس میں فلیٹ ملیں گے۔ اس کے امی ابا نے بھی دو کمروں اور باورچی خانے پر مشتمل مکان اسی لیے نہیں چھوڑا تھا اور ابا کے بعد یہاں رہنا مجبوری بھی کہ اس کے علاوہ کوئی اور ٹھکانہ نہیں تھا۔

عنبرین بھی اسی کمرے میں سوتی تھی لیکن اس کی رات بارہ بجے کے بعد شروع ہوتی تھی۔ اسے پڑھنے کا شوق نہیں تھا۔ کالج جانے کے بجائے اس نے ایک نام ور بیوٹی اکیڈمی سے مختلف کورسز کر رکھے تھے۔ چند دن قریبی بیوٹی پارلر میں ملازمت کی اور اب انسٹاگرام اور واٹس ایپ کے ذریعے اپنا الگ کام شروع کر لیا تھا۔ وہ میک اپ کی ماہر تھی اور فون پر بکنگ لینے کے بعد وہ صارفین کے گھر اور بتائے پتے پر جاتی تھی۔ اس کا خواب اپنا بیوٹی سلون کھولنا تھا لیکن اس کے لیے بچت یا منصوبہ جیسی چیزیں اس کے ذہن میں نہیں آتی تھیں۔ اس کے پاس بس اونچے خواب تھے۔ وہ جب تیار ہو کر گھر سے نکلتی تو حلیے اور رکھ رکھاؤ میں کسی ملٹی نیشنل فرم کی

فرفر انگریزی بولنے والی میم صاب لگتی تھی۔ اس کے مقابلے ثمرین دھیمے انداز کی پر اعتماد اور اپنے آپ میں رہنے والی لڑکی تھی۔ پہننے اوڑھنے اور رکھ رکھاؤ کا سلیقہ اور شوق اسے بھی تھا لیکن اس کی پسند اور انداز سادہ، دھیما اور محتاط تھا۔

ان دنوں اس کی دفتر کی شفٹ آٹھ سے چار تھی۔ اس لیے اسے صبح چھ بجے گھر سے نکلنا پڑتا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ چار بجے اٹھ جائے۔

☆☆☆

پارک میں داخل ہوتے ہی اس کی طبیعت شاد ہوگئی۔ نم سی خوشبو کے ساتھ ہریالی پر نگاہ پڑتے ہی لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ آج یہاں اس کا چوتھا دن تھا اور وہ اپنے تئیں معمول سے خوش تھی۔

پکی روش پر کھیلتے بچوں کے درمیان سے چلتی وہ جاگنگ ٹریک پر آگئی۔ وہ آتی تب لوگ کم ہوتے تھے لیکن جب واپس ہوتی تو اچھی خاصی بھیڑ ہوتی۔ اس کا رخ اپنی اپنے مخصوص بنچ کی طرف تھا جو آج بھی خالی تھی۔ اس نے دیکھا تھا جیسے ہی اندھیرا ہونے لگتا 'جوڑوں' کی آمد بڑھ جاتی اور وہ ایسی بنچ منتخب کرتے تھے جہاں اندھیرا ہوتا یا جو دور سے صاف دکھائی نہ دیتی ہو۔

ابھی وہ پرس رکھ کر بیٹھنے ہی لگی تھی کہ بنچ کی پشت پر لگی 'اسٹکی نوٹ' دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اس نے جھک کر قریب سے دیکھا۔

"آپ اپنا وقت نہیں بدل سکتیں؟" وہاں انگریزی میں سوالیہ نشان کے ساتھ لکھا تھا۔ وہ جھٹ سیدھی ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔ کوئی مشکوک انسان نظر نہیں آیا۔ ایک بزرگ انکل تیزی سے وہاں سے گزر رہے تھے اور دوسرے طرف سے ایک لڑکی ٹریک سوٹ میں ایئر پوڈز کان میں لگائے دوڑتی آ رہی تھی۔ اس نے پیچھے جا کے پکی جگہ کا جائزہ لیا۔ بچے، بوڑھے، مائیں، دادیاں نانیاں سب اپنے آپ میں یا اپنے ساتھی کے ساتھ مگن تھیں۔

"پبلک پلیس ہے کسی کی جاگیر تو نہیں!" اس نے ایک بار پھر جھک کے سیاہ مارکر سے لکھے الفاظ پڑھے۔

"ضروری تو نہیں یہ میرے لیے ہو۔" وہ 'اسٹکی نوٹ' سے دور ہو کے بنچ پر بیٹھ گئی۔ سر جھٹک کے اس نے پرس سے گرما گرم وڈا پاؤ نکالا اور کھانے لگی۔ یہاں تنہا بیٹھنا بڑی آزادی محسوس ہونے لگا تھا جہاں کوئی دیکھنے والا تھا نہ کوئی جاننے والا۔ یوں انجان اور بے نام اجنبیوں کو دیکھنا اچھا لگتا تھا۔ وہ کبھی تالاب کے ٹھہرے پانی پر نظر جما دیتی تو کبھی تالاب کے دوسری طرف مصروف شاہراہ پر دوڑتی گاڑیاں اپنی جانب متوجہ کر لیتیں تو کبھی سامنے سے جاگنگ واکنگ کرتے لوگوں کو موڑ پر غائب ہونے تک دیکھتی رہتی۔ سوچیں ادھر ادھر بھٹکتی رہتی۔

جب سورج منہ چھپانے کے قریب ہوا تو وہ ایپ میں ٹرین کا وقت دیکھ کر کھڑی ہوگئی۔ مچھروں کا بڑھتا جھنڈ اس سے زیادہ بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ پرس اٹھاتے ہوئے اس کی نگاہ پھر اس پیلے نوٹ پر پڑی۔ کچھ سوچ کر اس نے پرس سے قلم نکالا اور نیچے 'نو' لکھ دیا۔

"اگر میرے لیے ہے تو مجھے جواب دینا چاہیے۔" قلم واپس پرس میں رکھتے ہوئے اس نے سوچا۔

☆☆☆

"ہیلو۔" اس نے 'فرینکی' کا بڑا سا لقمہ لیا تھا اور اب اس اجنبی کو سر پر کھڑے دیکھ وہ جلدی سے حلق میں اتارا نہیں جا رہا تھا کہ وہ اسے جواب دیتی۔ اس نے پرس میں ہاتھ ڈال کے پانی کی بوتل نکالی جو باہر آتے ہی ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس کے جھکنے سے پہلے اس اجنبی نے بوتل اٹھائی، اسے ہاتھ سے صاف کیا، پھر ڈھکن کھول کے اس کی طرف بڑھائی۔ اس نے بوتل منہ سے لگائی اور پانی سے نوالہ نیچے اتارا۔

"تھینک یو۔" یہ شکریہ پانی کے لیے تھا۔

"مجھے آپ کا جواب مل گیا تھا۔" اس نے زرد پرزے کی طرف انگلی اٹھائی لیکن ثمرین کی نظریں اس کے چہرے پر ٹکی تھیں۔ "اس لیے سوچا اب بنچ شیئر کرنا ہی لاسٹ آپشن ہے۔" اس معقول بندے کی نامعقول

بات پر وہ بے اختیار ہی اپنے پرس کے ساتھ بنچ کے کنارے کھسک گئی اور وہ یوں دوسرے کنارے بیٹھا جیسے اس نے اس کے لیے جگہ بنائی ہو۔

"تھینک یو۔" اس نے مسکرا کے ثمرین سے کہا اور پھر بیگ سے ایک چھوٹی سی ڈائری نما چیز اور پینسل نکالی، بیگ پیروں پر رکھا اور ڈائری نما چیز کھول کر اس پر جھک گیا۔

عجیب صورت حال تھی۔ اس جگہ اور اس بنچ سے وہ اسے بھگا نہیں سکتی تھی۔

"میرا جواب۔" دماغ کی بتی جلی اور اسے 'نو' یاد آیا۔ اس نے آہستہ سے ایک چھوٹا لقمہ توڑا اور گردن گھما کے اب تک موجود نوٹ کو دیکھا۔

"ٹھیک ہے نا وہ اپنا کام کرے میں اپنا۔" وہ بے نیاز بن کے تالاب کے پانی میں چمکتے سورج کے عکس کو دیکھنے لگی لیکن بے نیاز بننے اور واقعی بے نیاز ہونے کا فرق خود اسے ہی اس قدر محسوس ہوا کہ اس نے پہلو بدلا۔

وہ بنچ میں یوں اپنی چھوٹی سی ڈائری پر جھکا گم تھا مانو وہاں اکیلا ہو۔ اسے پل بھر کو اس پر رشک آیا۔ وہ کسی کی موجودگی میں اتنے آرام اور سکون سے خود میں مگن اور دوسروں سے لاپروا نہیں ہو سکتی تھی۔ کمرے میں اس کے علاوہ مزید ایک بندہ بھی موجود ہو بظاہر پُراعتماد دکھائی دیتی لیکن اس کی خود آگاہی و خود شعوری 'اوورٹائم' پہ لگ جاتی تھی۔

"گڈ ایوننگ ینگ مین!" بزرگ سے انکل جنہیں وہ روز دیکھ رہی تھی، وہاں سے گزرتے ہوئے وصی سے مخاطب ہوئے۔

"اوہ! ہیلو انکل۔" اس نے چونک کے سر اٹھایا اور انکل کو مسکرا کے جواب دیا۔ وہ رکے نہیں تھے، یونہی تیز تیز چلتے ان کے سامنے سے گزر گئے۔

"تو یہ ریگولر ہے یہاں۔" وہ انکل کو روز دیکھ رہی تھی اور اجنبی کے ساتھ ان کی بے تکلفی نے باور کرا دیا کہ اس بنچ کے لیے اجنبی وہ خود ہے۔ وہ بے ساختہ خود میں سمٹ گئی جیسے ذہن نے قبول کر لیا ہو کہ بنچ

زیادہ اس کی ہے۔ اس کی حرکت وصی کو بھی محسوس ہوئی۔

"پلیز ڈونٹ مائنڈ می۔" اس نے پینسل روک کے اسے دیکھا۔

"کچھ عادتیں یا سپرسٹیشنز ایسے ہی اسٹرونگ ہوتے ہیں، میں یہیں ریلیکس ہو کر 'سڈوکو' حل کر پاتا ہوں اور یہ روٹین کئی ہفتوں سے ہے......" اس نے وہ ڈائری نما چیز بند کر کے اسے دکھائی۔ وہ 'سڈوکو پزل' کی کتاب تھی۔ "لاسٹ کے کچھ دن میں نے یہاں بہت سی جگہوں پہ کوشش کی لیکن ہر جگہ اس بنچ کو مس کیا۔"

اس کی نظر کتاب کے ماتھے پر لکھے 'ڈبلیو خان' پر ٹکی تھی۔

"آپ ریلیکس رہیں، مجھے آپ کے یہاں ہونے سے کوئی پریشانی نہیں ہے۔" اس نے ہلکے سے حوصلہ افزا اور دوستانہ تبسم کے ساتھ بات ختم کی اور دوبارہ کتاب کھول لی۔

"پریشانی تو مجھے ہے اور یہ کیا اتنی انٹرسٹنگ چیز ہے کہ انسان اطراف سے بے خبر اور بے پروا ہو جاتا ہے؟" کتاب کے سرورق پر بنے چوکور خانے اور ان میں درج اعداد سے اسے یاد آ گیا تھا کہ یہ ذہنی مشق کا پزل اس نے اخباروں میں دیکھا تھا۔ وہ گردن سیدھی کر کے تالاب کے اس پار سڑک پر دوڑتی گاڑیوں کو دیکھنے لگی۔

وہ واقعی آس پاس کی دنیا سے بے خبر ہو کے کتاب پر جھکا تھا۔ رک کے کچھ سوچتا، خانے بھرتا، کبھی پینسل الٹی کر کے پیچھے لگے اریزر سے اپنا لکھا مٹاتا، کبھی سر جھٹکتا، کبھی مسکراتا تاہم وہ اپنے پڑوسی کی طرح اپنے قرب سے ایسی بے خبر نہیں ہو پا رہی تھی۔

"اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تو میں کیوں اتنی کانشس ہو رہی ہوں؟" فرینگی کا آخری بچا حصہ پورا منہ میں ڈالتے ہوئے اپنی کیفیت پر وہ قدرے جھنجلا گئی۔ اس نے صفحہ پلٹا تو وہ چونکی۔

"ہو گیا۔؟ اب دوسرا ابھی۔؟ مطلب یہ جائے گا نہیں۔" اس نے خالی کاغذ لپیٹ کر گولا سا بنایا اور اٹھ کے کچھ دوری پر رکھے کوڑے دان میں ڈال آئی۔ اس

دوران اس کی توجہ ادھر بھی تھی جدھر اس کے اٹھنے، جانے اور واپس آنے سے سر مو فرق نہ پڑا تھا۔

"کمال چیز ہے یہ!" اس کے اندر سٹڈ وٹو کے لیے تجسس اور رشک پیدا ہوا۔ پانی پی کر اس نے بوتل پرس میں رکھی اور فون باہر نکالا۔ کوئی پیغام تھا نہ کسی کی کال۔

"یہ شاید آس پاس رہتا ہو۔" اس نے فون بند کر کے دور اطراف کی بلند بالا عمارتوں پر نظر ڈالی۔

"یہاں شاید اپر کلاس مڈل کلاس دونوں طبقے رہتے ہیں۔ ہاں جاگنگ واکنگ کے چونچلے بھی ان ہی کے ہوتے ہیں۔"

پارک میں طبقاتی فرق بڑا واضح دکھائی پڑتا تھا۔ کھلے اور پکے حصے میں موجود بچے، خواتین، بزرگ سب لباس، حلیے اور گفتگو سے متوسط طبقے کے لگتے تھے جب کہ ٹریک پر چلنے اور دوڑنے والوں کے برینڈڈ ٹریک سوٹ، آئی پوڈز، جوتے، کچھ کے ہاتھوں میں پانی کی بوتلیں، مہنگے فٹ نیس بینڈ، سب ان کے متوسط طبقے سے بہتر ہونے کا اعلان کرنے والے تھے۔ جس سمت سے وہ پارک میں داخل ہوئی تھی وہاں قرب وجوار میں پانچ اور سات منزلہ عام سی عمارتیں تھیں۔ جب کہ تالاب کے دوسری طرف اور دائیں بائیں کثیر منزلہ رہائشی ٹاورز دکھائی دے رہے تھے جو زیادہ دور نہیں تھے۔ اچانک اس نے چور نظروں سے وصی کو دیکھا اور اس کا جائزہ لیتے ہوئے اندازہ لگانا چاہا۔

تفصیلی جائزہ لے کر نگاہ ہٹائی تو اس کا تجزیہ کہہ رہا تھا۔

"خود کا خیال رکھنے والا اور معیاری چیزیں استعمال کرنے والا ڈیسنٹ لکنگ انسان ہے۔" اس کا مزاج تھا کہ اس کے پاس وجہ ہو یا نہ ہو، کسی کے متعلق خواہ مخواہ منفی رائے قائم نہیں کرتی تھی۔ اس کی منطق تھی بندے کو کم سے کم اپنی سوچوں میں ایماندار ہونا چاہیے۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہیں آس پاس آفس ہو اور یہ وہیں سے ادھر آیا ہو۔" اس کے ذہن کو نئی دلچسپی ہاتھ لگی تھی۔ اگر وہ اسے مخاطب کرنے یا خواہ مخواہ بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا تو یقیناً وہ اس پر اور اس جگہ پر لعنت بھیجتی اب تک وہاں سے اٹھ کر چلی گئی ہوتی لیکن اس کی بے تعلقی نے اسے دلچسپ بنا دیا تھا۔

اچانک اس کے فون نے شور مچایا۔ دوسری طرف عنبرین تھیں۔

"تم نکل گئیں آفس سے؟" اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"ہاں، کیوں؟"

"ادھر ایک بکنگ تھی۔ اتنی تھک گئی ہوں سوچا تم ہو گی تو ساتھ اوبر سے گھر چلتے ہیں۔ رکھواب، ٹرین کے ہی دھکے کھانے پڑیں گے۔" اس نے فون رکھ بھی دیا۔

ان 'رش آورز' میں اس کے دفتر سے گھر تک اوبر سراسر بے وقوفی تھی، پیسے اور وقت کا زیاں۔ لیکن مفت کی چیز اور ہر حال میں آرام کی خواہش کو عقل مند اور بے وقوفی سے کیا سروکار!

فون بند کر کے اس نے عادتاً کن انکھیوں سے اسے دیکھا مبادا کہیں اس نے سن نہ لیا ہو، کہیں جان نہ گیا ہو کہ اس کی بہن صرف اپنا بھلا اور آرام سوچتی ہے اس کا نہیں۔

"آپ کچھ کہنا چاہتی ہیں؟" اچانک اس نے کتاب بند کر کے اسے دیکھا۔ وہ بری طرح گڑبڑا گئی۔

"نہیں۔" اس نے تیزی سے کہا لیکن اپنی غلطی اور مقابل کی زود حسی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ کتنی بار کن انکھیوں سے اس کی سمت دیکھ چکی تھی۔

"دراصل۔" اپنی بد اخلاق سی حرکت کی شرمندگی مٹانے اس نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

"مجھے تجسس ہو رہا ہے کیا یہ پزل اتنا انٹرسٹنگ ہوتا ہے۔ میں نے بھی اسے حل کرنے کی کوشش نہیں کی نہ کسی اور کو کرتے دیکھا۔ آپ کو ہی پہلی بار دیکھ رہی ہوں وہ بھی اتنے۔ انوالو اور پوری طرح غرق۔" اتنا طویل جملہ بھی خفت مٹانے کی سعی تھا۔

وہ کتاب کو دیکھتے ہوئے مسکرایا پھر اسے دیکھا۔

"یہ زیادہ مشکل نہیں اگر آپ کو اس طرح کی مینٹل ایکٹیویٹی میں دلچسپی ہو تو۔ میں نے کچھ وقت

پہلے ہی شروع کیا ہے، بوریت سے بچنے کے لیے اخبار میں اسے حل کرنے لگا پھر انٹرسٹ بڑھا اور ایک دن یہ بک نظر آئی تو خرید لی۔" وصی نے رخ اس کی طرف کیا۔

"یہ ایزی ہے۔" اس نے ثمرین کی سمت جھک کے کتاب دونوں کے درمیان میں کھولی۔

"اس بڑے اسکوئر (مربع) میں نو چھوٹے اسکوائرز ہیں اور ہر اسکوائرز میں پھر نو خانے۔ ہر قطار، کالم اور چھوٹے اسکوئر میں ایک سے نو تک نمبر ہونا چاہیے۔ شرط یہ ہے نمبرز دہرائے نہ جائیں یعنی ایک قطار، کالم یا اسکوائر میں ایک سے نو تمام نمبر ہوں۔" وہ الٹی پنسل کو صفحے پر حرکت دیتے ہوئے اسے سمجھا رہا تھا۔ یہ ایسا ہی تھا کہ کرکٹ فٹ بال کے شوقین سے کوئی اس کھیل کے متعلق ایک سوال پوچھ لیں تو وہ پورے جوش میں شروع ہو جاتے ہیں۔

"انٹرسٹنگ!" اس نے سر ہلایا۔

"ٹرائی کیجیے گا، اکثر نیوز پیپرز میں ہوتا ہے۔" اس نے سیدھا ہو کر سابقہ حالت میں چہرہ اور کتاب سامنے کیے۔

"تھینک یو۔" اس نے پرس شانے پر ڈالتے ہوئے اٹھنے کی تیاری کی۔ "ایکسپلین کرنے کے لیے۔" کھڑے ہو کر اس نے سینے پر پوری چوڑائی میں پھیلے دوپٹے کا نچلا سرا شانے پر ڈالا۔

"مائی پلیژر۔" وہ ہلکا سا خم ہوا۔

اسے کوئی الوداعی کلمہ کہنا چاہیے تھا لیکن جس طرح وہ پھر کتاب پر جھک گیا تھا، اس حرکت نے اسے روک دیا۔ وہ ایک نظر اس کے جھکے سر کو دیکھتی آگے بڑھ گئی۔ اس کے دائرہ نگاہ سے غائب ہونے کے بعد بھی وصی نے سر نہیں اٹھایا تھا۔

وہ سونے لیٹی تو الارم لگانے کے بعد فون رکھنے کی بجائے گوگل کے سرچ بار میں 'سُڈوکُو' لکھا۔

"ایں! تم سوئیں نہیں اب تک؟" نا جانے کتنا وقت ہو گیا تھا جب عنبرین نے آ کر ٹوکا تو وہ چونکی۔

"سو گئی تھی، آفس کا میسج تھا۔" اس نے فون بند کر کے تکیے کے پاس رکھا اور کروٹ بدل لی۔

"میرے بس کی بات نہیں۔" اتنی دیر دماغ لگانے کے بعد اس نے ہار مان لی۔

☆☆☆

لفٹ رکی تو سامنے بغل والے میاں بیوی بچوں کے ساتھ کھڑے تھے۔ ان کا حلیہ بتا رہا تھا وہ نیچے ٹہلنے اور بچوں کو کچھ دیر کھلی فضا میں کھیلنے کودنے کی خاطر جا رہے ہیں۔

"ہیلو۔" اس نے مسکرا کے باہر نکلتے ہوئے شائستگی سے سب کو مخاطب کیا۔

"گڈ ایوننگ انکل" چھوٹی بچی نے سب سے اونچی اور پرجوش آواز میں جواب دیا تھا۔ اس کی خوش دلی کا جواب اسی خوش سے دیتے وہ سب خالی لفٹ میں داخل ہو گئے۔

ایک قطار میں بنے چار فلیٹوں میں وصی کا فلیٹ سب سے آخری تھا۔ بیگ سے چابی نکال کے اس نے دروازہ کھولا اور چابی دوبارہ بیگ میں رکھتے ہوئے اندر آ گیا۔ یہاں وہ پچھلے ڈیڑھ سال سے رہ رہا تھا۔ شہر کے دور دراز علاقے میں جب اس نے یہ فلیٹ بک کیا تب علاقہ سنسان اور ویران جنگل تھا۔ جہاں شہر اور قریبی اسٹیشن یا بس اسٹاپ تک آنے جانے کی کوئی سہولت نہ تھی لیکن یہی وجہ تھی یا بہت ساری سہولتوں کے ساتھ اس 'پریمیم پراپرٹی' کی قیمتیں نہایت کم تھیں۔ اب تکمیل کے چار سال بعد اس ویران اور سنسان جنگل کا اتا پتا نہ تھا۔ آس پاس مزید عمارتوں نے آبادی اور رونق بڑھا دی تھی اور نقل و حمل کی سہولتیں بھی ساری دستیاب تھیں۔

اس سے قبل تین سال اس نے کرایے کے مکانوں میں گزارے تھے اور اس سے قبل وہ اپنے والدین اور بھائیوں کے ساتھ والدین کے گھر میں رہتا تھا۔ عام سا گھرانہ تھا جہاں اس کی امی ریحانہ اور اس کے ابا شاکر علی میں ہمیشہ پیسوں کو لے کر کھٹ پٹ رہتی۔ ریحانہ کی کوشش ہوتی وہ شوہر سے زیادہ سے زیادہ پیسہ وصول کریں اور شاکر علی کن کے خرچ دیا

کرتے۔ دونوں خود پر اور اپنے شوق پر پیسہ اڑانے سے ذرا نہیں ہچکچاتے تھے۔ بڑے بھائی کی نوکری لگتے ہی ان کی تنخواہ پر بھی ان دونوں کی نظر رہنے لگی۔

شاکر علی نے پہلے بیٹے کے وقت ہی اصول مرتب کر دیا کہ سب بچے تنخواہ باپ کو دیا کریں گے جب کہ ریحانہ ماں والا بلیک میل استعمال کرتی تھیں۔ بات محض پیسوں کی کھینچا تانی تک محدود نہیں تھی۔ ماں باپ کو دیکھ کر وہ سب بھی اپنا بھلا اور فائدہ دیکھنے کے عادی ہو گئے تھے۔ اس کے لیے جھوٹ سچ بولتے، لڑتے جھگڑتے اور آخر میں ساتھ بیٹھ کر ہنس بول بھی لیتے۔

وہ منجھلا تھا اس میں بھی وہی سب عادتیں تھیں جو باقیوں میں لیکن لاکھ کوشش کے بعد وہ آخر میں معمول کی محفل کا حصہ نہیں بن پاتا تھا۔ اسے عجیب لگتا ذرا دیر پہلے لڑنے مرنے پر آمادہ اب یوں گھل مل گئے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ آہستہ آہستہ وہ الگ تھلگ ہوتا گیا اور سب کو دیکھ کر اس کے ذہن نے مان لیا کہ دنیا میں ہر کوئی مطلب پرست ہے اور "رشتے" اس خود غرضی کو چھپانے اور کمزور کو استعمال کرنے کا سب سے بڑا پردہ اور بہانہ۔ اس کا یقین بڑا پکا ہو گیا تھا کہ دنیا میں سب کچھ پیسہ ہے اور ضرورت اور مطلب ساری محبتوں پر حاوی۔

بڑے بھائی کی شادی کے بعد بھابھی کی آمد نے اس رن میں ایک اور فریق پیدا کر دیا۔ اس کا گھر روایتی سسرال بن گیا تھا۔ وہ سب ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل کر سکون سے رہتے تھے نہ ایک دوسرے کو چھوڑ کر جاتے تھے۔ روز ایک الگ کہانی ہوتی، ایک الگ جنگ۔ اسی تو تو میں میں کے دوران جلد ہی بھتیجی کی آمد نے حالات چند دن خوشگوار کیے پھر یہ نئی مہمان نئے مسائل کی وجہ بن گئی۔ لڑنے جھگڑنے اور پیسوں کی کھینچا تانی کے لیے ایک اور وجہ کا اضافہ ہو گیا تھا۔

وہ سب کے دہرے معیار دوغلے پن پر پہلے سب سے جذباتی طور پر دور ہوا، پھر منہ پھٹ اور جب نوکری ملی تو باغی۔ اس نے صاف کہہ دیا وہ اپنی کمائی کا ایک پیسہ کسی کو نہیں دے گا۔ ماں باپ سے خوب بحث اور لڑائی ہوئی اور آخر میں اس نے گھر چھوڑ دیا تاہم اسے کسی نے نہیں چھوڑا۔ فون پر فون آتے دہائیاں دی جاتیں، ابا دھمکی دیتے اور کبھی کبھی خاندان کے کوئی انکل، دادا یا نانا اسے راہ راست پر لانے کی کوشش میں لیکچر دینے فون کرتے۔ اسے اپنے گھر بلاتے اور جب وہ وہاں پہنچتا تو ابا پہلے سے موجود ہوتے۔ ان کی موجودگی میں اسے سمجھانے کا مشن دیر تک چلتا رہتا اور اس پر اثر ہر بات کا الٹا تھا۔

دو بار ریحانہ اس کے کرایے کے مکان میں آئیں جہاں اس کے ساتھ دو لڑکے اور بھی تھے۔ ان کے پاس وہی سب کی شکایتیں اور اپنی تکلیفوں کی داستان تھی۔ انہیں اپنی سہیلی کی بیٹی کی شادی میں تحفہ دینا تھا اور بھیا ابا کوئی انہیں پیسے نہیں دے رہے تھے۔ اس نے ان کا مدعا سن کے مشکل آسان کر دی اور انہیں وہاں آنے سے منع کیا تو اگلی دفعہ وہ اس کے دفتر پہنچ گئیں۔ اس بار ان کے پیروں میں شدید درد تھا۔ اس درد کی وجہ پہلے تو بھابھی تھیں جو خوشی پر رتی برابر توجہ نہیں دے رہی تھیں۔ اس کے پیچھے بھاگ بھاگ کر اور اسے سنبھالتے ہوئے انہیں یہ تکلیف لاحق ہوئی تھی۔ مہینے کا آخر تھا تو ابا نے انہیں اگلے مہینے تنخواہ ملنے تک ڈاکٹر کے پاس جانے سے روک رکھا تھا جب کہ انہیں کسی نے ایک بڑے اچھے حکیم کا بتایا تھا اور انہیں اسی کے پاس جانا تھا۔ اس نے انہیں پیسے دے دیے حالاں کہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ کبھی خالی ہاتھ نہیں ہوتیں۔ ان کی کمیٹیاں اور اخراجات میں ڈنڈی مار کے کی گئی اپنی بچت میں یہ سب آرام سے ہو سکتا تھا۔

دفتر میں انہیں آبدیدہ دیکھنے والوں نے اس سے سوال کیے تو اس نے جانا سب سے دور جانے کی کوشش اور خواہش اپنی جگہ اور انہیں چھوڑ نہ سکنے کی مجبوری اور بے بسی اپنی جگہ ہے۔ وہ انہیں اس تک پہنچنے سے روک نہیں سکتا تھا۔ وہ جو سوچ رہا تھا کہ سب سے لاتعلق ہو جائے گا، اسے مجبوراً گھر آنا جانا شروع کرنا پڑا تاکہ وہ اس کے گھر اور دفتر نہ پہنچیں۔

اس نے کبھی اپنے خیالات یا گھر والوں سے اپنی دوری چھپانے جھوٹ نہیں کہے تھے لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ سب کو پکڑ پکڑ اس کی تشہیر کرنا چاہتا تھا۔

آہستہ آہستہ وہ حکمت سیکھ گیا۔ جب گھر جاتا ماں کو کچھ پیسے دے دیتا یا ان کی کوئی حکیمی دوا ساتھ لے جاتا، ابا کے لیے ان کے پسندیدہ مسالے والے کاجو اور خوشی کے لیے کوئی کھلونا، چاکلیٹ آئس کریم۔ گھر والوں کو اس سے جو چاہیے تھا وہ سب دے کر وہ انہیں خود سے دور رکھے تھا لیکن ان پر خرچ وہ ہمیشہ حد میں رہ کر کرتا تھا۔ اس سے زیادہ وہ مانگتے بھی تو وہ نہیں دیتا تھا۔ اس کی اولین ترجیح اس کی اپنی ذات تھی۔

اب وہ کسی بات پر ان سے الجھتا تھا نہ بحث کرتا تھا۔ جو کہتے سن لیتا مگر کرتا وہی جو اس کی مرضی ہوتی۔ وہ جان گیا تھا وہ سب ان حالات میں خوش ہیں، اسے بدلنا نہیں چاہتے نہ خود میں تبدیلی کے لیے آمادہ تھے۔ انہیں اسی طرح جینے میں مزا آتا تھا۔ گزرتے وقت نے اسے لوگوں سے مزید متنفر کر دیا تھا۔ وہ رشتے، گھر اور خاندان کے اس جنجال میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ اس کی پسند اور مرضی کے بنا اسے جو رشتے ملے وہ کافی تھے اسے خود سے مزید نئے تعلق بنانے کا شوق نہیں تھا۔ اسے اپنا سکون، اپنی مرضی اور اپنا معمول عزیز تھا۔

دفتر میں بھی یہ ہی صورت حال تھی مقابلہ بازی اور خود کی جگہ بنانے اور پھر اسے سنبھالنے کی جدوجہد نے یہاں بھی دہرے معیار اور دوغلا پن ہی پھیلا رکھا تھا۔ یہاں اس نے مطلب پرستی کے نئے معنی دیکھے اور سیکھے تھے۔ وہ آدم بے زار نہیں تھا لیکن اس کے لیے لوگوں کو برداشت کرنے کی حد تھی۔ یہ حد ساتھ کے دورانیے کے لیے بھی تھی اور ان سے فاصلہ رکھنے کی بھی۔ اس کے دوست تھے، سب سے اچھی راہ و رسم تھی لیکن اس کا قریبی اور دلی تعلق کسی سے نہ تھا۔ وہ جب اور جتنا چاہتا اتنا ہی تعلق سب سے رکھتا تھا۔

خوشی جب سے سمجھنے اور بولنے لگی تھی، دور رہنے والے چاچو اس کے 'فیورٹ' ہو گئے تھے۔ یہ دوری کی کشش تھی یا واقعی اسے چھوٹے چاچو کے بجائے یہ چاچو پسند تھے۔ شفیع امی کا بے حد لاڈلا تھا اور مزاج میں بھی ان ہی پر گیا تھا۔ اس کی بھی بھابھی سے بنتی نہ تھی اور اس محاذ پر معصوم خوشی بھی مخالف فوج میں شامل تھی۔ ایسے میں خوشی کو چاچو کی آمد، چاکلیٹ، تحائف اور ان کا نرمی سے بات کرنا اپنا گرویدہ بنا گیا تھا۔ اس نے اسے گھر کے دیگر مکینوں کی طرح لڑتے جھگڑتے اور چیختے چلاتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اسے فون کرتی، بلاتی، فرمائشیں کرتی۔ اسے ناسمجھی اور معصومیت کا 'مارجن' دیتے ہوئے وہ اس کی باتیں، فرمائشیں مان لیتا تھا مگر اس کے اندر خوشی سے کسی قسم کا لگاؤ یا محبت کا جذبہ نہیں تھا۔ اسے یقین تھا بڑی ہوتے ہی وہ بھی 'لوگوں' جیسی ہو جائے گی۔

نہانے کے بعد وہ کھانے کے لیے باورچی خانے میں آیا۔ فریج کھولا، وہاں پلاؤ اور رائتہ رکھا تھا۔ اس نے وہی نکالا اور اوون میں گرم کر کے رکابی لیے ہال میں آ گیا۔ ناشتا وہ خود بناتا تھا اور دوپہر کا کھانا دفتر کے کینٹین میں ہوتا۔ اس کے جانے کے بعد کام والی ماسی آتی تھی۔ اس کا کام گھر کی صفائی اور رات کا کھانا بنانا تھا۔ پہلے پہل ملازماؤں نے اسے بہت تنگ کیا لیکن یہاں آنے کے بعد سے یہ بوڑھی بنگالی خاتون سلیقہ مند اور ایماندار ملی تھی۔

"کل بھی وہ بنچ خالی نہ ہوا تو؟" رات بستر پر لیٹے ہوئے اسے خیال آیا۔

"تو کیا فرق پڑتا ہے۔" آنکھیں بند کر کے اس نے کروٹ بدل لی۔

☆☆☆

اگلی شام وہ شش و پنج میں تھی، پارک جائے یا نہیں۔

"شریف اور شائستہ انسان ہے، مجھے ڈسٹرب تو نہیں کیا تھا نہ فضول میں فری ہونے کی کوشش کی تھی۔" دل و دماغ کو وہاں کی کھلی فضا میں آزادی سے سانس لینا اور اس کا خود سے ساتھ وقت گزارنا اتنا بھایا تھا کہ وہ جانے کے لیے دلائل پیش کرنے لگے۔ وہ اسٹیشن آنے تک بھی فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ

یہاں اترے یا سیدھا اپنے اسٹیشن لیکن ٹرین رکنے سے ذرا پہلے وہ دروازے میں آن کھڑی ہوئی۔

دور سے ہی بنچ خالی نظر آئی۔

"میں نے کل دیکھ دیکھ کر اتنا تنگ کیا ہے کہ ہوسکتا ہے وہ آج نہ آئے؟" ایمانداری سے اپنی غلطی سوچتے ہوئے وہ بیٹھ گئی۔ 'اسٹکی نوٹ' اب بھی وہیں موجود تھی۔ اس کے کھینچ کر نکال لی۔

"ایسی بھی کیا شدید عادت۔" اس چھوٹے سے کاغذ کو موڑتے ہوئے اس نے سوچا۔ آج اسے بھوک نہیں لگی تھی اس لیے کھانے کو کچھ تھا نہیں۔ اسے چائے کافی کا شوق نہیں تھا نہ شام کی عادت تھی۔ مل جاتی تو پی لیتی نہ ملے تو بھی ٹھیک۔

وہ یونہی تالاب اور اس کے پار سڑک پر دوڑتی گاڑیوں کو دیکھ رہی تھی کہ کل والے انکل کے قدموں کی چاپ نے اسے متوجہ کیا۔

"گڈ ایوننگ۔" انہوں نے مسکرا کے اسے مخاطب کیا۔ اس نے ذرا سا جھک کے جواب میں مسکراہٹ پر اکتفا کیا۔ ویسے بھی وہ رکتے نہیں تھے۔

"جانے یہ ہم دونوں کے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے۔ کچھ تو سوچا ضرور ہوگا تب ہی کل ساتھ دیکھنے کے بعد آج مجھ اکیلی کو وش کیا، اس سے پہلے نہیں کیا تھا۔" ذہن کو نکتہ مل گیا۔

"ویسے ایسی جگہوں پر کپلز یوں دو کناروں پر نہیں بیٹھتے۔" یہ آنکھوں دیکھا مشاہدہ تھا۔ اس شہر کی بھیڑ اور گہما گہمی میں وقت کی اتنی کمی تھی کہ اب تو عوامی مقام پر بھی جوڑے اردگرد سے بے پروا ہو کر محبت کے مظاہرے کو برا نہیں سمجھتے تھے اور ایسی تنہائی والی جگہ تنہا بندے کا سوچ سمجھ کر جانا ضروری تھا۔ اسے یہ جگہ اس لیے بھی اچھی لگی تھی کہ یہاں ماحول 'فیملی فرینڈلی' تھا۔ اس نے جوتا اتارا اور پیر اوپر رکھ کے موڑ لیے۔ جانے کتنی دیر ہوئی تھی کہ وہ انکل جس سمت گئے تھے اسی طرف سے واپس آتے دکھائی دیے۔ اس بار وہ دوڑ نہیں رہے تھے بلکہ سست سے چلتے ہوئے آرہے تھے۔ اس نے پیر نیچے کر کے جوتے پہن لیے۔ وہ ان کے قریب آنے پر ان سے کچھ کہنے کا سوچ رہی تھی۔ اچانک وہ چلتے چلتے رک گئے۔ ان کا چہرہ عجیب سا ہو رہا تھا۔ وہ کچھ سمجھ پاتی اس سے پہلے ہی وہ لہرا کے زمین پر گر پڑے۔

"اوہ۔ او۔!" بے اختیار لایعنی سے آوازیں منہ سے نکلیں اور وہ کھڑی ہو گئی۔ پل بھر کو اسے سمجھ میں نہ آیا کیا کرے پھر جیسے ہوش میں آ کر ان کی طرف دوڑنے جا رہی تھی کہ پیچھے سے وہی بھاگتے ہوئے ان کے پاس پہنچ گیا۔

"انکل۔ انکل!" وہ ان کے پیر سیدھے کرتے ہوئے ان کا گال تھپتھپا رہا تھا۔ اس نے ناک کے پاس انگلی رکھ کر سانسیں دیکھیں پھر کلائی پکڑی۔ اس کا دل اتنا تیز کبھی نہ دھڑکا جس رفتار سے اس وقت بھاگ رہا تھا۔ گھبراہٹ کے مارے وہ مسلسل دائیں بائیں ہو رہی تھی۔

"کیا یہ ڈاکٹر ہے؟" اب وہ ان کی جیب ٹٹول کر فون نکال رہا تھا۔ پھر وہ پیچھے مڑا۔

"آپ ایمبولینس کال کریں۔"

وہ پلٹ کر بنچ کے پاس آئی اور پرس سے فون نکالا۔ تب تک وہ انکل کے فون کو ان کے فنگر اسکین سے کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ دونوں ہاتھ سے انہیں ایک کروٹ کر چکا تھا۔ اس سے فون بھی ٹھیک سے پکڑا نہیں جا رہا تھا۔ انگلیاں کانپ رہی تھیں۔

"مجھے نمبر نہیں پتا۔" اس نے تھوڑا آگے اس کے پاس جا کر کہا۔ وہ بے سدھ پڑے انکل کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔

"گوگل سے اپولو ہاسپٹل کا نمبر لیں۔"

قریب کے اس مشہور اسپتال کی اونچی اور بڑی سی عمارت کے سر پر لکھا نام وہ روز ٹرین سے دیکھتی تھی۔ اس نے پیچھے ہو کے وہی کیا۔ ادھر وہ بھی انکل کے فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ اس نے بات ختم کی اور ادھر ادھر نظر دوڑائی پھر اٹھ کے دور پڑی اینٹ لایا اور انکل کے پیر اینٹ پر رکھ دیے۔ مڑ کے

اسے دیکھا تو وہ اب بھی فون پر بات کر رہی تھی۔ وہ کھڑا ہو گیا۔

''پہنچ رہے ہیں، پانچ منٹ کہا ہے۔'' وہ فون بند کر کے پھر تھوڑا قریب آ گئی۔

''کیا یہ......'' وہ سوال مکمل نہ کر سکی۔

''ان کی سانسیں چل رہی ہیں۔'' وصی نے کہا۔

''آپ یہاں رکیں میں گیٹ پر جاتا ہوں تاکہ ایمبولنس والوں کو یہاں لاسکوں۔''

''نہیں......'' اس نے تیزی سے کہا۔ دل ابھی تک بے قابو تھا۔

''آپ رکیں، میں جاتی ہوں۔'' اسے ایک بے ہوش انسان کے پاس رکنے سے زیادہ مناسب باہر انتظار کرنا لگا۔ اس نے اسے صورت حال سے نمٹتے دیکھا تھا۔ اس نے جو کیا وہ یہ سب نہیں کر پاتی۔ وہ تو اب تک خود پر قابو نہیں پا سکی تھی۔

''اوکے۔'' وہ مان گیا اور پھر انکل کے پاس نیچے بیٹھ گیا۔

وہ فون ہاتھ میں لیے پرس وہیں چھوڑ کے باہر کی طرف بھاگی۔ پانچ منٹ میں ہی ایمبولنس آ گئی۔ وہ اسٹریچر کے ساتھ عملے کو لیے اس جگہ پہنچی تو وصی فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ انہوں نے اپنی کارروائی مکمل کی، وصی سے چند سوال پوچھے اور انکل کو اسٹریچر پر ڈال کر لے گئے۔ وصی نے عملے کے ایک فرد سے فون پر انکل کی بیٹی کی بات کروائی تھی۔ ایمبولنس آنے کے بعد وہاں کافی بھیڑ اکٹھا ہو گئی تھی۔ کیا ہوا، کیسے ہوا، کون ہے جیسے سوال پوچھنے والے بھی کم نہ تھے لیکن اسٹریچر کے پیچھے پیچھے وہ ہجوم بھی چلا گیا تھا۔

''وہ ٹھیک ہیں یا نہیں، ہمیں کیسے پتا چلے گا؟'' بنچ پر واپس بیٹھتے ہی اسے خیال آیا۔

''ہمیں نہیں پتا چلے گا۔'' وہ بھی دوسری طرف بیٹھ چکا تھا۔

''اُفف یاد ہی نہیں رہا، ان کا یا فیملی ممبر کا فون نمبر ہی لے لیتے۔'' اس نے افسوس سے کہا۔

وہ بیگ کھول کر اپنی کتاب نکال رہا تھا۔ ثمرین نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ان کے لیے اتنا سب کرنے کے بعد وہ ایک دم بے نیاز تھا۔

''انکل آپ سے بات کرتے تھے، آپ تو جانتے ہوں گے انہیں؟''

''وہ مجھ سے بات نہیں کرتے تھے، جاگنگ کرتے ہوئے ہائے ہیلو ہو جاتی تھی، مجھے ان کا نام بھی نہیں پتا ہے۔'' اس نے کتاب کھول کر مطلوبہ صفحہ نکالنے کے بعد اس کی غلط فہمی دور کی۔

''تو آپ کو پہلے کہنا چاہیے تھا، میں سمجھتی رہی آپ جانتے ہیں انہیں۔'' اسے ان کی خبر نہ مل پانے کا افسوس تھا۔

وصی کو ایسے خوامخواہ ہمدردیاں اور فکر جتانے والے پسند نہیں تھے لیکن اس میں کچھ بات تھی کہ وہ سر جھٹک کے ''واٹ ایور!'' کہتا اس کی طرف سے منہ نہیں موڑ سکا۔

''وہ ٹھیک ہی ہوں گے اس ایج میں اسٹروک ہوتے رہتے ہیں اور لوگ اچھے بھی ہو جاتے ہیں۔'' اس نے عادت کے خلاف تسلی دی۔

''اوہ! آپ ڈاکٹر ہیں۔'' وہ خوش اور کچھ مطمئن ہو گئی۔

''نہیں۔'' وہ ہنس دیا۔

''میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔ اندازے سے بات کر رہا ہوں کہ اسٹروک ہوا ہوگا۔''

''اچھا۔'' خوشی اور اطمینان ہوا ہوا۔ اچانک نئے خیال نے اسے پریشان کیا۔

''ان کے فیملی ممبر۔ کیا وہ ایمبولنس پہنچنے تک آ گئے ہوں گے ورنہ تو ہاسپٹل والے بنا اٹینڈنٹ کے پیشنٹ کو دیکھیں گے ہی نہیں۔'' اس کے چہرے پر خالص تشویش تھی۔

''یہ بہت بڑی ڈرامہ باز ہے یار۔'' اندر سے طنزیہ آواز ابھری۔ وہ بھی لوگوں پر اور ان کے ظاہر پر اعتبار کرنے میں جلد بازی نہیں کرتا تھا اور اس معاملے میں اس کی سبک خرامی تاعمر تک سفر میں رہنے والی تھی۔

"انکل کی بیٹی نے فرسٹ ایڈ ورکر کو ان کے ڈاکٹر کا نام بتا دیا تھا، وہ اس ہاسپٹل کے ریگولر پیشنٹ تھے۔"

"ہیں۔" اس نے جلدی سے تصحیح کی۔

"ہیں ہیں۔"

اس کے چہرے پر اطمینان پھیلا اور وصی کتاب کی سمت متوجہ ہوا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ پھر گویا ہوئی۔

"اس عمر کے بزرگوں کے گھر والے تو ہمیشہ ٹینشن میں رہتے ہوں گے جب تک وہ واپس نہ آجائیں ویسے انہیں۔" کہتے ہوئے اس نے گردن موڑی اور اسے کتاب پر پنسل چلاتے دیکھ رک گئی۔ اس کے رکتے ہی وصی نے اسے دیکھا۔

"سوری۔" اس نے جھٹ کہا۔ دونوں کو غلطی کا احساس ہوا۔ ثمرین نے جانا کہ یہ واقعہ اس کے لیے عام سی بات تھا، وہ اسے بھول بھی چکا ہے اور وصی کو ادراک ہوا کہ اس نے کسی کو غش کھاکے گرتے اور اتنی دیر بے ہوش پہلی بار دیکھا ہے۔

"اٹس او کے۔" اس نے کتاب بند کر دی۔

آج سب کچھ ہی معمول سے ہٹ کے ہو رہا تھا۔

"ہم جو کر سکتے تھے ہم نے کیا۔ اب آگے ڈاکٹرز کے ہاتھ میں ہیں انکل، اچھی بات یہ ہے کہ انہیں فوراً امداد اور میڈیکل اٹینشن مل گئی ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ بہت دیر بعد کوئی انہیں ٹریک پر بے ہوش دیکھتا۔"

"اچھا ہوا آپ آگئے ورنہ مجھے نہیں پتا میں کیا کر پاتی، زیادہ سے زیادہ ادھر جا کے کچھ اور لوگوں کو اکٹھا کر لیتی۔" اس نے ہاتھ سے باغیچے کی سمت اشارہ کیا۔

"تنہا گرے رہتا سے وہ بھی ٹھیک ہوتا، کسی طرح مدد مل جاتی۔"

"ہوں۔" اس نے سر ہلایا اور پرس سے پانی کی بوتل نکالی اور وصی نے کتاب بیگ میں رکھی۔

"سوری....." بوتل کھول کر منہ تک لے جاتے ہوئے وہ رک گئی۔ "میری باتیں۔ آپ یہاں یکسوئی سے پزل حل کرنے آتے ہیں اور میں آپ کو ڈسٹرب کر رہی ہوں، آپ کریں میں جاتی ہوں۔" وہ پانی پیے بنا بوتل کا ڈھکن لگانے لگی۔

"پہلے آپ پانی پی لیں۔" اس نے مسکرا کے بوتل کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کم ہی ایسی دلچسپ صورت حال سے دوچار ہوا تھا۔ ثمرین نے دو گھونٹ لے کر بوتل پرس میں رکھ دی۔

"آپ نے شاید پہلی بار ایسی سچویشن فیس کی ہے اس لیے آپ تھوڑی ٹینس اور نروس ہیں۔"

"شاید۔"

"اور میں سمجھتا ہوں میرے پزل سے زیادہ اہم آپ کا ریلیکس ہونا ہے۔"

اس نے کچھ نہیں کہا۔ وہ اجنبی اس کی کیفیت کو سمجھ رہا تھا، یہ بڑا کم یاب تجربہ تھا ورنہ اس کے لیے کس کے پاس فرصت تھی۔

"اس لیے آپ کریں باتیں۔" وہ بنچ کی پشت پر بازو پھیلا کر سامع بنا۔ وہ دوسری سمت دیکھتے ہوئے دھیرے سے ہنس دی۔ وصی بھی مسکرا دیا۔

"میری دعا ہے وہ انکل ٹھیک ہوں اور ایسی سچویشن ہماری فیملیز کے ساتھ نہ ہو، خدانخواستہ ہو بھی تو ہماری طرح کوئی مدد کو موجود ہو۔" اس نے سارے خدشات مثبت ممکنات کے ساتھ گنوا دیے۔

"ایسا ہی ہوگا۔" وہ فوراً کچھ کہہ نہیں پایا تھا بلکہ وہ چپ ہی رہتا اگر اس کی خاموشی پر ثمرین نے پر امید نگاہیں اس پر نہ ٹکائی ہوتیں۔

وہ عمر رسیدہ لوگ، اسٹروک اور عوامی جگہوں پر مدد کی کمی جیسے موضوعات پر کچھ دیر باتیں کرتے رہے پھر پہلے ثمرین ہی وہاں سے روانہ ہوئی۔

اس رات وہ اپنے رویے پر متحیر خود کو ڈانٹ رہا تھا۔

"مجھے کیوں اسے ریلیکس کرنے کی فکر لاحق ہوئی تھی؟ اتنے ڈرامے کرنے والے دراصل اٹینشن چاہتے ہیں۔ لیکن وہ ڈرامہ تو نہیں لگ رہا تھا۔"

ناچاہتے ہوئے بھی وہ اس لڑکی کو سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

اگلے چند دن وہ دیر سے آیا اور اس کے آنے کے کچھ وقت بعد وہ ثمرین کا وقت دیکھ کر اٹھ جاتی۔ وہ کبھی مسکراہٹوں کے تبادلے پر اکتفا کرتے تو کبھی چند جملے بھی بول دیے جاتے۔ انکل اس دن کے بعد سے دکھائی نہیں دیے تھے۔ ثمرین کو اب بھی ان کی فکر ستاتی رہتی تھی۔

اس دن وہ پہنچی تو وصی پہلی دفعہ اس سے پہلے وہاں موجود تھا۔ اس کے پاس ایک بچی اور ایک عورت کھڑی تھی۔ وہ بنچ کے پاس پہنچ کر پرس درمیان میں رکھ کر بیٹھی اور وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔

"آنٹی! آپ بھی فل کر دیں۔" اس بچی نے ایک پرچا اس کی طرف بڑھایا۔

وصی کے ہاتھ میں بھی ویسا ہی کاغذ تھا۔ ساتھ کھڑی عورت جو بچی کی ماں تھی، اسے سمجھانے لگی۔ وہ اسکول سے ملا 'اسائمنٹ' تھا جس میں گھر کے قریبی پارک میں لوگوں سے مل کر یہ پتا کرنا تھا کہ وہ پارک کیوں آتے ہیں، انہیں یہاں کیا اچھا لگتا ہے، کیا اچھا نہیں لگتا، یہاں کیسا محسوس کرتے ہیں وغیرہ۔ پرچے میں سوالات موجود تھے جن کے اسے جواب لکھنے تھے۔ اس نے پرس سے قلم نکالا اور لکھنے لگی۔ تب تک وصی نے مکمل کر لیا تھا۔

"تھینک یو انکل۔" بچی نے بلتے ہوئے بڑے ترنم میں کہا۔

بچی کی ماں اس کے ہاتھ سے لے کر پڑھنے لگی۔ اس نے بھی جلدی جلدی مختصراً ساری خالی جگہیں پر کر کے بچی کو پرچا تھما دیا۔ اسے بھی ایک مترنم اور لہراتا شکریہ ملا۔ ماں نے وہ پرچا بھی اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"یو ویلکم۔" اس نے خوش دلی سے کہا۔

"آپ دونوں نے پارک کی فیورٹ چیز میں 'بنچ' لکھا ہے جب کہ میں سوچ رہی تھی آپ نے ایک دوسرے کے نام لکھے ہوں گے۔" اس نے مسکرا کے یوں کہا جیسے اسے افسوس ہوا ہو۔ جینز اور ٹاپ میں ملبوس وہ ماں ثمرین کی ہم عمر ہی لگ رہی تھی۔

"نہیں نہیں۔ ہم بالکل اجنبی ہیں، ہمیں ایک دوسرے کے نام بھی نہیں پتا۔" وصی نے انگریزی میں کہا۔

"اوہ......" اس نے حیرت سے دونوں کو دیکھا۔ "ریئلی ویری سوری۔" وہ کچھ نادم دکھائی دی۔

"اٹس او کے۔" ثمرین نے نرمی سے کہا۔

"تو یہ کام میں کر دیتی ہوں، مجھے آپ دونوں کو متعارف کروانے کا شرف حاصل کرنے دیں۔" اس نے انگریزی میں کہا۔ ثمرین کی نرمی سے اسے گویا حوصلہ ملا تھا۔

"آپ ہیں۔ مسٹر وصی خان اور آپ مس ثمرین انیس۔" اس نے باری باری دونوں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے دونوں کے نام پڑھے۔

ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"بہت شکریہ آپ دونوں کا۔" وہ بیٹی کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھ گئی۔

"آپ نے پارک کی ناپسندیدہ چیز کیا لکھی؟" کچھ دیر بعد، ثمرین نے فضا میں بکھری عجیب سی بے آرامی دور کرنے پوچھا۔

"لوگ۔" جواب ایسا تھا کہ وہ ایک دم چپ ہو گئی۔

"مطلب میں بھی۔" ذرا توقف کے بعد اس نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں۔" وہ گڑبڑایا اور ثمرین مسکرا دی۔

"اٹس او کے، آپ آنسٹ ہیں۔"

"میں آدم بے زار نہیں ہوں البتہ کچھ دیر اور کچھ دوری پر ہی لوگ برداشت ہوتے ہیں اور......" اس نے فوراً ہاتھ اٹھایا کہ رکو رائے قائم کرنے سے قبل مکمل سن لو۔ "ایسا نہیں ہے کہ میں آپ کو

برداشت کرتا ہوں، آپ میرے لیے کسی پریشانی کا باعث نہیں۔"

وہ مسکرائی اور وصی کو اس کی مسکراہٹ اس صورت حال کا مزا لیتی محسوس ہوئی۔

"تھینک یو۔" اس نے اس انداز میں شکریہ ادا کیا مانو اسے تنگ کر رہی ہو۔

"اب آپ یہ مثال ہی دیکھیں۔ یہ دو لوگ ہماری سچویشن کتنی آکورڈ کر گئے، اسی وجہ سے مجھے لوگ نہیں پسند۔" اس نے جس نروٹھے انداز میں کہا، ثمرین اپنی ہنسی روک نہیں سکی۔ وہ بھی مسکرا دیا۔

"وہ ہمیں ایک دوسرے کا نام بتا گئے، 'لوگ' اچھے کام بھی کرتے ہیں۔" ثمرین اب بھی مسکرا رہی تھی۔

"اگر ہم دونوں کو انٹرسٹ ہوتا تو ہم خود ہی نام پوچھ سکتے تھے، یہ ہماری پرسنل اسپیس میں گھس کر ہماری اجازت کے بنا زبردستی کرنا نہیں ہوا؟"

وصی کی بات پر وہ حیران ہوئی۔

"یہ بڑی معمولی بات ہے اتنی سیریس نہیں، یہ سوشل دوستانہ رویہ تو معاشرے کے لیے صحت مند ہے۔

ہاں اگر میرا نام جاننا آپ پر ظلم و جبر ہے تو۔ بھول جائیں۔ کہ اب میں اپنا نام تو بدل نہیں سکتی۔"

"ایسا نہیں ہے، مجھے آپ کا نام جاننا ظلم نہیں ہے، میں تو بس ایک عام بات کر رہا تھا کچھ مختلف مزاج کے لوگ ہوتے ہیں جو ایسی سچویشن سے بچنا چاہتے ہیں اور کلیئر کر دوں کہ مجھے آپ کے یہاں ہونے سے بھی پریشانی نہیں ہوئی کیونکہ آپ نے معاشرے کی صحت مندی کے لیے دوستانہ رویہ روا رکھتے ہوئے مجھے ڈسٹرب نہیں کیا۔"

یہ سچ تھا کہ اس نے نام کیا ہے، کیا کام کرتے ہیں، دفتر کہاں ہے، یہاں کب سے آتے ہیں، جیسی باتیں نہیں پوچھی تھیں۔

"ایک بار پھر شکریہ۔" کچھ توقف کے بعد ثمرین نے دبی سے مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ وصی ہنس دیا۔ ایسی وضاحت اور صفائی اس نے پہلی بار ہی دی تھی۔

"لوگ میں کون کون شامل ہیں؟" کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔ اس طرح کی انوکھی گفتگو کا اسے کبھی موقع نہیں ملا تھا نہ اتنی عجیب و غریب بات کہنے والا کوئی بندہ پھر اس کے اندر دلچسپی کیوں نہ جاگتی۔

"بس آپ شامل نہیں ہیں۔" وصی نے جھٹ کہا اور ثمرین کو انجانی سنسنی محسوس ہوئی۔

"اور آپ کی فیملی؟"

"کہا نا صرف آپ شامل نہیں 'لوگ' میں۔"

اندر پھیلی سنسنی یکا یک پراسرار ہو گئی۔ بات ایسی ہی خاموش کرنے والی تھی اب مزید کچھ کہنا 'صحت مند معاشرے کا دوستانہ رویہ' اپنانے جیسا تھا۔

وہ چپ تو ہو گئی لیکن اس کے اندر مچل رہے سوال اس کی غیر ارادی اور اضطراری حرکتوں سے ظاہر ہو رہے تھے۔ وصی تالاب کے اس پار سڑک پر نگاہیں جمائے تھا۔

"آپ جو پوچھنا چاہتی ہیں پوچھ لیں، اجازت ہے۔" اس نے اسی وضع میں، اس کی طرف دیکھے بنا فراخ دلی کا شاہانہ اعلان کیا۔

"فیملی کیسے 'لوگ' ہو سکتی ہے؟"

"کیوں نہیں ہو سکتی؟"

"وہ ہمارے اپنے ہوتے ہیں۔"

"اپنوں کے مزاج، عادتیں، باتیں بھی تو ہمیں ناگوار گزرتی ہیں، بری لگتی ہیں، ہمیں ان سے اختلاف ہوتا ہے۔" وہ اب بھی سڑک کو دیکھ رہا تھا۔

"اس کے باوجود ہم ساتھ رہتے ہیں، وہ ہمارے لیے باقی دنیا سے بڑھ کے اہم ہوتے ہیں، یہ ہی تو اپنوں غیروں کا فرق ہوتا ہے۔"

"یہ بڑی آئیڈیل اور کتابی سی بات ہے جب کہ سچ یہ ہے کہ ہم ان سے پیچھا چھڑانا چاہیں بھی تو ہمارے پاس راستہ نہیں ہوتا، وسائل نہیں ہوتے، دنیا کیا کہے گی کا ڈر ہوتا ہے، سو کالڈ سوسائٹی پریشر!"

اس بار اس نے ثمرین کو دیکھا۔ "جس طرح ہم

فیملی چھوڑ نہیں کر سکتے اسی طرح یہ بھی سچ ہے کہ ہم چاہ کر بھی اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ میں بھی سوچتا تھا کہ ایک دن سب کو چھوڑ دوں گا اور کبھی پلٹ کے دیکھوں گا بھی نہیں لیکن یہ ایسا آر پار فیصلہ نہیں کہ چھوڑ دیا چلے گئے بات ختم۔ اس لیے اب میں اتنا میچور اور پرفیکٹ ہو گیا ہوں کہ دور رہ کر بھی کب اور کتنا رابطہ رکھنا ہے، کیلکولیٹ کر کے اتنا ہی رکھتا ہوں۔"

"لیکن سب سے کٹ کے کیسے رہ سکتے ہیں کہ رشتے ان چاہے ہوں یا من چاہے، نبھانا فرض ہوتا ہے پھر ہمیں سب کی ضرورت بھی تو ہوتی ہے جذباتی طور پر سماجی طور پر ہم ان ہی پر انحصار کرتے ہیں، یہ دنیا ایسے ہی چل رہی ہے اگر سب ایسا سوچنے لگے تو کیسے چلے گا کاروبارِ زندگی؟"

"سب کا مجھے پتا نہیں مگر میرا کاروبارِ زندگی یونہی ٹھیک چل رہا ہے۔ میں جذباتی، سماجی، معاشی طور پر کسی پر منحصر نہیں۔ مجھے لوگ الجھن میں مبتلا کرتے ہیں، یہ جتنے قریب آتے ہیں اتنے برے لگنے لگتے ہیں، مسائل پیدا کرنے لگتے ہیں، آپ کی زندگی مشکل کرتے ہیں، سکون چھین لیتے ہیں چاہے کتنے ہی سگے ہو اس لیے میں لوگوں سے دور ہی رہنا پسند کرتا ہوں۔ میں ملتا سب سے ہوں لیکن کسی کو میری اسپیس میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے، میں نے زندگی یونہی گزارنا طے کیا ہے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟ آپ اکیلے رہ کر زندگی اور دنیا کی رنگینیاں اور خوشیاں محسوس ہی نہیں کر سکتے، تنہا زندگی گزارنا بھی کوئی خواہش ہوئی؟"

"میری خواہش ہے اور یہ خواہش مجبوری ہے کہ مجھے لوگوں نے اپنے رویوں سے الرجک کیا ہے، میں نے انھیں ہمیشہ خودغرض اور موقع پرست ہی پایا، میں یہ سوچ کر انہیں زیادہ قریب نہیں کرتا کہ مجھے ان سے نفرت نہ ہو اور انہیں دیکھنا اور بات کرنا تک ناممکن لگے۔"

"اور آپ خود؟" یہ سوال چبھتا ہوا ہو سکتا تھا اگر اس نے سادگی سے پوچھا۔ "یعنی آپ کیا ہیں؟ خود غرض، موقع پرست یا کچھ اور کہ آپ کا شمار بھی 'لوگوں' میں ہوتا ہے۔"

"میں بولڈ ہوں......" اس نے مسکرا کے کہا۔ "مجھے یقین ہے میری طرح اور بھی لوگ ہوں گے جو اس 'فیملی' نام کے سبز باغ سے باہر نکلنا چاہتے ہوں گے لیکن ان میں علی الاعلان قبول کرنے کی ہمت نہیں ہوتی کہ انہیں رشتے، تعلق بوجھ لگتے ہیں یا ان سے کوئی خوشی حاصل نہیں ہوتی، وہ ان سے دور جانا چاہتے ہیں۔ میں نے یہ ایکسیپٹ کیا اور سب سے دور ہونے کی ہمت بھی کی۔"

اسے لگا کوئی اس کے اندر اتر کر اس کا راز پا گیا ہے۔ وہ جس احساس کو خیال اور الفاظ میں ڈھلنے سے اب تک روکے ہوئے تھی، وہ کوئی اور کہہ رہا تھا۔ کتنے ہی پل وہ اپنی سوچوں میں گم غائب دماغی سے اسے دیکھتی رہی پھر گویا ہوئی۔

"میری فیملی آئیڈیل تو نہیں۔" وہ اپنی بات پر خود بھی حیران تھی سارے زمانے سے اس سچ کو چھپانے کی تگ و دو کرنے والی آج خود اپنے منہ سے اعتراف کر رہی تھی۔ "مگر میں انہیں چھوڑنا نہیں چاہتی۔" دونوں سچ اسے اپنی جگہ شرمندہ کرتے تھے۔

"اسی لیے میں نے کہا میں بولڈ ہوں۔ آپ جو کہہ رہی ہیں یہ تنہا ہونے کا ڈر ہے جو آپ کو ان سے دور نہیں جانے دیتا۔" وہ اتنے یقین سے بات کرتا تھا جیسے اس کے غلط ہونے کا سوال ہی نہیں۔

"یہ گھر والوں سے محبت بھی ہو سکتی ہے۔" وصی نے سنتے ہی فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

وہ ناراض سی سانس بھر کے سامنے دیکھنے لگی۔

"یہ دنیا کا سب سے بڑا دھوکا اور خود کو دیا جانے والا بہلاوا ہے۔" ہنسی پر قابو پاتے ہی اس نے کہا۔ "ہم چوں کہ ان سے دامن چھڑا نہیں سکتے اس لیے دنیا کے دباؤ میں آ کر اس طرح خود کو بہلاتے ہیں، اپنے آپ کو مطمئن کرتے ہیں۔"

"نہیں، یہ خون کی کشش ہوتی ہے، آپ جن کے ساتھ رہتے ہیں ان سے جذباتی طور پر اٹیچ ہوتے ہیں، وہ غلط بھی ہوں تو ان سے نفرت نہیں ہوتی۔ انسان بنا جذبات اور احساسات کے ہو تو وہ انسان نہیں مشین ہوگا۔" وہ سنبھل گئی تھی۔ اس کی بات کو ذہن سے جھٹک کر اس نے حتمی سے انداز میں کہا۔

"او کے تو میں مشین ہوں۔" اس کا انداز یوں تھا جیسے کہہ رہا ہو 'اس بے وقوف سے بحث فضول ہے۔'

وہ بھی لب بھینچ کے چپ ہوگئی۔

"آپ کو شاید برا لگا۔ سوری، لیکن میں وہ ہی کہہ رہا ہوں جو میرے خیالات ہیں، جو میرا یقین ہے۔"

"نہیں مجھے برا نہیں لگا۔ آپ پہلے ہی واضح کر چکے ہیں کہ آپ بولڈ ہیں اور کسی سے ایموشنل وابستگی نہیں۔"

"ہاں۔" وہ ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگا۔ "لیکن اس بات کا یہاں کیا مطلب۔؟"

"مطلب یہ کہ آپ کسی پر منحصر نہیں نہ کسی سے لگاؤ اور اپنائیت رکھتے ہیں اس لیے آپ کو کسی کو تکلیف نہ ہو یا برا نہ لگے اس لیے دل رکھنا، بات گول کر جانا، جھوٹ بولنا بھی نہیں آتا ہے، یہ سمجھتے ہوئے مجھے برا نہیں لگا۔" اس نے متانت سے وضاحت دی۔

"اوہ! دیکھیں پھر میں جھوٹ بولنے اور باتیں گول کرنے جیسے برے کاموں سے بچ جاتا ہوں۔" وہ مسکرایا۔ وہ ہنس دی۔

"اسے خود کو بہلانا کہتے ہیں......" بڑے یقین سے کہتے ہوئے ثمرین کو بڑا مزا آیا۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ثمرین نے کہا۔

ہم انسانوں کو بھی ایک اینکر (لنگر) کی ضرورت ہوتی ہے جس کے بنا ہمارا وجود یہاں وہاں آوارگی سے ڈولتا، بے وزن، بے معنی ہوتا ہے، ہم کہیں استقامت سے جم جائیں تبھی آس پاس موجود رشتے، لوگ، محبتیں دکھائی دیتی ہیں، محسوس ہوتی ہیں اور ہمیں یہ مقام اور مضبوطی دینے والا اینکر "فیملی" ہی ہوتی ہے، ہمیں فکس اور مضبوط رکھنے والا اینکر۔ زندگی کے رنگ، روشنی اور احساس ہمارے وجود کے کسی سے منسلک ہونے سے ہیں، تنہا وجود جتنے بھی دعوے کرے وہ خود سے جھوٹ کہتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ کوئی چیز اپنی ذات میں مکمل ہوتی ہے نہ پھلتی پھولتی ہے، ایک بیج کو بھی مٹی، ہوا، پانی چاہیے، معمولی ذرے کو بھی زمین پر رہنے کے لیے کشش ثقل، اڑنے کے لیے ہوا یا کہیں پڑے رہنے کے لیے سطح۔ وجود بنا منحصر ہوئے کچھ نہیں۔"

اس کا انداز خود کلامی سا تھا۔ وہ اسے کہتے ہوئے خود کو بھی کوئی یقین دلا رہی تھی۔

"آپ کو اپنوں کی تکلیف پر دکھ اور ان کی خوشی پر مسرت محسوس نہیں ہوتی؟ ان کے حالات کا آپ پر کوئی اثر نہیں ہوتا؟"

"نہیں ہوتا۔"

"پتا نہیں یہ اچھی بات ہے یا بری لیکن عجیب ضرور ہے۔" ثمرین کے اندر کہیں ہلکا سا رشک جاگا تھا۔

اس شام وہ ٹرین کے دروازے میں عورتوں کے ہجوم میں پھنسی سوچ رہی تھی۔

"اس نے ایسا کیوں کہا کہ صرف آپ شامل نہیں 'لوگ' میں؟"

اور بس کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے وہی خود کو سرزنش کر رہا تھا۔

"یہ کہنے کی کیا تک تھی کہ صرف آپ شامل نہیں 'لوگ' میں؟ مگر سچ بھی تو ہے وہ مجھے اریٹیٹ نہیں کرتی ہے۔" اپنے دائرے میں گھومنے والے نئے محور پر قدم رکھ چکے تھے۔

☆☆☆

اس نے کلائی میں بندھی گھڑی میں تیسری بار وقت دیکھا اور فوراً خود کو سرزنش کی۔

"آئے نہ آئے۔ مجھے پریشان ہونے کی

ضرورت نہیں۔'' اتنے دنوں سے معمول سا بنا تھا۔
''تم پریشان نہیں، منتظر ہو!'' اندر سے جتایا گیا۔
''کچھ بھی!'' وہ با آواز بڑبڑائی۔ کبھی اس جگہ اور منظر میں اسے اتنی کشش محسوس ہوئی تھی کہ وہ اپنے مزاج سے ہٹ کر ایک اجنبی کے ساتھ بنچ پر وقت گزارنے تیار ہو گئی تھی کہ یہاں گزرا وقت طبیعت کے لیے فرحت بخش تھا اور اب وہ ساری کشش اور فرحت اس اجنبی کی آمد سے مشروط ہو گئی تھی۔
''وہ اجنبی جو کسی سے اجنبی نہیں ہوتا۔'' پھر وہی جتاتی آواز۔ اس نے پہلو بدلتے ہوئے دائیں سمت دیکھا اسی وقت وہ آتا دکھائی دیا۔ ہاتھوں میں کوئی چیز لیے وہ لمبے اور تیز قدم اٹھاتا اس کے پاس پہنچا۔
''آئی ہوپ ٹھنڈی نہ ہوئی ہو۔'' دونوں ہاتھ میں کافی کے تلف پذیر کپ میں سے ایک اس کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ کنارے پر بیٹھ گیا۔
''تھینک یو۔'' اس نے کپ لے لیا۔
''آج اچانک میرا موڈ بن گیا......'' اس نے بیگ درمیان میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''تو سوچا میری فیورٹ کافی آپ کو بھی ٹیسٹ کرائی جائے۔''
''اگین تھینک یو۔'' وہ مسکرائی اور پہلا گھونٹ بھرا۔
''کچھ ڈفرنٹ ذائقہ ہے۔ لیکن اچھا ہے۔'' وہ اس رائے پر خوش ہوا۔
''مجھے آج ہی پتا چلا یہاں بھی یہ کیفے ہے۔'' اس نے ثمرین کے کپ پر لکھے کیفے کے نام کی طرف اشارہ کیا۔ ''ورنہ ہم نے اتنے دنوں میں کبھی تو یہ کافی پی ہوتی۔'' اس نے پیچھے پشت ٹکاتے ہوئے بڑا سا گھونٹ لیا۔
دونوں میں سے کسی نے نے بھی ساتھ پارک سے جانے یا باہر کہیں اور ملنے کی بات نہیں کی تھی۔
''مجھے ان کی یہ کافی اچھی لگتی ہے۔''
''میں چائے کافی کی اتنی شوقین نہیں۔'' اس نے کپ سے گھونٹ لینے کے بعد کہا۔ وہ 'کافی نامہ'

نہ شروع کر دے اس ڈر سے اس نے پہلے ہی کہہ دیا۔ اس کے دفتر کی ساتھی تھی چائے کی شوقین جسے موقع ملنے کی دیر ہوتی اور اس کا نا ختم ہونے والا چائے کا محبت نامہ شروع ہو جاتا۔
''میں پنویل سے لے کر دی ٹی تک، ویرار سے لے کر قلابہ تک اور جوہو سے لے کے تھانہ تک۔ کہاں اچھی کافی ملتی ہے، بتا سکتا ہوں۔''
''پھر تو آپ کو کافی بلاگ شروع کر دینا چاہیے۔'' اس نے کلائی پر ہو رہی خارش کو سہلاتے ہوئے کہا۔
''ڈن اینڈ ڈسٹیڈ!'' اس نے فخریہ انداز میں کہا۔ ''کالج کے دنوں میں شروع کیا تھا، تب بڑا کریز تھا۔ پھر آہستہ آہستہ دلچسپی ختم ہو گئی۔''
''کس نام سے تھا؟''
''کیفین جنکی۔''
''اچھا۔''
وہ دونوں خاموشی سے کافی پیتے رہے۔
ثمرین نے خالی کپ بنچ پر رکھا اور ہتھیلی کھجانے لگی۔ اسے بری طرح خارش ہو رہی تھی۔ ابھی ایک ہتھیلی کو آرام نہیں ہوا تھا کہ دوسری ہتھیلی میں بھی خارش ہونے لگی۔
''شٹ!'' اس کے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھتے ہوئے وصی نے کہا۔ ''آپ کو سویا ملک سے الرجی ہے؟'' اس نے اس کی سرمئی آستین کے باہر نظر آرہی ہتھیلی پر نمودار ہوئے سرخ ابھار کو دیکھ کر تیزی سے پوچھا۔
''پتا نہیں، کبھی کھانے پینے میں نہیں آیا۔'' اب وہ ضبط کرتے ہوئے گال اور کلائی سہلا رہی تھی۔
''چلیں......'' اس نے فوراً کھڑے ہو کر اپنا بیگ اور اس کا پرس اٹھایا۔ ''میرے خیال سے یہ الرجک ری ایکشن ہے۔'' اس نے کپ کی سمت اشارہ کیا۔
''سویا ملک لاٹے۔'' وہ بھی کھڑی ہو گئی۔ اس کی حالت خراب تھی۔

آئیں۔" وہ آگے بڑھا تو اس کے پیچھے وہ بھی لپکی۔ باہر نکل کر رکشا روکا اور اسے اسپتال چلنے کو کہا۔

"شکر ہے ہاسپٹل قریب ہے۔" اس کے چہرے، گردن اور ہاتھ پر چھوٹے چھوٹے سرخ ابھار نظر آ رہے تھے۔

وہ خاموش تھی۔ سارے بدن میں ہو رہی خارش پر مسلسل اس کے ہاتھ ادھر سے ادھر ہو رہے تھے۔

ایمرجنسی کے آگے رکشا رکنے سے پہلے وہ کرایہ ادا کر چکا تھا۔ اس سے پہلے وہ اندر پہنچ گیا۔ وہ آئی تب تک وہ نرس کو صورت حال سے آگاہ کر چکا تھا۔

"آپ پیشنٹ کا رجسٹریشن کروالیں۔" وہ اسے اندر لے جانے سے پہلے اسے کہہ گئی۔

آن لائن فارم میں مریض کا نام، پتا اور دیگر تفصیل درکار تھی۔ اس نے اپنے بیگ کے ساتھ رکھے اس کے پرس کو دیکھا۔ پرس سے اسے سب مل سکتا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے پرس کو چھوئے بنا رجسٹریشن مکمل کر لیا۔

"آپ پیشنٹ کے پاس جا سکتے ہیں، یہ اندر سسٹر کو دے دیجیے گا۔" وہاں موجود خاتون نے پرنٹ نکال کر اسے تھماتے ہوئے کہا۔

"تھینک یو۔" وہ دونوں بیگ اٹھا کر اندر آیا۔

اسے ڈرپ لگی تھی اور چہرہ پہلے سے زیادہ سوجا ہوا تھا۔ اسے افسوس ہونے لگا۔ وہاں موجود ڈاکٹر اسے بتانے لگیں کہ اسے کیا دیا گیا ہے اور آگے کیا کریں گے۔

"زیادہ سریس نہیں ہے، جسٹ ریشز ہیں جو کچھ دیر بعد کم ہونے لگیں گے۔" جاتے جاتے وہ اسے تسلی دے گئی۔

"رئیلی سوری۔" وہ نادم سا اس کے سرہانے کے پاس آیا۔

"مجھے ہی الرجی کا علم نہیں تھا تو آپ کو کیسے ہوتا، شکر ہے کہ اب پتا تو چل گیا۔"

اس نے پیشانی رگڑتے ہوا کہا۔ اس کے ہاتھ اب بھی مسلسل جلد پر گھوم رہے تھے۔ اس کی موجودگی میں وہ احتیاط اور ضبط کر رہی تھی ورنہ رکشا میں تو اس کا دل کر رہا تھا سب بھول کے پاگلوں کی طرح سب جگہ ہاتھ چلائے۔

"میں باہر ویٹ کرتا ہوں۔" اسے احساس ہو گیا تھا۔ اس کا پرس پلنگ پر رکھ کر وہ چلا گیا۔ جاتے ہوئے اس نے پردہ کھینچ کر پلنگ بالکل چھپا دیا تھا۔

اسے اس کا معمولی سی باتوں کا خیال کرنا اچھا لگ رہا تھا۔ اس کی زندگی میں ایسا آج سے پہلے کوئی نہیں تھا۔

اس کی ڈرپ ختم ہوئی تب تک اسے آرام آ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے جانے کی اجازت دے دی تھی لیکن سسٹر نے ڈسچارج نوٹ کے لیے روک رکھا تھا۔ وہ نوٹ باہر دکھا کر بل کی ادائی ہوتی اور اسے چھٹی ملتی۔ وہ پلنگ پر بیٹھی تھی اور وصی قریب رکھے اسٹول پر۔ اس کا فون بجا، فرزانہ کی کال تھی۔ اس نے فون میں وقت دیکھا اور تب اسے خیال آیا کہ دیر ہو گئی ہے۔

"السلام علیکم امی۔" اس کی آواز حد درجہ دھیمی اور تھکی ہوئی تھی۔

"کہاں ہو تم؟ کتنی دیر میں پہنچو گی؟" ادھر سے مصروف انداز میں پوچھا گیا۔

"ابھی اسٹیشن پر ہوں۔" اسے جو بھی کہنا تھا وہ جھوٹ ہی ہوتا۔

"اچھا، آتے ہوئے کولڈ ڈرنک اور کیک لیتی آؤ۔ تمھاری خالہ آئی ہیں۔"

"میں پنویل اسٹیشن نہیں پہنچی امی۔" اس نے کن انکھیوں سے انجان بن رہے وصی کو دیکھا۔

"تو کیا ابھی تک آفس میں ہو؟"

"نہیں اسٹیشن پر۔" اس نے مبہم سا جواب دیا۔

"پھر تو تمھیں دیر ہو جائے گی۔"

"جی دیر ہو گئی ہے۔"

وصی اٹھ کر چلا گیا۔

"ایسا کرو، سوئگی سے آرڈر کر دو۔"

"امی کسی بچے سے منگوا لیں، عنبر نہیں آئی؟"

"کوئی بچہ اتنی دور نہیں جائے گا، عنبر بھی اتنا آگے نہیں جائے گی۔ تم آرڈر کر دو۔ دیر نہ کرو۔" انہوں نے فون رکھ دیا۔ یہ تو سب کی کوشش ہوتی تھی جتنا ممکن ہو اس سے خرچ کروائیں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ دوسرے وہ خالہ کے آگے ایسی ویسی چیز نہیں پروتی تھیں۔ ان کی اپنی لاڈلی بہن سے محبت بھی اس کے لیے مشکل تھی۔

جب وہ چیزیں آرڈر کر رہی تھی، وصی ڈسچارج نوٹ لے کر آ گیا۔

"چلیں۔" اس نے کہا اور وہ فون میں دیکھتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ چپلیں پہنیں اور چلنے لگی۔ وہ بلنگ کاؤنٹر پر پہنچے تو اس نے فون پرس میں ڈالا اور آگے آ کر اس سے کاغذ کا پرزہ لینا چاہا۔

"ہر لحاظ سے بل کی پے منٹ میرے ذمے بنتی ہے۔" اسے کہتے ہوئے اس نے پرچا سامنے بیٹھی خاتون کو دیا۔

"بالکل نہیں۔ یہ ان جانے میں ہوا حادثہ تھا، میرے لیے تو خیر کا پہلو بھی ہے کہ مجھے اپنی الرجی کا علم ہو گیا۔" اس نے پرس سے والٹ نکالا اور اس میں سے کارڈ۔

"پلیز۔" اسی وقت دوسری سمت بیٹھی خاتون نے رقم بتائی اور اس نے جھٹ کارڈ اسے تھما دیا۔

"ناٹ فیئر۔" وہ ذرا ناراضی سے کہتا پیچھے ہوا کہ اب اسے سوائپ مشین میں پن ڈالنا تھا۔

وہ وہاں سے رسید اور فائل لے کر پلٹی تو وصی بیگ شانے پر ڈالے فون دیکھ رہا تھا۔

"چلیں۔" اس نے قریب آ کر کہا۔

انہیں وہاں دو گھنٹے سے زیادہ وقت ہو گیا تھا۔ باہر اندھیرا پھیل چکا تھا۔ وہ کافی بہتر تھی لیکن ان دو ڈھائی گھنٹوں کے واقعات نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔

"آپ ٹھیک ہیں یا میں گھر تک ساتھ چلوں؟" اسپتال کے گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے وصی نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ جانے کیوں ثمرین کا دل بھر آیا۔

"میں چلی جاؤں گی، اب اچنگ ہے نہ ریشز۔ تھینک یو۔"

اس نے پرس سے فون نکالا تا کہ ایپ میں اگلی ٹرین کا وقت دیکھ سکے۔ اس نے دیکھا ہی نہیں کہ وہ دور سے آ رہی کار کا نمبر دیکھ کر اسے ہاتھ کے اشارے سے قریب بلا رہا تھا۔ جب کار پاس رکی تو اس نے وصی کو دیکھا جو پچھلا دروازہ کھول رہا تھا۔

"مجھے ایڈریس نہیں پتا اس لیے پنویل اسٹیشن تک بک کی ہے، اس وقت ٹرین میں رش ہوگا اور آپ ایگزاسٹ ہیں۔"

"تھینک یو۔" اس تردد پر کہنے کو کئی رکھی سے جملے تھے لیکن اس نے وہی اذکار کیا جو اس کے اندر تھا ممنونیت! واقعی اسے اس وقت آرام سے اے سی کی ٹھنڈک میں گھر پہنچنے کی خواہش تھی۔ ٹرین میں بھیڑ کے بیچ سینڈوچ بن کے جانے کا تصور ہی محال تھا۔

وہ اندر بیٹھی تو اس نے دروازہ بند کیا۔ آگے جھک کے ڈرائیور کو "او ٹی پی" دیا پھر اس کی کھڑکی میں آیا۔

"پوری پے منٹ کر دی ہے اور وہ انکل بالکل ٹھیک ہو کے ڈسچارج ہو چکے ہیں۔" اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتی، اس نے سیدھا ہو کر کار کی چھت پر ہاتھ مارا اور اس کا اشارہ پاتے ہی ڈرائیور نے کار آگے بڑھا دی۔

اس نے مڑ کے دیکھا وصی وہیں کھڑا تھا۔ اس نے ایک مسکراہٹ اس کی طرف بھیجی اور سامنے دیکھتے ہوئے پشت پیچھے ٹکا کے آنکھیں موند لیں۔ کبھی اس کی تیمارداری کی خاطر کوئی اس کے پاس نہیں بیٹھا تھا، وہ دوا بھی خود لیتی تھی، ڈاکٹر کے پاس بھی اکیلے چلی جاتی تھی اور کچھ کھانے کا من ہو تو خود ہی بنا لیتی تھی۔ فرزانہ اکثر کہتی تھیں۔

"ثمرین بیمار بھی ہو تو پتا نہیں چلتا۔"

اس کی بند آنکھوں کے پیچھے وہ جاذب نظر مگر فکر مند سا چہرہ لہرایا جو اس کا پہلا تیمار دار تھا۔ اس نے وہ چہرہ ہٹانے کی کوشش نہیں کی۔

"اتنی جلدی کیسے آ گئیں؟" اسے دیکھتے ہی فرزانہ نے کہا۔ خالہ اور ان کی دونوں بیٹیاں موجود تھیں۔

"آپ کا فون آیا تب میں نیلیما کے ساتھ اس کے اسٹیشن پر تھی۔ کیسی ہیں خالہ؟"

"اچھی ہوں پر تجھے کیا ہوا ہے طبیعت ٹھیک ہے؟"

"ہاں۔ تمہارے کیا حال ہے صبوحی، روحی؟" وہ بیٹھی نہیں تھی یونہی رک کر بات کر رہی تھی۔

"ٹھیک ہیں۔" روحی نے جواب دیا۔

"آتی ہوں۔" وہ مسکرا کے اندر کمرے کی طرف بڑھی۔

"کیسی ہو گئی ہے ثمرین، عنبر سے کہو ذرا اپنا جادو اس پر بھی چلائے۔"

"ایسی بات نہیں ہے آج دیر ہو گئی اسے اس لیے زیادہ تھک گئی ہے۔" فرزانہ نے بہن کو اطمینان دلایا۔

وہ بستر پر گر گئی۔ اسے بے تحاشا نیند آ رہی تھی۔ باہر سے آ رہی آوازیں جلد ہی گڈمڈ ہونے لگیں اور ذرا دیر بعد ہی وہ سو بھی گئی۔

☆☆☆

"گڈ ایوننگ انکل" آج بغل والے دونوں بچے ماں باپ کے بغیر ہی نیچے سائیکل چلا رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی دونوں نے یک زبان ہو کے آواز لگائی۔

"گڈ ایوننگ۔" اس نے رکے بنا مسکرا کے جواب دیا۔

"خوشی نے کئی دن سے فون نہیں کیا۔" بچوں کو دیکھ کر اسے یاد آیا۔

"آج میں کر لوں۔۔۔ چھوڑو بھی اچھا ہی ہے۔" اس نے یاد کو کچل دیا۔

صوفے پر بیٹھ کر ٹی وی لگانے کے بجائے کھانے کے لیے آج وہ میز کرسی پر بیٹھا تھا۔ ساتھ ہی فون میں 'سویا ملک الرجی' بھی دیکھ رہا تھا۔ اس کے شدید الرجک رد عمل پڑھتے ہوئے اس نے کھانے سے ہاتھ روک لیا۔

"اتنا سیویر ری ایکشن۔۔۔" اس کا نوالہ حلق میں اٹک گیا۔ جلدی سے پانی کا گلاس اٹھا کر لقمہ نگلا اور پھر دونوں ہاتھ سے فون پکڑ کر دیکھنے لگا۔ جیسے جیسے وہ پڑھ رہا تھا اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

"اف! اس غلطی کی سزا اتنی سخت ہو سکتی تھی۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو۔۔۔" اس کا حساب کتاب سے سوچنے اور ویسا ہی رد عمل دینے والا دماغ اس وقت سن تھا۔ جو کچھ ہو رہا تھا وہ کہیں اور ہو رہا تھا۔ ساری ہلچل سر سے سینے میں منتقل تھی۔ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ پلیٹ اور چمچہ اٹھا کے ویسے ہی فریج میں رکھا اور خواب گاہ میں چلا آیا۔ پلنگ پر آ کر اس نے قریبی میز سے سڈوکو کی کتاب اور پنسل اٹھائی مگر جلد ہی بے زار ہو کر کتاب بند کر کے واپس رکھ دی۔

"کوئی نیا پزل یا ایکٹیویٹی ڈھونڈنا پڑے گی۔"

اس نے فون اٹھا کر اسی وقت تلاش شروع کی۔ اسے عام ویڈیو گیم جیسے تفریحی کھیلوں میں دلچسپی نہیں تھی۔ اسے ذہنی مشق والی چیزیں اچھی لگتی تھی۔ ذرا دیر بعد اس نے فون بھی رکھ دیا۔ کچھ دیر دیوار کو تکتے ہوئے وہ دماغ میں کلبلا رہے خیال کی نفی کرتا رہا۔ اس کا ذہن اسے اسی منظر میں کھینچ رہا تھا، تصور وہ وقت دہرانا چاہتا تھا۔ اسے لگا اس سارے واقعے میں کوئی اہم نکتہ اس سے نظر انداز ہو گیا ہے اس لیے طبیعت بار بار ادھر لے جا رہی ہے تاکہ وہ یاد آئے اور یہ انجانی الجھن دور ہو۔

"کیا ہرج ہے۔" اس نے ہار مانتے ہوئے آنکھ بند کر لی۔

جیسے صبح نیند سے جاگنے کے بعد خواب یاد ہو نہ ہو لیکن خواب میں چھایا رہا اچھا برا، فرحت بخش یا

افسردہ ہر احساس یاد رہتا ہے بالکل ویسے ہی اس سارے واقعے میں جو احساس، جو بات اس پر حاوی تھی وہ خواب کے 'تھیم' کی طرح پھر اس وقت اس کے سامنے تھا۔

"ثمرین!" اس نے بند آنکھوں سے ہی زیر لب کہا۔ بند آنکھوں کے پیچھے چند گھنٹے پہلے والی حقیقت کا اعادہ وہی تھی۔ یادداشت نے اس کی ہر ہر حرکت سنبھالی ہوئی تھی۔ اسے اس کے ہر تاثر کا مطلب بھی پتا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولنے کی بجائے سختی سے بھینچ لیں۔ اسی وقت فون بجا اور اس نے بھیجے زبردستی آنکھیں کھولیں۔

"یاد کرنے کی دیر تھی۔" ریحانہ کی کال تھی مطلب دوسری جانب ضرور خوشی تھی۔

"ہیلو۔"

"چاچو! مجھے بخار ہے اور۔" خوشی شروع ہوئی۔

☆☆☆

اتوار کے دن اسے بہت کام ہوتے تھے۔ نیند پوری کرنے کے بعد مشین لگا کے ہفتہ بھر کے کپڑے دھونا، کمرے کی صفائی، چادر بدلنا، الماری ٹھکانے لگانا جو کہ عبرین اور اس کے زیر استعمال تھی۔

آج عبرین کو میک اپ کے لیے ساتھ ممی جانا تھا۔ وہ گیارہ بجے ہی چلی گئی تھی۔ فرزانہ باورچی خانے میں تھیں تب دروازے پر گھنٹی بجی۔ ثمرین نے دروازہ کھولا تو سامنے شذو بوا تھیں۔ وہ محلے میں ہی رہتی تھیں اور رشتے کروانے کے لیے مشہور تھیں۔

"آج میری یاد کیسے آگئی؟" فرزانہ ان کے پاس بیٹھ گئیں۔

اس نے الماری کا کام ویسے ہی چھوڑا اور باورچی خانے میں آگئی۔ اب یہاں کا بقیہ کام اسے ہی نپٹانا تھا۔ پہلے ان کے لیے چائے رکھی اور پھر پیاز ٹماٹر اور قیمے کو دیکھا۔

"ایک رشتہ تھا، وہ لوگ اچھی نوکری کرنے والی لڑکی ڈھونڈ رہے ہیں تو مجھے اپنی ثمرین یاد آئی تم نے کہیں بات طے تو نہیں کر دی اس کی؟"

"نہیں بوا، ابھی کہاں۔"

"پھر کہو تو انہیں لے آؤں کسی دن۔"

"کون لوگ ہیں کیا کرتے ہیں، کچھ تو بتاؤ پہلے۔" فرزانہ کو مزید معلومات چاہیے تھی۔

شذو بوا اچھے، پڑھے لکھے لوگ اور شادی شدہ نندیں جیسی اچھی اچھی باتیں بتانے لگیں۔

"ثمرین!" فرزانہ نے اسے آواز دی۔ وہ وہیں سے مڑ کر انہیں دیکھنے لگی کہ درمیان میں دروازہ نہیں تھا۔ "اگلے جمعہ جلدی آسکتی ہو، انہیں جمعہ کو ہی بلا لیتے ہیں، اس دن افضل بھی گھر میں ہوتا ہے۔"

اس کا جواب سنے بنا انہوں نے شذو بوا کو دیکھا۔

"ثمرین آجائے گی سات بجے تک؟" بوا نے ثمرین کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"آجاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے پھر جمعہ کا کہہ دیتی ہوں۔" وہ پلٹ کر کڑھائی میں تیل ڈالنے لگی۔

اسے اب اپنے 'آجاؤں گی۔' کہنے پر غصہ آرہا تھا۔

☆☆☆

وجی نے سارے خانے مکمل ہوتے ہی کتاب بند کی اور اس کی طرف دیکھا جو سامنے دیکھتے ہوئے کہیں اور ہی کھوئی محسوس ہوئی۔ اس کا مزید پزل میں دماغ کھپانے کا من نہیں تھا۔ کتاب بیگ میں رکھ کے اس نے بیگ زانو سے ہٹا کے بازو میں رکھا۔ وہ تب بھی متوجہ نہیں ہوئی۔ تبھی پرس سے فون پر پیغام موصول ہونے کی اطلاع آئی۔ اس نے پرس کو دیکھا لیکن اندر سے فون نکالا نہیں۔

"آج باتوں کا موڈ نہیں ہے؟" وجی نے پوچھا۔

"میرا باتوں کا موڈ کبھی کبھار ہی ہوتا ہے۔ میں ریزرو اور کچھ انٹروورٹ سی ہوں، آپ کے ساتھ واقعات ہی ایسے ہوتے گئے کہ اتنی باتیں ہونے لگیں۔"

"سیم سیم۔" اس کے اندر سے آواز آئی لیکن اس نے کہا نہیں۔

"آج میرا بھی سنڈوکو کا موڈ نہیں ہے۔" اس نے کہا تو ثمرین نے اس کے خالی ہاتھ اور پھر بیگ کو دیکھا۔

"میں نے نیوز پیپر میں کوشش کی تھی لیکن مجھ سے ہوا نہیں اور تب میں نے سوچا آپ بڑے جینئس ہیں۔" وہ بے ساختہ زور سے ہنس دیا۔

"میں جینئس ہوں تو نہیں لیکن آپ کا یوں سوچنا اچھا لگا۔"

تبھی پرس میں دھرے فون کی رنگ ہونے لگی۔ اس نے فون نکالا اور سائیلنٹ کر دیا۔ وصی کو اس کے چہرے پر کھنچاؤ محسوس ہوا۔ وہ دوسروں کے معاملے میں بھی ٹانگ نہیں اڑاتا تھا لیکن اول دن سے اس رنج کے معاملات عام نہیں تھے۔ اس نے اسے اپنی زندگی کی واحد استثنائی چیز مان لیا تھا۔

"آپ فون اگنور کر رہی ہیں تو بہتر ہے اسے سوئچ آف کر دیں۔" اس نے مشورہ دیا۔

"فون بند کیا تو سب پریشان ہو جائیں گے۔" اس نے رد کیا حالاں کہ ایسا پریشان کوئی نہیں ہوتا تھا۔

"وہ تو ابھی آنسر نہ کرنے پر بھی ہو رہے ہوں گے۔" اس کا نکتہ درست تھا۔

"انہیں لگے گا میں ٹرین میں ہوں۔ اکثر رش میں فون نکالنا ناممکن ہوتا ہے۔" اور اس کا جواز مناسب۔

"میرا موٹو ہے کہ ہمیں سب سے پہلے اپنی فکر ہونی چاہیے یعنی میں وہ کروں جو میں چاہتا ہوں۔"

"اور میں فون سوئچ آف نہیں کرنا چاہتی۔" وہ مسکرائی۔

"کیونکہ آپ خود کو اولیت نہیں دیتیں ورنہ کسی کی پروا کیے بنا فون بند کر دیتیں۔"

"یہ سچ ہے۔" اس نے قبول کیا۔ کچھ دیر وہ دونوں خاموش رہے۔ بالآخر وصی نے آہستہ سے کہنا شروع کیا۔

"آپ کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں یہ ایک عام آبزرویشن ہے، ہمارے یہاں فیملیز میں جذباتی اور مالی استحصال کا شکار مرد عورت یکساں ہوتے ہیں اور دونوں ہی جنس نے مل کر اس ابیوز کو نارملائز کر رکھا ہے۔ ایسا کرنے والوں کو کوئی برا بھلا نہیں کہتا، کوئی نہیں ٹوکتا لیکن اگر اسی فیملی میں کوئی اپنے آپ کو اول رکھے، خود کو ترجیح دے، اپنے بارے میں سوچے تو سب ہاتھ دھو کے اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ سیلفش ہے، کسی کی پروا نہیں اور جانے کیا کیا، حالاں کہ ہر بندے کا خود کو اہمیت دینا نارملائز ہونا چاہیے اور ہر قسم کے استحصال کو ڈس کریج کیا جانا چاہیے لیکن یہ ہوتا نہیں ہے۔ جب آپ خود کو اہمیت دیتے ہیں تب ہی دوسروں کو آپ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے ورنہ وہ اپنے مقصد پر نظر رکھتے ہیں اور آپ قدموں تلے کچلے جاتے ہیں اس لیے رشتے جب لیچ (جونک) بن جائیں تو قربانی اور عظمت چھوڑ کے خود کو بچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

دل پر تیر کی طرح لگے تھے اس کے الفاظ لیکن وہ کیا کہتی، چپ رہی لیکن اس کی باتوں نے اسے کہیں تو بدل دیا تھا۔

"آج کچھ مہمان آرہے ہیں شادی کے سلسلے میں۔" کچھ دیر بعد اس نے خود کو کہتے سنا۔ اس آدھے ادھورے جملے سے ہی وہ سب جان گیا۔

"شادی تو دور اگر اس میٹنگ کے لیے بھی پریشرائز کیا جا رہا ہے تو آپ منع کر دیں، اور میرا یقین کریں خود کے بارے میں سوچنا برا نہیں ہے، یہ غلط نہیں آپ کو اس وجہ سے گلٹی فیل کرنے کی ضرورت نہیں۔ لوگوں کی کوشش ہوتی ہے آپ کو اپنے بارے میں سوچنے پر شرمندہ کریں لیکن آپ پروا کیے بنا اپنے لیے بہتر اور اچھا اور وہی سوچیں، کریں جو آپ چاہتی ہیں۔" پہلی بار وہ کسی کو مشورہ دے رہا تھا وہ بھی اس قدر خلوص اور شدت سے۔

"مجھے پریشرائز تو نہیں کیا کسی نے۔" اس کا

مسئلہ تو اس سے بھی آگیا گزرا تھا۔ پریشرائز کرنے کے لیے لازمی تھا کہ کسی کو اس کی شادی یا مستقبل کی فکر ہوتی۔ یہ تو شدہ دیوا خود ہی گھر کی بڑی بیٹی کے لیے رشتے لے آئی تھیں۔ "بس اس وقت میں خود ہی اپنی فیلنگز نہیں سمجھ پا رہی۔"

"آپ کنفیوز ہیں تو فون کر کے منع کر دیں۔"

اس کی بات پر ثمرین یوں مسکرائی جیسے بچوں کی نادانی پر مسکرایا جاتا ہے۔

"ہفتہ بھر پہلے سے ملاقات طے ہے، وہ لوگ اتنی دور سے آ رہے ہیں، ہم کبھی بھی کہیں بھی اپنی مرضی نہیں کر سکتے اسپیشلی اگر اور لوگ بھی انوالو ہوں، ایسا کرنا غیر ذمہ دارانہ رویہ ہوگا اور مجھے ملنا نہیں ایسا بھی نہیں ہے، بس پتا نہیں کیوں......" وہ رک گئی۔ "میں اپنے وقت پر گھر جانا چاہتی ہوں جب کہ امی نے کہا تھا آج جلدی آؤں وہ اسی لیے کال کر رہی ہیں۔"

"آپ انہیں میسج کر دیں کہ جلد نہیں آ سکتی۔"

اس نے حل پیش کیا اور وہ "ہاں یہ تو کر سکتی ہوں" سوچتی فون اٹھا کے انہیں پیغام لکھنے لگی۔ وہ دیر سے بھی جاتی تو مہمانوں کو دیے گئے وقت سے پہلے پہنچ جانا تھا۔

کچھ دیر بعد جب وہ جانے کے لیے کھڑی ہوئی تو وصی نے کہا۔

"آل دا بیسٹ۔" اس نے جواباً شکریہ نہیں کہا تھا۔

گھر آئی تو مہمان پہنچے نہیں تھے لیکن فرزانہ خفا تھیں کہ عنبرین کب سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ نہا کر کپڑے بدل کر فارغ ہوئی اور وہ لوگ آ گئے۔ اس نے عنبرین کو میک اپ سے منع کر کے اپنے کاجل، لائنر اور لپ اسٹک سے ہی خود کو سنوارا۔

"جانے کیا ہوا ہوگا۔" وصی کا ذہن بار بار ایک کمرے میں مہمانوں کے درمیان صوفے پر سرخ جوڑے میں دوپٹا شانوں پر پھیلا کر دائیں شانے پر دوسرا اسرا ڈالے بیٹھی ثمرین کو یاد کر رہا تھا جس کا کاجل، لپ اسٹک، جھمکے، بال، پیشانی، اور بھوری سی آنکھیں...... اس نے سر جھٹکا۔ اسے یوں لگا وہ تو اس کمرے میں بھی موجود تھی۔

"سب کو پسند ہی آئے گی۔"

☆☆☆

وہ دروازہ کھول کر اندر آیا اسی وقت فون بجنے لگا۔ اس نے اسکرین پر نام دیکھا اور فون سائلنٹ کر کے رکھ دیا۔ فی الوقت امی ابا کسی سے بات کرنے کی طبیعت نہیں تھی۔ معمول کی طرح غسل کرنے اور پھر کافی بنانے کے بعد وہ ہال میں آیا۔ ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کیا۔ چینل بدلتے ہوئے بلآخر اسپورٹس چینل پر قار مولا ون کے کسی پروگرام کو دیکھ کر رک گیا، آواز تھوڑی اونچی کی، ریموٹ رکھ کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ کافی پیتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ فون تھرک رہا ہے۔ ٹی وی اسکرین سے نظر ہٹا کر فون کو دیکھا اور چیک کرتے ہوئے سر ہلایا۔ رنگ مکمل ہو کے کال ختم ہوئی تو وہاں سات مسڈ کالز لکھا تھا۔ اس نے آگے جھک کر تپائی پر رکھے ریموٹ سے آواز بند کی اور ریحانہ کو فون لگایا جو کب سے اس تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"ہیلو۔"

"کہاں ہو تم؟ فون کیوں نہیں اٹھا رہے؟ جان بوجھ کے کرتے ہو ایسا، تم کو ذرا احساس نہیں کسی کا۔ کوئی بار بار ایسے ہی فون نہیں کرتا اتنا تو سوچنا چاہیے کہ کوئی ایمرجنسی۔"

"کیا ہوا ہے اب؟" اس نے بے زاری سے بات کاٹی۔

"خوشی کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔"

"کیسے؟" وہ ایک دم سیدھا ہوا۔

"کب سے ضد کر رہی ہے وہ چاچو کو بلا دیں چاچو کو بلا دیں اور چاچو ہے کہ۔"

"ایکسیڈنٹ کیسے ہوا؟ زیادہ چوٹیں آئی ہیں؟"

"سلائیڈ سے پھسل گئی تھی، ٹانکے لگے ہیں سر اور ہاتھ میں چوٹیں آئی ہیں، تم آجاؤ تو اس کی چاچو کی رٹ ختم ہو۔" اس نے شاید زیادہ ہی تنگ کیا ہوا تھا۔

"ہاسپٹل میں ہے یا گھر؟"

"گھر آگئی ہے، لو بات کرو اس سے۔" انہوں نے فون خوشی کو تھمایا۔

"ہیلو چاچو۔" اس کی نقاہت بھری آواز آئی۔

"کیا ہو گیا ہے اس شیر کو؟" اس کی آواز سن کر اسے اچھا نہیں لگا۔

"چاچو! میں سلائیڈ سے گر گئی اور خون نکلا اور اسکریچز آئے۔ اور مجھے انجکشن بھی لگائے ڈاکٹر نے پین ہو رہا ہے۔ میں چل بھی نہیں سکتی اور کوئی مجھے آئس کریم نہیں دے رہا اور مجھے کر کرے بھی نہیں دیے اور بس دوا کھلا رہے، آپ آجاؤ اور......"

"وہ جو شروع ہوئی تو رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی اسے درمیان میں بولنا پڑا۔

"تم بات نہیں کرو زیادہ۔ میں کل آؤں گا تو سب لاؤں گا، ابھی تم دوا کھاؤ تو جلدی ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

"آپ ابھی نہیں آرہے؟" وہ روہانسی ہوئی۔

"بہت لیٹ ہو گیا ہے۔"

"آپ آئیں گے میں اس لیے سوئی نہیں۔"

"تم سو جاؤ، میں صبح آؤں گا۔"

"پرامس؟"

"یس پرامس۔"

یہاں سے اس گھر تک جانے کے لیے اس وقت اسے دو ڈھائی گھنٹے درکار تھے اور اتنا ہی وقت واپسی کو لگتا جب کہ صبح دفتر بھی جانا تھا۔

اس نے کال ختم کی لیکن اس پر عجیب سی بے چینی سوار تھی۔ خوشی کی آواز اس کے ذہن سے نکل نہیں رہی تھی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اچانک کسی خیال نے اس کی بے چینی ختم ہو گئی۔ اس نے فوڈ ڈیلیوری ایپ سے خوشی کی فرمائشی ساری چیزیں اسے بھجوا دیں۔

جب وہ سونے کی تیاری کر رہا تھا تو امی کی آئی کال اس نے فوراً اٹھالی۔ دوسری طرف چہکتی خوشی تھی۔

"تھینک یو چاچو۔۔۔!"

اگلے دن دفتر سے خوشی کی عیادت کو جاتے ہوئے اس کے تصور میں بار بار وہ بینچ آرہا تھا جہاں کوئی بار بار دائیں طرف دیکھ رہا تھا۔

"فون نمبر تو۔ نہیں۔" اس نے خیال مکمل ہونے نہیں دیا۔

☆☆☆

کریڈٹ کارڈ کا اسٹیٹمنٹ دیکھتے ہی اس کی آنکھیں ابل پڑیں۔

"امی!" وہ فون ہاتھ میں لیے ہال میں آئی۔

"اتنی کیا شاپنگ کی آپ سب نے؟"

"اتنی کا کیا مطلب؟ کپڑے لیے ہیں اور اب شادی ہے تو میچنگ اور چیزیں بھی لگتی ہیں۔" انہوں نے ٹی وی سے پل بھر کو ہی نظریں ہٹائی تھیں۔

"پڑوس کی شادی ہے امی اور"

"اب اس بحث کا فائدہ؟ ایک ساتھ نہیں بھر سکتی تو ای ایم آئی میں کنورٹ کر لو۔" انہوں نے اسے حل بتایا۔

"آپ کی محنت کی کمائی پر پہلا حق آپ کا ہوتا ہے جو اس بات کو مسترد کر دے، اہمیت نہ دے، چاہے ماں باپ ہی کیوں نہ ہوں پھر آپ کی کمائی پر ان کا بھی کوئی حق نہیں بنتا۔" اس کے کان میں وصی کی آواز گونجی جو اس وقت اسے بہت بری لگی تھی۔

"ابھی پھپھو کی یہاں شادی پر ہی نئے کپڑے لیے تھے سب نے۔" اس نے چپ ہو جانے کے بجائے کہا۔

"وہ سب عنبر کی سہیلی کے یہاں بھی پہنے تھے، اس کے بھائی کی شادی میں۔" انہوں نے شہر کے دوسرے کونے کی شادی کا ذکر کیا۔ اب ان ہی کپڑوں کو ہر شادی کا یونیفارم تو نہیں بنا سکتے۔"

وہ ڈھیلے قدموں سے واپس کمرے میں آ گئی۔
"تو میرے لیے بھی ایک ڈریس لے لیا ہوتا۔"
اس نے سوچا۔ اب اگر وہ ان سے کہتی تو جواب ملتا۔ تم نے پہلے کہا کیوں نہیں یا تم کہاں شادیوں میں آتی ہو جب کہ اب پڑوس کی شادی میں شرکت تو ٹل نہیں سکتی تھی۔ اس کی جو تھوڑی بہت بچت ہوتی وہ ایسے بلوں میں خرچ ہو جاتی اور کبھی وہ بھی ناکافی پڑتی۔ اس کے نام کا یہ کارڈ ہمیشہ فرزانہ کے پاس ہی ہوتا تھا۔
اسے برا تو ہمیشہ لگتا تھا غصہ آج پہلی بار آ رہا تھا۔

☆☆☆

اس نے پٹ پر ہاتھ رکھا لیکن دھکیل کر پورا کھولنے سے پہلے رک گئی۔
"انہیں عنبرین پسند آئی ہے لیکن چاہتے ہیں جاب والی لڑکی اس لیے ثمرین کے لیے سوچنے کا وقت مانگا ہے۔" اندر شدّ و بوا اپنے لائے رشتے کی بابت معلومات بہم پہنچاتے موجود تھیں۔
"اس میں سوچنا کیا ہے بھلا؟ عنبرین پسند ہے تو اس کے لیے ہاں کریں یا آگے بڑھیں۔" اس کی امی کو ان کا وقت لینا ناگوار گزرا۔
"تم مان جاؤ گی عنبرین کے لیے کہیں تو؟" شدّ و بوا کے لہجے کی حیرت اس کے دکھ سے کم نہ تھی۔
"لڑکا اچھا ہے، شادی دونوں کی کرنی ہے، دونوں کی قسمت جس کی پہلے ہو جائے۔" انہوں نے کب کوئی جھنجٹ پالا تھا جواب تردد کرتیں۔
"ایسا ہے تو میں اشارہ دیتی ہوں انہیں۔"
"السلام علیکم۔" وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔
"کیسی ہیں شدّ و بوا؟" اس نے عام سے لہجے میں پوچھا۔
"اللہ کا کرم ہے بیٹا۔"
وہ چپلیں اتار کے اندر بڑھ گئی۔
"بوا کے لیے بھی چائے بنا لینا۔" پیچھے سے فرزانہ کی آواز آئی۔ کمرے میں آ کر دوپٹا اور پرس ایک طرف رکھ کے وہ ہاتھ منہ دھونے چلی گئی۔
کمرے میں آ کر تولیے سے چہرہ خشک کیا تو دل کر رہا تھا کچھ دیر لیٹ کر پیٹھ سیدھی کر لے لیکن باہر شدّ و بوا چائے کی منتظر تھیں۔
"اتنے ٹائم سے ثمرین نوکری کر رہی ہے......"
شدّ و بوا فرزانہ کے قریب جھک کے دبے سے لہجے میں کہہ رہی تھی جو اس چھوٹے سے گھر میں اس تک بھی پہنچ رہا تھا۔ "کبھی کسی کا ذکر نہیں کیا، مطلب خود ہی کوئی پسند نہیں آیا، آج کل تو ہر دوسرے گھر میں پسند کی شادی ہو رہی ہے۔"
"ثمرین کو ان باتوں میں انٹرسٹ ہی کہاں ہے وہ بس اپنے کام سے کام رکھتی ہے۔" فرزانہ نے سادہ سے انداز میں کہا۔
"اسے نہ سہی کسی نے اس میں تو انٹرسٹ لیا ہوگا؟" شدّ و بوا جانے کیا اگلوانا چاہتی تھی۔
"ایسی سیدھی سادی لڑکیاں آج کل کہاں کسی کو پسند آتی ہیں۔ اب ان لوگوں کو ہی دیکھ لو، عنبرین اچھی لگی انہیں بھی۔"
وہ بھی کچھ نہیں کہہ سکی کہ اسے سیدھی سادی کیوں کہا جاتا ہے۔ وہ خوش لباس تھی، پہننے اوڑھنے اور گفتگو کا سلیقہ تھا، فل میک اپ میں دفتر نہیں جاتی تھی لیکن کاجل اور نیچرل لپ اسٹک کسی دن نہیں بھولتی تھی، پراعتماد تھی، خود پر توجہ بھی دیتی تھی، جہاں اور جتنا ضروری ہوتا لوگوں سے ملتی جلتی بھی تھی لیکن اس کی عادت و مزاج میں شوخی اور تیزی نہ تھی۔ اور اس کے نہ ہونے کا مطلب یہ تھا کہ اس میں کسی کو متاثر کرنے والی کوئی خوبی نہیں، کم از کم اس کے گھر والوں کا یہ ہی ماننا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا دفاع کرنے کے بجائے وہ ہی پہلی صف میں اس کی نا متاثر کرنے والی شخصیت کا علم لیے کھڑے نظر آتے تھے۔
اس رات کروٹیں بدلتے ہوئے وہ کسی نے تو اس میں انٹرسٹ لیا ہوگا اور ایسی سیدھی سادی

لڑکیاں آج کل کہاں کسی کو پسند آتی ہیں۔" میں الجھی تھی۔

"میں کیوں کسی کو پسند نہیں کرسکتی؟ مجھے کیوں کسی میں دلچسپی نہیں ہوسکتی؟ سب کے نزدیک کیا میں احساسات سے عاری لڑکی ہوں؟" اسے تعجب تھا کہ سب ہی ایسا سوچتے تھے۔

"اس لیے کہ تم نے خود کو ایسا بنالیا ہے، تم نے کب کسی کے سامنے جذبات اور احساس کا اظہار کیا؟ تمہیں تو سارا وقت ایک ہی فکر ہوتی ہے کہ کوئی تمہارے اندر جھانک نہ لے، تمہیں کون سی بات بری لگی، کس سے دکھ پہنچا کسی کو پتا نہ چلے۔" خود کو شرمندگی سے بچانے کی سعی میں اس نے لوگوں کو غلط تاثر دے رکھا تھا۔

"یہ تمہارا قصور ہے کہ دنیا تمہیں ویسا نہیں سمجھتی جیسی تم ہو، کسی کو پسند کرنے کی حس اور کسی کو متاثر کرنے کی خوبی سے مزین، ہر لڑکی کی طرح خواہشات اور خواب رکھنے والی لڑکی!" وہ خود آگاہی سے گزر رہی تھی۔ اس نے دیوار کی سمت کروٹ بدلی اور دیوار پر ایک شبیہ ابھری۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

"میری پسند کرنے کی حس اور کسی کو متاثر کرنے کی خوبی ایک ہی انسان سے منسوب نہیں ہوسکتی؟" جواب میں دور تک خاموشی تھی۔ جواب میں اندر دبی چھپی سرگوشیاں تھیں۔

اگلے دن صبح اس نے فرزانہ سے کہہ دیا۔

"کل ھدٰی و بوا کی بات سن لی تھی میں نے۔ انھیں عنبر پسند ہے تو آپ ہاں کہہ کر شادی کا سوچیں۔"

☆☆☆

"وہ جو اس دن گیسٹ آئے تھے۔۔۔ مطلب کیا ہوا اس بات کا۔؟" اس کے انداز میں جھجک تھی۔ وہ سارا راستہ سر جھٹک کر خود سے کہتا آیا تھا 'مجھے کیا!' اور اب رکی باتوں کے بعد پہلا سوال اس کی زبان سے یہ ہی پھسلا۔

"وہ۔" اس نے لفظ کو لمبا کھینچا۔ "آفیشلی تو مجھے گھر میں کسی نے بتایا نہیں......" اس نے وصی کو دیکھنے سے گریز کیا۔ "لیکن خبر یہ ہے کہ انہیں میری چھوٹی بہن عنبرین پسند آئی ہے۔"

"اندھے لوگ!" اس نے بے اختیار کہا۔

ثمرین کو اس کی گہری نظر خود پر محسوس ہوئی ایک پل کو دل کیا جھٹ اس کی آنکھوں میں دیکھے لیکن ہمت نہیں ہوئی۔

"آپ اس بات پر دکھی تو نہیں؟"

"نہیں، اس میں دکھی ہونے کی کیا بات ہے۔"

"اسے اپنا ناپسند کیے جانا برا نہیں لگا تھا، جو بات دل دکھا گئی تھی وہ اس بات پر فرزانہ کا رویہ تھا۔

"امی کا ارادہ انہیں ہاں کہنے کا ہے۔ عنبر کے لیے۔ اگر آپ کو لوگوں سے الرجی نہ ہوتی تو میں ضرور شادی میں انوائٹ کرتی۔" اس نے ذرا سی گردن موڑ کے اسے دیکھا اور پھر سامنے دیکھنے لگی۔

"ویسے اچھا ہی ہوا۔" ثمرین کا دل حلق میں چلا آیا۔ "آپ خود بھی اس بات کے لیے ایکسائیٹڈ نہیں تھیں۔ مجھے یہ بات عجیب لگتی ہے، آپ کیوں ویٹ کریں کہ کوئی آکر آپ کو پسند کرے جب کہ آپ خود بھی کسی کو پسند کرسکتے ہیں۔"

وصی اب اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ ہنس دی۔

"آپ کی کوالٹیز مغرب کی ہیں اور آپ غلطی سے مشرق میں پیدا ہوگئے ہیں۔" وہ بھی ہنس پڑا۔

"آپ جاب اور سٹڈی کو چھوڑیں، اپنے خیالات کی تشہیر کریں تو سوسائٹی میں انقلاب لاسکتے ہیں۔"

"یہ انقلاب تو کب کا آچکا، اب تو پیرینٹس بھی کھلے ذہن اور آزاد خیال ہوگئے ہیں، پسند کی شادیوں کو اپوز نہیں کرتے۔"

"پھر آپ اس انقلاب کا حصہ کیوں نہیں بنے؟" اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

"اس کی وجہ کم سے کم آپ سے تو راز نہیں۔" وہ دھیمے سے مسکرایا۔

"مطلب آپ تمام عمر تنہا رہنے کا فیصلہ کر چکے ہیں؟"

"نہیں، ایسا کوئی خود سے عہد نہیں کیا ہے لیکن کبھی اس کے برعکس بھی محسوس نہیں ہوا۔"

"کہتے ہیں صحیح وقت پر صحیح انسان مل جائے تو ساری سوچیں پلٹ جاتی ہیں، شاید آپ کے ساتھ بھی کبھی یہ ہو۔" کہتے ہوئے وہ خود کو یقین دلا رہی تھی کہ وہ یہ اپنی کیفیت اور جذبات کے زیر اثر نہیں کہہ رہی ہے۔

"کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی کی وجہ سے آپ نے اس لائف اسٹائل کو خیر باد کہنے کا سوچا ہو؟"

"اگر ایسا ہوا بھی تو میرے لیے اس پر قابو پانا مشکل نہیں ہوگا ویسے اب تک ایسا ہوا نہیں ہے۔" وصی نے اسے دیکھتے ہوئے جیسے خود کو باور کرایا اور اس کے اندر 'چیٹنگ چیٹنگ' کی آوازیں گونجنے لگیں۔

"یہ تو خود پر جبر ہوگا۔" ثمرین کی بات پر وہ ٹھٹک گیا۔

"قابو پانا، آزادی اور اپنی مرضی سے جینا تو نہیں اور اگر یہ کرنا ہی ہے تو پھر فیملی کے معاملے میں کیوں قابو نہیں رکھ سکتے خود پر؟"

"آپ مجھے لاجواب کرنا چاہتی ہیں۔" اس نے پہلو بدلا۔

"لیکن میں خود کو جانتا ہوں، یہ جبر نہیں ہوگا کہ وقتی فیلنگز یا امیجوئیشن ساری عمر نہیں رہتے۔"

"ہمم۔" بظاہر ان کی باتوں کے مفہوم الگ تھے اور ایک دوسرے کے جملوں سے ان کے اندر چل رہی گفتگو الگ تھی۔ وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔

"آج پڑوس میں شادی ہے۔" اس نے پرس کاندھے پر لٹکایا اور عادتاً سینے پر پھیلے دوپٹے کا نچلا سرا بائیں شانے پر ڈالا۔

"اس لیے جلدی گھر پہنچنا ہے۔"

"او کے۔" وہ سر اونچا کیے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اللہ حافظ۔" وہ آگے بڑھ گئی۔ وصی اسے جاتے دیکھتا رہا۔

اس کا شادی میں شرکت کا ارادہ نہیں تھا۔ وہ سوچ کر آئی تھی کہ پارک میں زیادہ وقت رکے گی اور آج دیر سے گھر جائے گی۔

سارا راستہ وہ خود سے کہتی رہی، 'وقتی فیلنگز (جذبات) یا امیجوئیشن (سر) ساری عمر نہیں رہتے۔'

شادی میں شرکت کے لیے عنبرین نے آج چھٹی لی تھی اور افضل بھی گھر میں موجود تھا۔ اس نے سر درد کا بہانہ بنا کر انکار کر دیا۔

تنہا گھر میں وہ اپنے پلنگ پر دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھی گہری سوچ میں غرق تھی۔ ہاتھ دائرے کی صورت مڑے گھٹنوں پر رکھے وہ خود کو سمجھا رہی تھی۔

آخر اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ پارک جانا ترک کر دے گی۔ لیکن اس کی نوبت ہی نہ آئی۔ اس دن وصی پہلے چلا گیا تھا ورنہ عموماً وہ پہلے اٹھتی تھی۔ اگلے دو دن وصی نہیں آیا اور اس کے بعد سے ثمرین غائب تھی۔

وہ تنہا بنچ پر بیٹھا تب سے اس کے نہ آنے کی وجوہات پر غور کر رہا تھا۔ اندھیرا ہونے لگا لیکن اس کا اٹھنے کا دل نہیں تھا۔

اسے وہاں موجود دیکھ کر ثمرین نے قدم تیز کیے۔ وہ دور ہی تھی کہ وصی نے اس سمت دیکھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی جو مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیلی وہ خود خفت زدہ ہو گیا کہ یہ کیا بچوں والی حرکت تھی۔

"شکر ہے آپ مل گئے آج......" وہ بنچ پر ذرا سا ٹک گئی۔ "میں روز صرف آپ سے ملنے کے لیے اس وقت آ رہی تھی۔"

وصی کو لگا دل بھی گھبرا کے چپ ہو گیا ہے۔

"کہ آپ کو بتا سکوں، میری شفٹ چینج ہو گئی ہے۔"

"اوہ!"

"اور اندھیرے میں یہاں آنا بے کار ہے۔"

"تو یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔" اس نے بغور اسے دیکھا۔

ثمرین نے جواب نہیں دیا۔ اس نے لاکھ دل

کو ڈانٹا، بہلایا، پھسلایا لیکن وہ ایک آخری ملاقات کے لیے بضد تھا۔

"میں بھی اس لیے دیر تک رکا رہا کہ شاید آپ لیٹ ہوں۔" کہتے ہوئے ہی وہ پچھتانے لگا۔ ثمرین نے پاس آرہی خوش فہمی کو پرے دھکیلا اور ایک دم کھڑی ہوگئی مزید ٹھہرے رہنا، خود کو مزید الجھانا تھا۔

"سو۔" اس نے گہری سانس لی۔

"گڈ بائے۔"

وسی نے کھڑے ہو کر اسے الوداع کہنے کی خواہش کو روکا۔

"آئی ہوپ آپ تھوڑا بولڈ ہو کر سوچیں گی، وش یو گڈ لک۔" وہ رک گیا۔ اچانک اسے اس سے کہنے کی بہت سی باتیں یاد آرہی تھیں۔ "گڈ بائے۔" اس نے اختتام مناسب سمجھا۔

وہ مسکرائی اور جدھر سے آئی تھی اسی سمت چل پڑی۔ وسی نے بے چینی سے پہلو بدلا اور اسے غائب ہونے تک دیکھتا رہا۔

☆☆☆

"تم ذرا پتا تو کرو تمہیں کتنا لون مل سکتا ہے؟" فرزانہ اس کے اور عنبرین کے کمرے میں کم ہی آتی تھیں۔ اس وقت جب وہ کپڑے استری کر رہی تھی، انہوں نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بنا کسی تمہید کے کہا تو وہ چونک گئی۔

"لون کس لیے؟"

"اب جب تم نے بھی کہہ دیا ہے کہ عنبر کے لیے ہاں کر دوں تو اس کی شادی کا تو سوچنا ہو گا ناں۔"

"آپ ان سے پہلے ہی صاف کہہ دیں کہ ہماری استطاعت کتنی ہے۔"

"وہ تو وہ جانتے ہی ہیں۔ ہم اتنا ہی خرچ کریں گے جتنے کا انتظام ہو گا۔ اس لیے پہلے تم ذرا یہ پتا کرو کہ کتنا مل سکتا ہے اور کتنے دن میں ملے گا پھر اس کے بعد ہال یا لان دیکھنا پڑے گا۔ شادی کا سیزن ہو گا، مئی میں تو ابھی سے بکنگ ہو جاتی ہے، مئی سے پہلے پیسے تمہارے اکاؤنٹ میں آجائیں تو ہم مئی کے آخری ہفتوں کی تاریخ رکھ سکتے ہیں۔"

"انتظام جتنا ہے اتنے میں شادی کیوں نہیں، عنبر کی شادی کا قرض میں کیوں ساری عمر اتاروں اور میری شادی کے لیے کون قرض لے گا؟" اسے پوچھنا تھا مگر وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔

"میں ایک دو دن میں جا کر کارنر والی فہمیدہ سے پوچھوں گی ابھی ابھی شادی کی ہے اس نے بچی کی، وہ سارے خرچے بتا سکتی ہے ویسے اب تو 'ویڈنگ پلانر' اور 'ایونٹ مینجمنٹ' والے سارا انتظام کر دیتے ہیں افضل اور عنبر بھی کہہ رہے تھے ان سے ہی کروائیں گے، اس طرح ہمیں کوئی ٹینشن نہیں ہوگی۔"

وہ سب طے کر چکے تھے۔ وسائل تھے نہیں مگر ان تینوں کی سوچ اور طرز زندگی کی سطح بہت اونچی تھی اور وہ اس پر کوئی سمجھوتا کرتے تھے نہ اس سے نیچے اترنے کا ارادہ تھا۔ کمال تو یہ تھا کہ انہیں فکر بھی نہیں ہوتی کہ سب کچھ ان کی من مرضی جیسا ہو تو جاتا تھا۔ اتنے برسوں سے کمانے کے بعد اس کے پاس ایک پیسے کی بچت نہیں تھی جب کہ اس کا کل خرچ زیادہ سے زیادہ تنخواہ کا دس فی صد تھا۔

"عنبر کا فون آیا تھا اسے دیر ہو جائے گی اس لیے وہ فائزہ کے گھر رک جائے گی آج......" اٹھتے ہوئے انہوں نے اطلاع دی۔ "تم ذرا کل یاد سے لون کی ڈیٹیل نکلوالو۔"

وہ چلی گئیں۔ اس نے استری کا پلگ نکالا اور کپڑے یونہی چھوڑ کے دروازہ بند کر کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"رشتے جب پیچ بن جائے تو قربانی، عظمت چھوڑ کے خود کو بچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔" آنسو گالوں سے پھسل کر گود میں گرنے لگے۔

اگلے دن اس کی توجہ کام پر مرکوز نہیں ہو پا رہی تھی۔ کتنی بار اسے ساتھیوں نے ٹوکا۔ جیسے تیسے وقت ختم ہوا تو وہ گھر جانے کے بجائے اسٹیشن پر بیٹھی

ٹرینوں کو آتے جاتے دیکھتی رہی۔ آج اس کا دل کر رہا تھا کہ سب کو چیخ چیخ کر بتا دے اس کے ساتھ گھر والے کیسی زیادتی کرتے ہیں۔ اچانک ہی اس کے اندر سے شرمندگی کا ڈر نکل گیا تھا۔

"ایک بار مجھے بھی بولڈ بن کے دیکھنا چاہیے۔" اس نے فیصلہ کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے دوسرے پلیٹ فارم سے مخالف سمت جانے والی ٹرین میں چڑھنا تھا۔

☆☆☆

وہ اسے دیکھ کر اس بری طرح چونکا کہ لگا اس کا وہم ہے۔ اس نے باقاعدہ آنکھیں میچ کر کھولیں کہ سراب کا فریب بکھر جائے۔ کئی دنوں سے دل پٹڑی سے اترا تھا، اسے لگا اب دماغ بھی دغا باز ہو گیا ہے۔ وہ مجسم اس کے سامنے تھی اور یہ حقیقت تھی۔

"یہ واقعی آپ ہیں؟" وہ متحیر سا قریب آیا۔ اسے دیکھتے ہی کھل اٹھے دل کو نظر انداز کرتا اونچی آواز میں کہہ رہا تھا۔

وہ خفیف سا مسکرائی۔ اس نے یہاں آ کر ایورسٹ سر کرنے جتنا مشکل کام کیا تھا اور اب ایک اور ایورسٹ سامنے تھا۔

"اب یہ بھی بتا دیں ایڈریس کیسے ملا؟" اس نے کامیاب کوشش کی کہ اس کا چہرہ "کھل اٹھی ہے کلی کلی" کی تفسیر نہ بننے پائے۔

"ہاسپٹل رجسٹریشن۔"

"اوہ!" اس نے صرف نام اس کا لکھا تھا باقی تفصیل اور پتا، فون نمبر سب کچھ اپنا لکھا تھا۔ فائل پر بھی وہی درج تھا۔

"آئیں اوپر چلتے ہیں۔"

"یہیں بیٹھتے ہیں۔" وہ بچوں کے پلے گراؤنڈ میں جھولے پر بیٹھی تھی اور اسے دیکھتے ہی اٹھ کر اس کے پاس آئی تھی۔

"او کے۔" رات ہو چکی تھی اس لیے وہاں بچے نہیں تھے۔

بچوں کی مناسبت سے رکھا اکلوتا بنچ اتنا مختصر تھا کہ دونوں ایک ساتھ اس پر بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ اس نے وہی جھولا سنبھالا تو وصی فاصلے پر رکھے بنچ پر بیٹھ گیا۔

"آپ کب سے ویٹ کر رہی تھیں؟ میں آج لیٹ ہو گیا ہوں۔"

"اب آ تو گئے۔" اس نے جواب گول کیا۔

وہ پیر زمین پر ٹکا کے جھولا روکے نیچے دیکھ رہی تھی اور وہ پر سوچ اور سنجیدہ ثمرین کو۔ جینز پر لمبی لکھنوی کرتی، پریشانے پر پھیلا دوپٹا پیچھے زمین کو چھو رہا تھا۔ بال بھی تھک کے لاپروا ہو گئے تھے، جہاں سے من کیا نکل کر چہرے کے گرد بے دم پڑے تھے، اس کا صبیح چہرہ اندرونی کشمکش کا مظہر تھا۔ کچھ دیر وہ یک ٹک اس کے ہلتے جھمکے کو دیکھتا رہا پھر اپنی محویت پر خود ہی ٹھٹک کر پہلو بدلا۔ اتنے دن سے خود کو سمجھا بجھا کے راستے پر لایا تھا اور اب وہ سامنے تھی۔

"کیا بات ہے؟" وصی نے پہل کی۔

"میرے رشتے بھی کچے ہیں......" اس نے وضع بدلے بنا جواب دیا۔ "اور مجھے خود کو بچانا ہے۔" اس نے سر اونچا کیا۔

"گڈ۔" اس نے جوش سے کہا۔ اسے واقعی سن کے خوشی ہوئی تھی۔

"میں کسی کو چھوڑ نہیں رہی نہ دور جا رہی ہوں لیکن میں نے بھی اپنی مرضی اور پسند سے جینے کا فیصلہ کیا ہے۔" وہ دھیمے سے مسکرائی اور وصی کو اس کا تبسم بہت پراسرار لگا۔

"میں نے آپ کو کچھ سکھایا نہیں لیکن اس وقت میں پراؤڈ ٹیچر کی طرح محسوس کر رہا ہوں۔" وہ دھیرے سے ہنسا۔ وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔

"میں یہ ہی کہنے آئی تھی۔" وہ بھی اٹھ گیا۔

ثمرین کو علم تھا کہ یہ آسان نہیں لیکن اب قطعی ناممکن لگ رہا تھا۔ اسے اچانک اپنا یہاں آنا بے وقوفی لگا۔ اس میں ہمت تو آئی تھی مگر اب بھی کم تھی۔

"گھر پہنچتے بہت دیر ہو جائے گی، میں چلتی ہوں۔"

وصی الجھ کے اسے دیکھنے لگا۔ "وہ صرف یہ بتانے آئی تھی؟"

"شاید پھر کسی دن پارک میں ملاقات ہو۔" اس کے ساتھ چلتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔

"آپ کی شفٹ دوبارہ کب چینج ہوگی؟" وصی نے پوچھ ہی لیا۔

"اس کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ کبھی بھی بدل جاتی ہے کبھی کبھی تین چار ماہ ایک ہی شفٹ ہوتی ہے۔" اس کے سوال پر بہکا دل پھر مچلا کہ پوچھو "کیوں پوچھ رہے ہو، کیوں ملنا چاہتے ہو، تمہیں تو اپنا اکیلا پن عزیز ہے۔" لیکن اس نے جانا کہ وہ ابھی اتنی بہادر نہیں ہوئی تھی۔ اس کی مجبوری والی خواہش اسے روک رہی تھی۔

جیسے ہی وہ گیٹ پر آئے، رکشا بھی سامنے آگیا۔ وصی نے آواز دے کر روکا۔

"مجھے سچ میں بہت اچھا لگا کہ آپ نے خود کو پرائریٹی بنایا اور یہ غلط نہیں ہے، کبھی اس بات پر خود کو دوش نہ دیجیے گا، نہ کبھی اس پر شرمندہ ہونا ہے۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"ہوں۔" وہ مسکرائی۔

"اللہ حافظ۔" وہ رکشا کی طرف بڑھی۔ درمیانی ڈنڈا پکڑ کر وہ اندر بیٹھنے جارہی تھی کہ ہاتھ ہٹا کر پلٹی۔

"آپ کو یاد ہے آپ نے کہا تھا آپ بولڈ ہیں؟"

"ہاں۔"

"میں سوچ کر آئی تھی کہ آج سے میں بھی بولڈ بن کے جیوں گی۔۔۔" وہ آواز سنبھالنے رکی اور وصی اس کے چہرے میں کھو سا گیا۔ "لیکن میں شاید بھی اتنی بولڈ نہ ہوسکوں۔" وہ اندر بیٹھی اور رکشا چل پڑا۔

وصی بت بنا وہیں جم گیا۔ اس کے الفاظ کو معنی اس کی بھیگی آنکھوں نے دیے تھے، وہ معنی جس کے لیے اس کے اندر ایک جنگ چھڑی تھی، جہاں اپنی شکست ٹالنے کے لیے وہ ڈٹا تھا۔

اس بت میں جان فون کی رنگ نے ڈالی۔ بڑے بھیا اسے کبھی فون نہیں کرتے تھے اس لیے اس نے نظر انداز کرنے کے بجائے اٹھالیا۔

"کہاں ہو تم؟ گھر پہنچ گئے یا راستے میں ہو؟"

"گھر پر ہوں۔"

"ہاسپٹل آسکتے ہو ابھی؟"

"کیا ہوا ہے؟" اس نے لابی کی سمت قدم بڑھاتے ہوئے یونہی پوچھ لیا۔ اس کا ارادہ اس وقت کہیں جانے کا نہیں تھا۔

"خوشی کو ایڈمٹ کیا ہے۔" وہ رک گیا۔

"اب کیا ہوا ہے؟"

"کئی دن سے نرم گرم چل رہی تھی تم آجاؤ تو بتاتا ہوں، وہ بھی تمہیں یاد کررہی ہے۔"

وہ واپس گیٹ کی سمت پلٹ گیا۔

اس کی پسند کی چیزیں لے کر وارڈ میں پہنچا تو وہ اسے دیکھتے ہی اٹھ بیٹھی۔ بھیا کے علاوہ وہاں کوئی نہیں تھا۔

کچھ دیر اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کیں جب اس پر غنودگی سوار ہونے لگی تو اسے بہلا کر لٹا دیا۔ ذرا دیر میں ہی وہ سوگئی۔ وہ باہر آیا تو بھیا ایک طرف بیٹھے تھے۔

"رات میں آپ ہی رکیں گے یا امی شفیع کوئی آرہا ہے؟"

"میں ہی ہوں۔" وہ کچھ فکر مند نظر آرہے تھے۔

"بیٹھو۔" وہ اسے کہتے خود بھی بیٹھ گئے۔ وہ کبھی اس طرح بات نہیں کرتے تھے نہ ان میں یوں بے تکلفی اور دوستی تھی کہ بٹھا کر کچھ کہتے۔

"میں نے گھر میں کسی سے کہا نہیں ہے، تمہیں بھی پتا ہوگا تمہاری بھابھی کی ڈلیوری کبھی بھی ہوسکتی ہے۔ بار بار بخار کی وجہ سے ڈاکٹر نے خوشی کے کچھ ٹیسٹ کروائے ہیں اس کا کہنا ہے کہ۔" وہ رک گئے۔

"کیا؟"

''خوشی کو کینسر بھی ہو سکتا ہے۔''

''وصی! او وصی! تم سن رہے ہو؟'' وہ واپس ہوش میں آیا تو بھیا اس کا شانہ ہلا رہے تھے۔ جانے کتنے پل اس کی کتابِ زندگی سے محو ہو گئے تھے۔ وہ جانے کتنے وقت کے لیے مکمل سکوت میں تھا جہاں کوئی آواز نہیں تھی نہ اس کے سانس کی نہ اس کے دل کی، اس کا وجود جیسے گم ہو گیا تھا، وہ کچھ دیر کے لیے کہیں نہیں تھا۔

''یہ کب ہوا؟'' اس کا خود سے پہلا سوال تھا۔ خوشی اس کے لیے اتنی اہم کب ہو گئی تھی؟

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اتنے چھوٹے بچے کو کیسے اتنی بڑی بیماری ہو سکتی ہے؟''

بھیا کہہ رہے تھے اور اس کے پاس انہیں دینے کو نہ تسلی تھی نہ امید۔ بھیا کے لیے بھی یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس سے کوئی اہم بات، اپنی پریشانی اور فکر بانٹ رہے تھے۔

''ہم انسانوں کو بھی ایک اینکر کی ضرورت ہوتی ہے جس کے بنا ہمارا وجود یہاں وہاں آوارگی سے ڈولتا، بے وزن، بے معنی ہوتا ہے، ہم کہیں استقامت سے جم جائیں تبھی آس پاس موجود رشتے، لوگ، محبتیں دکھائی دیتی ہیں، محسوس ہوتی ہیں، اور ہمیں یہ مقام اور مضبوطی دینے والا اینکر فیملی ہی ہوتی ہے، ہمیں فکس اور مضبوط رکھنے والا اینکر۔'' اس کے کانوں میں آواز گونجی۔

''زندگی کے رنگ روشنی اور احساس ہمارے وجود کے کسی سے منسلک ہونے سے ہیں۔ تنہا وجود جتنے بھی دعوے کرے وہ خود سے جھوٹ کہتا ہے۔ یہ دنیا کا اصول ہے کوئی چیز اپنی ذات میں مکمل ہوتی ہے نہ پھلتی پھولتی ہے، ایک بیج کو بھی مٹی، ہوا، پانی چاہیے۔ معمولی ذرے کو بھی زمین پر رہنے کے لیے کشش ثقل، اڑنے کے لیے ہوا یا کہیں پڑے رہنے کے لیے سطح۔ وجود بنا منحصر ہوئے ممکن ہی نہیں۔''

لمحوں میں اس کی ہستی ڈول گئی تھی۔ عمر بھر گلے سے لگایا فلسفہ دور کھڑا اجنبی محسوس ہو رہا تھا۔ بھیا کا فون بجا تو وہ چونکا۔

''آپ گھر جائیں میں رکتا ہوں یہاں۔'' اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا اور بھیا نے تعجب سے اسے دیکھتے ہوئے فون کان سے لگا لیا۔

بھیا کے جانے کے بعد وہ کمرے میں آیا۔ نیند میں ڈوبی خوشی کو دیکھتے ہی پہلی بار اس کے دل نے بے اختیار پکارا۔

''میرا بچہ!''

وہ قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ آہستہ سے خوشی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اچانک اس کے تصور میں وہ ہاتھ سرد اور بے جان ہوا اور اس نے تڑپ کے اسے لبوں سے لگا لیا۔

''یہ خون کی کشش ہوتی ہے، آپ جن کے ساتھ رہتے ہیں ان سے جذباتی طور پر اٹیچ ہوتے ہیں، انسان بنا جذبات اور احساسات کے ہو تو وہ انسان نہیں مشین ہو گا۔'' اس کے کانوں میں کوئی کہہ رہا تھا۔

''تو میں مشین نہیں!'' اس نے خوشی کا ماتھا چھوا۔

اپنے آرام پر کسی قیمت سمجھوتا نہ کرنے والا اس رات کرسی پر سویا۔ اگلے دن اس نے چھٹی لی تھی۔

☆☆☆

اپنی زندگی کا اتنا اہم اور بڑا فیصلہ اس نے اپنی بھلائی اور خوشی کی خاطر کیا تھا لیکن تب سے اس پر اداسی چھائی تھی۔ وہ اس ارادے سے گئی تھی کہ وصی کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار اور اعتراف کر کے خود سے ایمانداری کا ثبوت دے گی۔ وہ انکار کرتا، رد کرتا، حیران ہوتا یا مذاق اڑاتا، اسے سب منظور تھا۔ وہ کوئی ملال نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ یہ اس نے اسی سے سیکھا تھا کہ اپنے بارے میں سوچنے پر نادم نہیں ہونا چاہیے لیکن اس کے سامنے پہنچ کر وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ یہ نسوانی جھجک اور حیا تھی یا اپنے رد ہونے کا خوف یا اس کی نگاہوں میں تمسخر نہ برداشت کرنے کی سکت، جو بھی تھا وہ بنا کہے لوٹ آئی تھی۔

اس نے طے کیا کر لیا تھا وہ گھر والوں کو اپنی چادر کے مطابق پیر پھیلانا سکھائے گی۔ اس کے لیے ضروری تھا وہ انہیں اپنی چادر میں نہ لیتی۔ اس نے جان لیا تھا کہ اپنوں کی آسائشوں اور خواہشوں کے لیے اپنا آپ برباد کرنے کو عظیم کام سمجھنا خود کے ساتھ اعلیٰ درجے کی بد دیانتی ہے۔ اپنوں کا ساتھ دینا، انہیں سہارا دینا فرض اور اخلاق کا تقاضا سہی مگر یہ اپنی ذات کی نفی کر کے نہیں ہونا چاہیے۔

وہ چوں کہ اب دیر سے آتی تھی سو اس کے گھر پہنچنے تک سب کا کھانا ہو جاتا تھا۔ وہ ضروریات سے فارغ ہو کر اپنے لیے کھانا نکال کر کمرے میں جا رہی تھی کہ فرزانہ نے ٹی وی کی آواز کم کرتے ہوئے اسے روکا۔

"لون کا پتا کیا تم نے؟" افضل اس وقت موجود نہیں تھا۔ عنبرین ایک طرف فون لیے بیٹھی تھی وہ بھی اسے دیکھنے لگی۔

"میں لون نہیں لوں گی امی۔"

"کیوں؟" وہ جو گاؤ تکیے پر کہنی ٹکائے تھیں، ایک دم اٹھ بیٹھیں۔

"پہلے تو اس کی ضرورت نہیں ہے پھر پرسنل لون کا انٹرسٹ ریٹ بہت زیادہ ہوتا ہے، میں نے ابھی لے لیا تو آگے کسی ایمرجنسی کے لیے ملنا مشکل ہوگا۔"

"اب بھی تو ایمرجنسی ہے۔"

"جتنا ہمارے پاس ہے اس میں بھی شادی ہو سکتی ہے اور سادگی سے کریں تو اس کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔"

"تم کرنا سادگی سے شادی......" عنبر نے تیزی سے کہا۔ "مجھے نہیں شوق ایسی پھیکی شادی کا۔"

"تو پھر خود انتظام کر لو، میں لون نہیں لوں گی۔" وہ رکی نہیں اور کمرے میں چلی گئی۔

"امی! کیا ہو گیا ہے اس کو؟ کہیں یہ بالا ہی بالا کسی کو پسند تو نہیں کر چکی اور ہمیں اس کے چکر کی خبر ہی نہیں؟" عنبرین کی بات پر اس نے نوالہ بناتا ہاتھ کھینچ لیا۔

"میں تو خود حیران ہوں۔" وہ واپس لیٹ گئیں۔

"تم ٹینشن نہ لو میں کرتی ہوں پھر اس سے بات، سمجھاؤں گی تو سمجھ جائے گی۔" انہیں اس بیٹی کی فرماں برداری پر بڑا ابھروسا تھا۔

ثمرین کا دل کیا پلیٹ واپس باورچی خانے میں رکھ دے لیکن پھر گہرا سانس لے کر چھوڑا ہوا نوالہ اٹھایا۔ جب طے کر لیا تو ان سب کے ساتھ خود کو مضبوط رکھنا بھی سیکھنا ہی تھا۔

رات میں شاید افضل کو بھی اس کی خودسری اور بغاوت کی خبر دے دی گئی تھی کہ صبح وہ تینوں ہی اس سے کھنچے کھنچے سے تھے۔ وہ تیار ہو رہی تھی اور فرزانہ باورچی خانے میں نہیں گئیں ورنہ اس شفٹ میں وہ نو بجے ٹفن تیار کر دیتی تھیں۔ اس نے خود بھی بھاگتے دوڑتے کچھ بنانے کا تردد نہیں کیا اور نکل گئی۔

☆☆☆

صبح ریحانہ اسپتال آئیں۔ انہیں لگا تھا وہ دفتر جائے گا۔ اس نے انہیں واپس بھیج دیا۔ جتنی دیر وہ رکی رہیں ان کے پاس بہو کے نخرے اور اب یہ زائد خرچ کا بوجھ ہی موضوع تھا۔ ان کے مطابق یہ بھابھی کی لاپروائی تھی جو خوشی بار بار بیمار ہو رہی تھی۔ وہ خاموشی سے سب سنتا رہا۔

خوشی چاچو کے اتنی دیر اس کے پاس رکنے پر بے انتہا خوش تھی اور چاچو تڑپ کے دعا کرتے ہوئے بے صبری سے اس کی ٹیسٹ کے نتائج کے منتظر تھے۔

اللہ اللہ کر کے شام میں نرس نے رپورٹ آنے کی خبر دی اور کہا کہ ڈاکٹر خود بلا کر بتائیں گے۔ اس کا دل بیٹھنے لگا، یہ اس کا پہلا تجربہ تھا۔ صبر نہیں ہوا تو اس نے بھیا کو فون کر کے بلایا۔ ظاہر ہے ڈاکٹر ان کی موجودگی میں ہی بتاتا۔

ڈاکٹر کے کیبن میں جاتے ہوئے اسے لگا اس کی ٹانگیں کانپ رہی ہے۔ یہ کمزوری، یہ خوف اسے ایک دم اپنے معمولی اور عام ہونے کا احساس کرا گیا

تھا۔ اس نے کبھی اتنی دعائیں نہیں مانگی تھیں جتنی کل رات سے اب تک مانگ لی تھیں۔ خوشی کو کچھ ہو جائے یہ خیال ہی جان لیوا تھا اور پہلی بار اس کا واسطہ 'جان لیوا' سے پڑا تھا۔

اور جب ڈاکٹر نے کہا کہ خوشی کی رپورٹ کینسر کے لیے نیگیٹو ہے تو اسے لگا وہ رو دے گا۔ بھیا ڈاکٹر کا شکریہ ادا کر رہے تھے اور وہ خود کو چھپاتا اٹھ کر باہر چلا گیا۔ چاچو نے پہلی بار اسے بستر پر کھڑا کر کے گلے لگایا تو خوشی بھی کچھ دیر کے لیے گھبرا گئی۔

"کیا ہوا چاچو؟" اس کی بھی آواز پر اس نے خود سے الگ کیا۔

"تمہیں ڈاکٹر نے گھر جانے کہا ہے۔" وہ نم سی آنکھوں سے مسکرایا۔

"ہررے!" وہ اچھل کر تالی بجانے لگی۔

"ہم دو کورنیٹو لیں گے اور کرکرے اور پیسٹری بھی کھانا ہے اور......" اس نے انگلیوں پر گننا شروع کیا اور وہ ہنس رہا تھا۔

☆☆☆

دفتر سے واپسی پر قدم اور دل ہمک ہمک کے پارک جانے کو بے تاب تھے مگر وہ اس اسٹیشن پر اتری نہیں۔

"ضروری نہیں وہ اب تک وہاں بیٹھا ہو۔ ہم پھر اجنبی ہیں اور اب تو اس دنیا کی بھیڑ میں گم اجنبی۔" اس نے ٹرین کی کھڑکی سے سر ٹکا کے سوچا۔

"مجھے ہاسپٹل کی فائل گم کر دینی چاہیے۔" اس پر درج فون نمبر اسے بار بار لالچ دلاتا تھا۔

شدّو بوا آ گئیں تب وہ کھانے کے بعد نماز کی تیاری کر رہی تھی۔ ان کی باتوں پر دھیان نہ دیتے ہوئے بھی ان کی باتیں کانوں میں پڑ رہی تھیں۔

"میں تو تمہارا جواب دینے گئی تھی لیکن آگے سے انہوں نے ثمرین کی ہی بات کی تو میں چپ ہو گئی۔"

"بوا تم نے ہی کہا تھا کہ انھیں عنبر پسند آئی ہے۔" فرزانہ کو غصہ آ گیا۔

"لڑکے کو عنبر ہی پسند تھی لیکن باپ اور بھائی نے سمجھایا اسے دبئی جانا ہے تو وہاں ثمرین کو نوکری جلدی مل جائے گی اور جانے کیا کیا تب وہ مانا۔ یہ اس کی ماں نے بتایا مجھے۔"

وہ دوپٹا لے کر باہر آ گئی۔

"ارے تم ہو گھر میں، فرزانہ نے کہا تھا لیٹ آتی ہو۔" گھر والے عنبرین کو پسند کیے جانے پر اس کے احساسات سے بے پروا تھے لیکن شدّو بوا کو اچھا نہیں لگا کہ اس نے یہ سن لیا۔

ثمرین نے فرش پر دیوار سے ٹک کر بیٹھی عنبرین کو دیکھا جو بظاہر فون میں گم تھی لیکن چہرے کے تاثرات سخت پر بھی لیے تھے۔

"شدّو بوا!" اس نے انہیں دیکھا۔

"آپ انہیں منع کر دیں۔ مجھے دبئی نہیں جانا۔"

"ہیں! دبئی نہیں جانا۔" ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔

"ایسے رشتے روز ملتے ہیں بھلا جو یوں منہ اٹھا کے انکار کر رہی ہو؟" انہیں اپنے لائے اتنے قابل رشتے پر یوں دو ٹکے کا جواب بہت برا لگا۔

"میں انکار کر رہی ہوں، آپ کو کیا کرنا ہے دیکھ لیں۔" وہ سب کی آنکھیں خود پر محسوس کرتی وہاں سے چلی گئی۔

"بوا! تم اب تو عنبر کی بات کر سکتی ہو نا۔" فرزانہ کہہ رہی تھیں۔

"یہ ہی کہہ دو کہ بڑی کو دبئی نہیں جانا۔ چھوٹی کو کوئی مسئلہ نہیں ہے، کہیں بھی لے جائیں۔"

اس نے دروازہ بند کر لیا تھا۔ اسے ادھر ہو رہی گفتگو میں دلچسپی نہیں تھی۔

☆☆☆

بال بناتے ہوئے وہ ایک دم رک گیا۔

"کب تک جھوٹے بہلاوے دو گے خود کو؟" اس نے خود کو سرزنش کی تاہم اس کے اندر کا آزاد وحشی اب بھی پسپائی قبول کرنے میں متامل تھا۔

وہ بھیگی نگاہیں اور چہرہ، بھولنے والے تھے نہ بھولے تھے۔

اس نے برش رکھا اور پرفیوم اٹھایا تو نظر سنڈوکو کی کتاب پر پڑی۔ کتنا وقت ہو گیا اس نے اسے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ کبھی اس کا ذہن خالی نہ ہوتا جو وقت گزاری کے لیے تفریح کی حاجت محسوس ہوتی اور کبھی اٹھا بھی لیتا تو ہمیشہ لطف دینے والی مشق کرتے ہوئے اسے اکتاہٹ محسوس ہوتی تھی۔

"اس کی وجہ۔۔۔" کھڑکیاں ایک ایک کر کے کھلنے لگی تھیں کہ اس کے جھٹ بند کر دیں۔

تیار ہونے کے بعد خواب گاہ اور باورچی خانے کی کھڑکیاں بند کرتے ہوئے وہ ہال میں آیا۔ بیگ اٹھاتے ہوئے کان میں ثمرین کی بات سنائی دی۔

"میں سوچ کر آئی تھی آج سے میں بھی بولڈ بن کے جیوں گی۔"

وہ بیگ چھوڑ کے صوفے پر گر سا گیا۔ اس دن کی اس کی پیش قدمی اور کشمکش ہر گزرتے دن کے ساتھ اسے اور شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ اپنی کوتاہ عملی کا تدارک اسے ہی کرنا تھا۔

"کیا میں واقعی بولڈ ہوں؟ اپنی فیلنگز جھٹلا رہا ہوں، اس کی اہمیت نظر انداز کر رہا ہوں، اس سے بچ رہا ہوں، سب جانتے ہوئے انجان ہوں۔" خود احتسابی بھی حوصلہ طلب کام ہے جو آج اس سے سرزد ہو ہی گیا۔ اس نے پیچھے سر گرا کے آنکھیں بند کیں۔

"سب سے بڑی بہادری سچائی قبول کرنا ہوتی ہے اور سچ یہ ہے تمہیں اس بیچ کے اجنبی نے مکمل بدل دیا ہے۔"

☆☆☆

وہ پلیٹ فارم سے نکل کر رکشا اسٹینڈ کی طرف جا رہی تھی کہ ایک دم کوئی سامنے آیا، وہ رک گئی۔ جانی پہچانی خوشبو نے جھٹ سر اونچا کرنے پر مجبور کیا۔ مقابل وصی مسکرا رہا تھا۔

"یہ میں ہی ہوں۔" اس کی حیرت کم کرنے

اس نے اس دن اپنے کہے جملے کو تھوڑا تبدیل کیا۔ وہ بیچ راستے میں تھے۔ لوگ ان کے چاروں طرف سے گزر رہے تھے۔

"یہاں کیسے؟ کسی کام سے آئے تھے؟" اس نے پہلے قدم پر ہی خوش فہمی کا گلا گھونٹا۔

"ہوں۔"

"واپس جا رہے ہیں۔" اس کا رخ پلیٹ فارم کی سمت تھا اور ثمرین کا باہر کی طرف۔

"نہیں، ویٹ کر رہا تھا۔ آؤ، ہم راستے میں ہیں۔" اس نے کہا تو وہ آگے بڑھی وصی بھی اس کے ساتھ چلنے لگا۔

"آپ کب سے ہیں یہاں؟" پارک میں آنے کے وقت سے اسے اس کے دفتر کے اوقات کا اندازہ تھا۔

"اب تو آپ مل گئی ہیں۔" جانے وہ جان بوجھ کر اس دن جیسے جملے بول رہا تھا یا یہ بے ساختہ زبان سے پھسل رہے تھے۔

"آپ پھر پارک گئیں کسی دن؟"

"نہیں، اس وقت واپسی ہوتی ہے تو کیسے جا سکتی ہوں۔" اس وقت دس بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔

"آپ کی ٹائمنگ چینج نہیں ہوتی، آپ روز جا کے یکسوئی سے سنڈوکو فل کر سکتے ہیں۔"

"اب وہاں سنڈوکو میں مزا نہیں آتا۔ ویسے آپ نے غور نہیں کیا میں نے وہاں سنڈوکو کھیلنا کم کر دیا تھا۔"

ثمرین دل کو سنبھالتی چپ رہی۔ وہ رکشے کے لیے لگی قطار سے آگے نکل آئے تھے۔

"اس دن گھر آتے ہوئے کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی تھی؟"

"نہیں، کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔" وہ کیا بتاتی وہ کس قدر شکست خوردہ اور مایوس گھر پہنچی تھی۔ خود کو 'بولڈ' ثابت کرنے کی ناکامی معمولی نہیں تھی۔ کچھ فاصلہ انھوں نے خاموشی سے طے کیا۔

"کچھ دن پہلے۔" آخر اس نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ "خوشی ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھی، خوشی میری پانچ سال کی بھتیجی ہے۔" ثمرین نے تشویش سے سنجیدہ وصی کو دیکھا۔ "پچھلے کئی مہینوں سے بار بار فیور اور طبیعت خرابی کی بنا پر ڈاکٹر نے بہت سارے ٹیسٹ کروائے تھے اور بھیا نے جب مجھے بتایا کہ ڈاکٹرز کو کینسر کا شبہ بھی ہے تو۔۔۔" وہ چپ ہو گیا۔ اپنی وہ کیفیت اور احساس سنانے کا پہلا موقع تھا جن سے وہ اب تک انکاری تھا۔ "اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ خوشی جانے کب سے میرا اینکر ہے۔"

اسے سن کر خوشی ہوئی مگر ذہن کینسر میں اٹکا تھا لہٰذا فوراً پوچھ لیا۔

"ٹیسٹ رزلٹ کیا آئے؟"

"الحمدللہ، ایسا کچھ نہیں ہے، اس کی امیونٹی کم ہے اور عام سا انفیکشن تھا کوئی۔"

"اوہ۔" اس نے طمانیت بھرا سانس لیا۔

"شکر ہے، اس کے ٹھیک ہونے کا اور آپ کو احساس ہوا، اس کا بھی۔"

"تمہیں پتا ہے میں آج یہاں کیوں آیا؟"

وہ چلتے چلتے اس کے سامنے آ گیا۔ وہ گرتے گرتے بچی، وجہ جانے اس کا اسے یوں روکنا تھی یا اس کا نیا تخاطب۔

"میں بولڈ تھا یا نہیں لیکن میں بزدل نہیں کہلوانا چاہتا۔" آج اس کی آنکھیں بدلی سی تھیں ان گہری نظروں میں جھجک نہیں تھی۔

"مجھے پتا نہیں چلا کب مجھ میں خوشی سے انسیت اور لگاؤ جاگا یا وہ میرے لیے اتنی اہم ہوئی کہ اس کی بیماری کا سن کے کچھ دیر کے لیے مجھ سے سب چھن گیا تھا، میری مرضی، آزادی، اپنی پسند کی زندگی، لوگوں سے دوری کسی کی اہمیت نہیں رہی تھی اور تب مجھے تمہارے 'اینکر' کا مطلب سمجھ آیا۔ احساسات اور خوشیاں تنہا انسان کے بس کی نہیں، کچھ وقت کے لیے اس خیال کو بہلایا جا سکتا ہے مگر سچ یہ ہی ہے، جب تک ہمارا دل کسی سے بندھ کے، مضبوطی سے ایک مقام پر ٹھہرا نہ ہو، زندگی کی اصل خوب صورتی پتا نہیں چلتی۔ خون کی کشش، خلوص کی کشش، جذبوں کی کشش یا دل کی کشش ہم ان سب کو گلے لگا لیں یا کسی ایک کو، ہمارے زندگی کو معنی اور خوشی ان ہی سے ملتے ہیں۔"

"مجھے اچھا لگا کہ آپ یہ بات جان گئے۔"

کاش کوئی اس وقت جان پاتا وہ دل و دماغ، زبان، آنکھیں، آنسو، جذبے، سب کچھ کیسے سنبھالے تھی!

"لیکن اب بھی میری لوگوں سے الرجی ختم نہیں ہوئی ہے۔" اس کا لہجہ بدلا سا تھا۔ "تم سے الرجی تو کبھی نہیں رہی لیکن تمہاری کشش سے انکار کروں تو یہ صرف جھوٹ نہیں میرے بولڈنیس کے دعوے کا مذاق ہوگا۔"

ثمرین کو احساس ہوا کہ وہ سر جھکائے گلابی ہو رہی ہے۔

"چھوٹی سسٹر سے پہلے بڑی کی شادی رواج بھی ہے اور درست بھی، اس لیے سوچا تمہاری امی سے کہوں دونوں تیاریاں ایک ساتھ کر لیں۔"

وہ جوتے سے مٹی پر لکیر کھینچ رہی تھی۔ فوراً کچھ کہہ نہ پائی۔ اپنوں کی اہمیت جاننے کے باوجود بھی اسے اصل خوشی اپنی اہمیت قبول کرنے کے بعد ہی ملی تھی۔ وہ بھی خاموش اس کے بولنے کا منتظر تھا۔

"چلیں۔" دھیمی سی آواز میں بالآخر اس نے کہا۔

"کہاں؟"

"گھر، امی سے کہنے۔" وہ اب بھی نیچے ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ سامنے سے ہٹ گیا۔

"چلو۔"

جب وہ دونوں گھر میں داخل ہوئے تو عنبرین اور فرزانہ منہ کھولے انہیں دیکھے گئیں۔

"امی! یہ وصی ہیں، آپ سے ملنا چاہتے تھے۔" اس نے تعارف کروایا۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔ آؤ آؤ بیٹھو۔" گندمی رنگت

والے اس خوبرو جوان کی شخصیت متاثر کن تھی تو بیٹی کا اعتماد حیران کن۔

وہ انہیں ہال میں چھوڑ کے کمرے میں آئی تو پیچھے عنبرین بھی تھی۔

"تو اس لیے تمہیں دبئی نہیں جانا تھا؟" اس کی آواز تیز تھی۔

"ہاں۔" اس کا اطمینان قابل دید۔

"اب لون لو گی تم؟" یہ طنز تھا۔

"نہیں، اپنی استطاعت کے مطابق ہی شادی کروں گی۔"

"کیا کرتے ہو بیٹا؟" باہر تک آرہی آوازوں پر بخت زدہ فرزانہ نے اس کا دھیان بٹایا۔

☆☆☆

"ایسا کیا ہے وہاں جو مجھ سے زیادہ دلچسپ ہے؟" وہ بڑے انہماک سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی جب وصی پیچھے آکر کھڑا ہوا۔

"اتنا پیارا گارڈن بنایا ہے لیکن ایک ڈھنگ کا بنچ نہیں رکھا۔" وہ نیچے بچوں کے پلے ایریا کو دیکھ رہی تھی جہاں خوشی، دادی کے ساتھ جھولا جھولنے گئی تھی۔ پہلی بار چھٹی میں وہ خوشی کو اپنے پاس لے آیا تھا۔ آج ریحانہ اسے واپس لے جانے آئی تھیں۔

"وہ بالکل صحیح بنچ ہے۔" وصی نے پیچھے سے بازو ڈال کر اس کے کاندھوں کے گرد نصف حلقہ بنایا۔

"ہم دونوں بیٹھ جائیں تو وہاں ہوا گزرنے کی بھی جگہ نہ ہو۔"

"ہمم، اور بلڈنگ والوں کو اپنی کھڑکیوں سے مفت کے مزے لینے کا موقعہ ملے۔" ثمرین کو اس کا خیال پسند نہیں آیا۔

"اتنی وائلڈ امیجینیشن!" اس نے شرارت سے کہا۔

"آپ جیسا الرجک اور اکیلا انسان اچانک ایک لڑکی کے ساتھ یوں نظر آئے تو لوگوں کو تجسس تو ہوگا ہی۔"

"واچ مین نے اب تک ساری بلڈنگ کو خبر کر دی ہوگی ہماری شادی کی۔" وصی نے جھک کے تھوڑی اس کے شانے پر ٹکائی۔

"میں نے صرف ڈھنگ کے بنچ کی بات کی ہے، کب کہا مجھے وہاں جانا ہے؟" وہ اس کے ہاتھ ہٹا کر پلٹی اور الماری سے کپڑے نکالنے لگی۔

"اب مجھے گھر کے مقابلے میں کوئی بنچ کوئی گارڈن اچھا نہیں لگتا۔" اس نے اعتراف کیا۔

"ہاں آپ کو سُنڈوکو کے لیے جانا ہے تو شوق سے جائیں۔" اس نے سنجیدگی سے سادہ سی بات کی۔

"یار! یہ بتاؤ لاسٹ کب مجھے وہ حل کرتے دیکھا؟"

"نہیں دیکھا اسی لیے تو کہہ رہی ہوں، میری وجہ سے وہ شوق مس نہ کریں۔" اس نے کپڑے نکال کر استری اسٹینڈ پر رکھے۔

"میں نے اب تک جو مس کیا تھا، اب وہ انجوائے کررہا ہوں۔" وہ اس کے پاس آیا۔

"اور کیا ہے وہ؟" استری کا پلگ لگاتے ہوئے وہ مسکرائی کہ جواب تو اسے بھی پتا تھا۔

"اپنی زندگی اور گھر میں کسی کی موجودگی۔" وصی نے اس کا رخ اپنی طرف کیا۔

"اور یہ جو میرے سامنے پہیلی ہے اسے روز تھوڑا تھوڑا بوجھنا آج کل میرا شوق ہے۔"

"تو آج کیا بوجھا؟"

"کہ سب جانتے ہوئے بھی اس پہیلی کو ہم سے سننے کا شوق ہے۔" اس نے ثمرین کی ناک انگشت شہادت سے چھو کے شرارت سے کہا۔ وہ ہنس دی۔ تبھی اطلاعی گھنٹی کی گونج سے گھر بھر گیا۔

"خوشی آگئی۔"

وہ دروازہ کھولنے چلا گیا کہ خوشی اپنی آمد کی ایک اطلاع پر رکی نہیں تھی اور وہ سوچ رہی تھی واقعی ان کی زندگیوں میں خوشی آگئی تھی۔

☆☆



نفیسہ سعید

سپر اسٹار بھابی

امی آج صبح ہی اپنی چھوٹی بہن سے ملنے حیدرآباد گئی تھیں۔ جس کی وجہ سے ثنا گھر پر تنہا تھی۔ اپنی تنہائی سے گھبرائی ثنا نے جلدی جلدی گھر کا کام سمیٹا، لنچ کے بعد برتن دھو کر ریک پر رکھے اور ہاتھ صاف کرتی ہوئی اوپر آ گئی۔ اس کا ارادہ تھا آج دوپہر کا وقت بھابھی کے ساتھ گزارے گی اور شام کی چائے کے بعد نیچے جائے گی تاکہ جاذب کی گھر واپسی سے قبل ڈنر تیار کر سکے مگر بڑی بھابھی کے عجیب و غریب رویہ نے اسے جلد ہی نیچے واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ بھابھی سیل فون ہاتھ میں تھامے کچن میں کچھ اس طرح مصروف تھیں کہ ثنا نے دیکھا وہ پورے کچن میں مختلف زاویوں سے گھوم پھر کر شاید کسی سے وڈیو کال پر بات کر رہی تھیں۔ جس میں وہ اتنی مگن تھیں کہ ثنا کی اپنے گھر موجودگی بھی فراموش کر بیٹھی تھیں۔ تب ثنا نے ایک دو بار انہیں مخاطب کر کے اپنی جانب متوجہ کرنے کی ناکام کوشش کی مگر بھابھی نے اپنے منہ پر انگلی رکھ کر اسے خاموش کروا دیا، شاید اس وقت وہ کوئی بات نہ کرنا چاہتی تھیں۔ لہٰذا ان کی اس مصروفیت سے ثنا کچھ ہی دیر میں اکتا گئی اور خاموشی سے اٹھ کر نیچے آ گئی۔

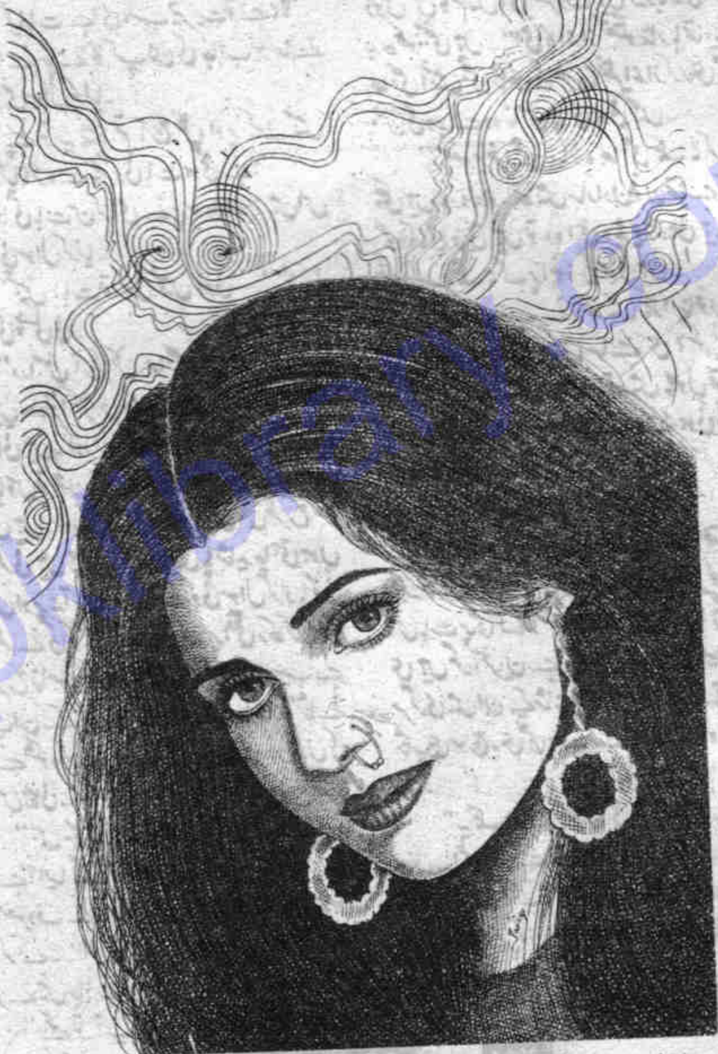
اور پھر تو یہ روز کا معمول ہی بن گیا ثنا جب بھی اوپر جاتی بڑی بھابھی فون میں اسی طرح مگن دکھائی دیتیں کہ کبھی فون ہاتھ میں تھامے ڈریسنگ ٹیبل کے گرد چکراتے نظر آتیں اور کبھی ڈائننگ ٹیبل کے آس پاس منڈلاتے ہوئے خود سے باتیں کرتیں اور مسکراتیں، ایسے میں وہ ثنا کو قطعی نظر انداز کر دیتیں۔ جس کے سبب وہ ہمیشہ خاموشی سے نیچے اتر آیا کرتی۔ ثنا سمجھ نہ پا رہی تھی ایسا کیا ہے فون میں جو اسے ہاتھ میں تھامے بڑی بھابھی دنیا جہاں سے بے نیاز نظر آتی ہیں، یہاں تک کہ اب اکثر ہی بھابھی شام کے وقت چھت کی منڈیر پر بال کھولے لہراتے ہوئے بھی دکھائی دیتیں اور کبھی چھت پر یہاں وہاں ٹہلتے ہوئے نظر آتیں حالانکہ اس سے قبل وہ چھت پر کم ہی جایا کرتی تھیں۔ بھابھی کی یہ نئی مصروفیات ایک ایسا معمہ تھیں جسے ثنا حل نہ کر پاتی اگر اسے جاذب نہ بتاتا جمعہ کی شام بھابھی، جاوید بھائی کے ساتھ کسی دیو گئی

ہوئی تھیں آج کل اکثر ہی وہ مختلف تفریحی مقامات پر گھومنے جایا کرتیں اور ایسے میں انہوں نے کبھی ثنا کو جھوٹے منہ بھی نہ پوچھا جبکہ اس سے قبل وہ ثنا کو بھی اپنے ساتھ لے جایا کرتی تھیں۔ بھابھی کی ان باتوں کی وجہ سے ثنا کا دل ان سے بہت برا ہو گیا تھا جس کے سبب وہ بھابھی سے خاصی بددل ہو گئی تھی

اور آہستہ آہستہ اس نے اوپر جانا بالکل چھوڑ دیا تھا جس کی بھابھی نے کوئی پروانہ کی اور نہ ہی کبھی ثنا سے پوچھا کہ وہ اوپر کیوں نہیں آتی۔

☆☆☆

شام کے وقت ثنا کچن میں امی کے لیے چائے بنا رہی تھی جب خلاف توقع جاذب بھی جلدی



گھر لوٹ آیا اور ثنا کو کچن میں مصروف دیکھ کر اس نے آواز لگائی۔

"یار، میری بھی چائے بنالو، میں یہیں لاؤنج میں آرہا ہوں فریش ہوکر" یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا جبکہ ثنا تین کپ چائے بنا کر ٹرے میں لیے امی کے پاس آن بیٹھی جو کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

"کیا بات ہے امی، سب خیریت تو ہے نا؟"

ثنا نے چائے کا کپ ان کی جانب بڑھاتے ہوئے یونہی سوال کرلیا۔

"پہلے تو یہ بتاؤ تم آج کل اوپر کیوں نہیں جاتیں، کیا مائرہ سے پھر کوئی بات ہوئی ہے؟"

ثنا کی بات سن کر امی نے پرسوچ انداز میں اس سے جوابی سوال کرلیا۔

"نہیں، بات تو کوئی نہیں ہوئی......" ثنا نے چائے کی چسکی لی۔

"دراصل آج کل بھابھی گھر میں ہی کب ہوتی ہیں، وہ تو اکثر ہی جاوید بھائی کے ساتھ گھومنے نکل جاتی ہیں۔ اور اگر کبھی گھر ہوں اور میں اوپر چلی بھی جاؤں تو فون تھامے یہاں وہاں چکراتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ اور ایسے میں مجھے بالکل اس طرح نظر انداز کرتی ہیں جیسے جانتی نہ ہوں یا شاید چاہتی ہوں کہ میں اوپر نہ آؤں۔ غلطی سے کوئی سوال کرلو یا کوئی بات کرنے کی کوشش کروں تو منہ پر انگلی رکھ کر بچوں کی طرح خاموش کروادیتی ہیں۔ بس یہ ہی سبب ہے جواب ان کے پاس جانے کو دل نہیں چاہتا۔" ثنا نے امی سے شکوہ کرتے ہوئے کئی دنوں سے دبی دل کی بھڑاس نکالی۔

"بس یہی مجھے بھی کچھ میں نہیں آرہا، اسے ہوا کیا ہے؟ ایسا لگ رہا ہے جیسے مائرہ پھر کسی نئی سرگرمی میں مصروف ہے۔ اگر واقعی میں ایسا ہے تو پھر اللہ ہی خیر کرے۔" امی کا لہجہ پریشان کن تھا تب ہی کمرے میں جاذب کی آواز گونجی۔

"مجھے تو آپ دونوں خواتین پر حیرت ہے جنہیں یہی علم نہیں کہ مائرہ بھابھی ان دنوں کس نئی سرگرمی میں مصروف ہیں؟"

جاذب کب کمرے میں آیا ان دونوں کو پتا ہی نہ چلا۔ اب جو اس کی آواز سنی تو ثناء نے چونکتے ہوئے پلٹ کر دیکھا۔

"چلو ہم تو بے خبر ہی بھلے تمہیں اگر کچھ خبر ہو تو ہمیں بھی بتا دو تا کہ جان سکیں تمہاری بھابھی ان دنوں کس کام میں اتنی مصروف ہیں کہ زمانہ کی سدھ بدھ کھو بیٹھی ہیں۔" امی کا انداز گفتگو بتا رہا تھا، مائرہ بھابھی انہیں بھی ثنا ہی کی طرح نظر انداز کررہی تھیں جس کی وجہ سے وہ خاصی چڑی ہوئی تھیں۔

"معصوم خواتین، مائرہ بھابھی ٹک ٹاکر بن چکی ہیں اور وہ جو ہاتھ میں سارا دن فون تھامے آپ کو دکھائی دیتی ہیں تو وہ اپنی ویڈیوز بناتی ہیں جو انہوں نے ٹک ٹاک پر اپلوڈ کی ہوئی ہیں۔

یہ کہہ کر جاذب نے ہاتھ میں پکڑا اپنا فون امی کی جانب بڑھا دیا جہاں سامنے ہی اسکرین پر بھابھی کسی پارک میں موجود ہاتھ میں پھول تھامے جاوید بھائی کے ارد گرد منڈلاتے ہوئے ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

"اوئی اللہ یہ کیا ہے؟"

یہ سب دیکھ کر امی کے منہ سے بے اختیار نکلا جبکہ ثنا بھی ہکا بکا اسکرین دیکھ رہی تھی۔ ثنا کو حیرت اس بات پر تھی کہ بھابھی تو جو کرتی ہیں غلط یا صحیح کرتی ہی ہیں مگر آفرین ہے جاوید بھائی پر جو ہمیشہ، ہر سرگرمی میں ان کے شانہ بشانہ کھڑے نظر آتے ہیں۔ ثنا یہ ہی سوچ رہی تھی جب اسے جاذب کی آواز سنائی دی۔

"یہ ٹک ٹاک پر ڈالی گئی ایک وڈیو ہے۔"

جاذب اطمینان سے امی کو بتا رہا تھا۔

"ٹک ٹاک کا مطلب یہ ہوا کہ اب ہماری بہو بیٹیاں یوں سڑکوں اور پارکوں میں ناچتے گاتے دکھائی دیں گی۔"

امی کے لہجے میں ناگواری جھلک آئی۔

"بہت معذرت امی، بہوؤں بیٹی کی بات تو آپ بعد میں کیجیے گا، پہلے اب اپنے بیٹے کی بات کریں جو بیوی کو ساتھ لے جاکر پارک میں نہ صرف ناچ گا کر وڈیو بنوا رہے ہیں بلکہ اس ویڈیو کو ٹک ٹاک پر اپلوڈ کرکے ہزاروں تماش بینوں کی نظروں تک پہنچا بھی رہے ہیں۔"

جاذب کا لہجہ باوجود کوشش کے تلخ ہوگیا۔

ثنا سمجھ گئی جاذب کو بڑی بھابھی کا یوں ٹک ٹاک پر ویڈیوز اپلوڈ کرنا بالکل پسند نہ آیا تھا۔ اچھا تو ثنا کو بھی نہیں لگا تھا بلکہ اسے حیرت تھی کس طرح بڑی بھابھی اپنی ہر سرگرمی ٹک ٹاک پر اپلوڈ کرتی ہیں جہاں وہ سب پبلک تھا۔ ایسے میں ان کی وڈیوز کے نیچے کئی لوگوں کے بے ہودہ کمنٹس بھی دکھائی دے رہے تھے جو لازمی جاوید بھائی بھی پڑھتے ہوں گے۔ یقیناً یہ کمنٹس پڑھ کر ہی جاذب کا موڈ آف ہوا تھا۔ مگر شاید بڑی بھابھی کو ان باتوں سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔

ان ہی دنوں ثنا نے ان کی مزید ایک اور ٹک ٹاک بھی دیکھی۔ جس میں وہ نہانے کے بعد سر پر تولیہ لپیٹے ڈریسنگ کے سامنے کھڑی تھیں اور یہ سب ثنا کے لیے بہت زیادہ حیرت انگیز تھا مگر اس معاملہ میں وہ کچھ نہ کرسکتی تھی۔ اس لیے جاذب کی ہدایت کے مطابق وہ اور امی ہر بات کو بھول کر خاموش ہوگئیں۔ مگر اب یہ بات گھر سے نکل کر محلہ اور خاندان بھر میں پھیل چکی تھی کہ بڑی بھابھی ٹک ٹاکر بن گئی ہیں۔ جس کا اندازہ اسے دو دن بعد ہی جازبہ آپا کی گھر آمد کے موقع پر ہوگیا۔

☆☆☆

عصر کی نماز پڑھ کر ثنا سیڑھیوں کی جانب بڑھی تاکہ چھت سے دھلے کپڑے اتار لائے تب اسی لمحہ اسے سیڑھیوں سے بڑی بھابھی نیچے اترتے دکھائی دیں۔ ثنا نے دیکھا ہاتھ میں بیگ لہراتی، آنکھوں پر سن گلاسز لگائے بھابھی فل میک اپ میں تھیں جیسے کسی پارٹی میں جا رہی ہوں۔ ثنا کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر بھابھی ایک دم ٹھٹک گئیں ثنا نے ان کا بھرپور تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

"خیریت ہے، یہ آپ کہاں جا رہی ہیں اتنی تیار شیار ہو کر؟"

"ہاں خیریت ہی ہے......" بھابھی نے ایک فرمائشی مسکراہٹ اس کی جانب اچھالی۔ "دراصل آج ہم ٹک ٹاکرز کا ایک گیٹ ٹو گیدر ہے وہاں جا رہی ہوں۔"

"گیٹ ٹو گیدر؟"

"ثنا نے سوالیہ انداز سے بھابھی کو ایک بار پھر دیکھا جو کالے رنگ کی ساڑھی میں اس طرح تیار تھیں جیسے کسی شادی کے فنکشن میں شرکت کے لیے جا رہی ہو۔

"ہاں یار، گیٹ ٹو گیدر۔" اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بھابھی نے مزید وضاحت دی۔ "دراصل دوسرے شہروں کے کچھ ٹک ٹاکرز ہم سے ملنے آئے ہوئے ہیں تو ہم سب نے مل کر ہوٹل میں ان کے لیے ہائی ٹی پروگرام رکھا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے بھابھی اس کے قریب سے گزر کر تیزی سے نیچے اتر گئیں اسی وقت دروازہ سے باہر نکلتیں امی نے ثنا کو آواز دیتے ہوئے بھابھی کو سنایا۔

"یہ نماز کے وقت اتنی تیار ہو کر کہاں جا رہی ہے۔ مجھے لگتا ہے اب یہ نمازیں پڑھنا بھی بھول گئی ہے اور اس کا دین ایمان صرف ٹک ٹاک ہی رہ گیا ہے۔"

ثنا نے دیکھا نیچے اترتیں بھابھی ایک پل کو سیڑھیوں پر رکیں ضرور مگر انہوں نے امی کی بات کو قطعی نظر انداز کردیا اور خاموشی کے ساتھ تیزی سے سڑھیاں اترتی چلی گئیں جبکہ ثنا، امی کو بنا کوئی جواب دیے چھت سے کپڑے اتار کر نیچے لے آئی

☆☆☆

زیرک اور پری ٹیوشن پڑھ کر گھر آئے تو حسب توقع بھابھی گھر سے غائب تھیں۔ ایسے میں وہ

دونوں بچے ماں کی غیر موجودگی سے پریشان نیچے آگئے تب ثنا نے ان کے لیے چائے کے ساتھ پراٹھا بنایا جسے لے کر ابھی وہ کچن سے باہر ہی نکلی تھی کہ داخلی دروازے سے جازیہ آپا اندر داخل ہوئیں۔

"السلام علیکم۔"

ثنا نے انہیں دیکھتے ہی سلام کیا جس کا جواب جازیہ نے محض سر ہلا کر دیا اور امی کے کمرے کی جانب بڑھ گئیں تب ثنا نے محسوس کیا جازیہ آپا کچھ پریشان سی دکھائی دے رہی ہیں۔ چونکہ ثنا کو کسی بات کی ٹوہ لینے کی عادت نہ تھی اس لیے واپس پلٹ کر کچن میں آگئی تا کہ ان کے لیے چائے تیار کر سکے۔ کرتی ثنا چائے کا کپ اور بسکٹ ٹرے میں رکھے امی کے کمرے میں آ گئی جہاں امی نہایت خاموشی سے جازیہ کی باتیں سن رہی تھی جو کہہ رہی تھیں۔

"مجھے آپ پر حیرت ہے امی، بھابھی کو کبھی ان کاموں سے منع نہیں کرتیں جب دیکھو وہ کوئی نہ کوئی الٹا سیدھا کام کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اور اس دفعہ تو بالکل حد کر دی ٹک ٹاکر بن گئیں۔ بھلا کیا ضرورت ہے اس عمر میں ٹک ٹاک پر ناچ ناچ کر ویڈیوز اپلوڈ کرنے کی۔ آپ کو علم نہیں میرے سسرال والے کتنی باتیں کر رہے ہیں۔ روز کوئی نہ کوئی ان کی بے ہودہ ویڈیو مجھے واٹس ایپ کر دیتا ہے جسے دیکھ کر میں شرم سے پانی پانی ہو جاتی ہوں۔"

جازیہ آپا کا شکوہ بجا تھا مگر امی کے جواب نے ثنا کو حیران کر دیا۔ جازیہ کی مکمل بات سننے کے بعد امی نے ان کی جانب دیکھا اور ایک سانس بھرتے ہوئے بولیں۔

"دیکھو بیٹا، مائرہ اپنے گھر بار والی ایک ذمہ دار عوت ہے اور ہمیشہ جو بھی کام کرتی ہے۔ اپنے شوہر کی مرضی اور رضا کے ساتھ کرتی ہے جب اس کا شوہر اسے کسی بات سے نہیں روکتا تو میں تم یا تمہارے سسرال والے کون ہوتے ہیں جو اس پر انگلی اٹھائیں یا باتیں کریں؟"

شاید اس بات کا جواب جازیہ آپا کے پاس بھی نہ تھا۔ اس لیے انہوں نے خاموشی سے اپنے سامنے رکھا چائے کا کپ اٹھایا اور منہ کو لگا لیا۔ تب امی پھر بولیں۔

"اپنی ساس اور سسرال والوں کو بتاؤ کہ اس سارے معاملہ میں تمہارا بھائی مکمل طور پر شامل ہے۔ اور جب عورت اپنے شوہر کی اجازت سے کوئی کام کر رہی ہو تو اس گناہ اور ثواب کے ذمہ دار وہ دونوں ہیں۔ میں، تم یا تمہارے سسرال والے نہیں۔"

امی کے جواب نے جازیہ کو کچھ کہنے کے قابل ہی نہ چھوڑا۔ اور ایسے میں ثناء کو محسوس ہوا امی جو کچھ کہہ رہی ہیں وہ بالکل درست ہے۔ جب بھابھی یہ سب کچھ جاوید بھائی کی اجازت سے ان کے ساتھ مل کر کر رہی تھیں تو پھر کوئی بھی انہیں اس عمل سے روکنے کا مجاز نہ تھا۔

☆☆☆

بھابھی کے ٹک ٹاکر بننے کی خبر پورے خاندان اور محلہ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی جسے کچھ لوگوں نے پسند کیا اور بھابھی کے اس عمل کو خوب سراہا۔ ٹک ٹاکر بننے کے بعد بھابھی جیسے خود کو سپر اسٹار سمجھنے لگی تھیں۔ یہاں تک کہ اکثر لوگ ان کے ساتھ تصاویر کھنچوا کر فخر سے سوشل میڈیا پر اپلوڈ کرتے۔ ایسے میں جہاں لوگ بھابھی کے مداح بنے وہاں خاندان میں اکثریت ان کی بھی تھی جنہیں بھابھی کا یہ عمل بالکل پسند نہ آیا اور وہ بھابھی کے ساتھ ساتھ جاوید بھائی پر بھی باتیں کرتے۔ مگر بھابھی کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو دوسروں کو قطعاً اہمیت نہ دیتے تھے اور ہمیشہ وہ کرتے جو ان کا دل چاہتا تھا اس لیے بھابھی پر کسی کی بات کا کوئی اثر نہ تھا۔

ان دنوں بھابھی کو ملنے والے تحائف میں بھی بے تحاشہ اضافہ ہوا جو انہیں مختلف کمپنیاں بھیجا کرتیں کبھی کوئی جوتا یا ڈریس آتا، کبھی مختلف ریسٹورنٹ کھانے کے ڈبے بھیج دیتے اور بھابھی ان تمام چیزوں کے ریویوز ٹک ٹاک پر دیا کرتیں۔ اس سارے عمل میں وہ اتنا مصروف تھیں کہ زیرک کی سالگرہ سر پر آن پہنچی اور انہیں پتا ہی نہ چلا اور جب

زیرک کی سالگرہ میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا تو بھابھی ،ثناء کو ساتھ لیے ایک مشہور مال پر شاپنگ کے لیے گئیں تا کہ زیرک کا ڈریس اور ضرورت کی اشیاء خرید سکیں اب بھابھی شاپنگ کے ساتھ ساتھ ٹک ٹاک بھی بنا رہی تھیں اس وقت جب ثنا اور بھابھی ایک دکان سے باہر نکلیں تب ایک دم اچانک ہی دو لوفر سے جوان ان کے سامنے آن کھڑے ہوئے ان میں سے ایک بھابھی کی جانب دیکھ کر زور سے بولا۔

"ارے واہ! یہ تو اپنی ٹک ٹاکر گل بی بی ہے۔"

تب ثناء کو پتا چلا بھابھی ٹک ٹاک پر گل بی بی کے نام سے مشہور ہیں۔

نوجوان کی بات سن کر بھابھی نے ایک تیکھی نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی ہی تھی کہ دوسرا لڑکا اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتا ان کے بالکل ساتھ آن کھڑا ہوا اور بھابھی کے منہ پر سگریٹ کا دھواں چھوڑتا ہوں بولا۔

"جانم، ایک فوٹو پلیز۔"

ثنا نے حیرت بھری نگاہ نوجوان کے چہرہ پر ڈالی اور تھوڑا سا پیچھے ہو گئی۔ اتنی دیر میں وہاں تین چار نوجوان اور آ گئے جو بھابھی کے چاروں جانب اس طرح کھڑے ہوئے کہ بھابھی ان کے درمیان پھنس گئیں۔ اب ثناء کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا اس صورتحال میں وہ کیا کرے۔ جبکہ اسے لگ رہا تھا بھابھی خود بھی گھبرا گئی ہیں۔ "ہٹو میرے سامنے سے "بھابھی نے اپنے ساتھ کھڑے ہوئے نوجوان کو پیچھے ہٹا کر باہر نکلنے کی کوشش کی جس میں وہ بری طرح ناکام ہو گئیں۔ اس دوران وہاں جمع ہونے والے لوگ بھی جیسے تماشا دیکھ رہے تھے۔ ثنا نے سنا ایک خاتون زور سے کہہ رہی تھیں۔

"پہلے ٹک ٹاک پر ویڈیوز اپلوڈ کر کے ان نوجوانوں کو پھنساتی ہیں پھر ڈرامہ کرتی ہیں۔"

وہ نوجوان بھابھی کے ساتھ ٹک ٹاک بنانا چاہتے تھے جبکہ بھابھی اس وقت کسی طرح ان سے جان چھڑانے کے موڈ میں تھیں۔ اور یہ سب بہت زیادہ مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ اسی وقت جانے کہاں سے جاذب وہاں پہنچ گیا جس کے ساتھ اس کا کوئی دوست بھی تھا۔

"کیا ہو رہا ہے یہ سب" زور سے کہتے ہوئے جاذب نے فلور پہ کھڑے سیکیورٹی گارڈ کو آواز دی جس کے ساتھ ہی نوجوان بھابھی سے پیچھے ہٹ گئے اور بھابھی روتے ہوئے مجمع سے نکل کر سیڑھیوں کی جانب بھاگیں۔

ثنا بھی سر جھکائے ہوئے جاذب کے ساتھ ہی بھابھی کے پیچھے چلتی نیچے آ گئی۔ زیرک کی شاپنگ ادھوری ہی رہ گئی اور وہ دونوں جاذب کی گاڑی میں گھر آ گئیں حالانکہ جاذب کا موڈ سخت خراب تھا مگر اس نے کسی سے کوئی بات نہ کی۔ تب ثنا کو بعد میں پتا چلا جاذب وہاں اپنی کوئی میٹنگ اٹینڈ کرنے گیا تھا جب رش میں کھڑی بھابھی کو دیکھ کر وہ ان کی جانب آ گیا۔ یہ شاید قدرت کی طرف سے ایک مدد تھی جو اس وقت جاذب کی صورت ان تک پہنچی جس کی وجہ سے وہ دونوں خواتین با حفاظت اپنے گھر آ گئیں۔ ایسے میں اگر میڈیا وہاں پہنچ جاتا تو کتنی بدنامی ہوتی، یہ سوچتے ہی ثنا کو ایک جھرجھری سی آ گئی اور اس نے اللہ کا شکر ادا کیا جس نے بروقت ان دونوں کی مدد کی۔

☆☆☆

دو دن بعد زیرک کی سالگرہ تھی تب عبایا میں ملبوس بھابھی، جاوید بھائی کے ساتھ شاپنگ کرنے گئیں تو ثناء کو پتا چلا کہ انہوں نے نہ صرف ٹک ٹاک چھوڑ دیا ہے بلکہ اپنے مداحوں سے جان چھڑوانے کے لیے عبایا بھی پہن لیا اور عبایا میں ملبوس بھابھی کو دیکھ کر امی کی بڑبڑاہٹ زوروں پر تھی۔

"بھلا بندہ ایسا کام ہی کیوں کرے جس میں بدنامی گلے پڑ جائے اور لوگوں سے منہ چھپانا پڑے۔"

امی کی بات درست تھی۔ ثناء نے بھی شکر ادا کیا کہ بڑی بھابھی کو بروقت عقل آ گئی اور وہ ایک ایسی سرگرمی سے نکل آئیں جو وقت گزرنے کے ساتھ انہیں مزید بدنام کر دیتی۔

☆☆

سالگرہ نمبر



میمونہ صدف



پچھلی قسط کا خلاصہ

آئینور فاطمہ کا جب جب عباد سے جھگڑا ہوتا ہے تو وہ کالج چھوڑ دیتی ہے۔ ٹھیک اس کے پانچ سال بعد سمیرا فون کر کے عباد سے معافی مانگتی ہے کہ اس کے اور آئینور کے درمیان تمام فساد سمیرا کی وجہ سے ہوا تھا۔

آئینور فاطمہ جہلم جا کر ہاؤس جاب کرنا چاہتی ہے۔ وہ شمشاد سے اس کی اجازت مانگتی ہے تو شمشاد انکار کر دیتا ہے۔ وہ شمشاد کو یہ کہہ کر منا لیتی ہے کہ اگلی دفعہ وہ اس کی بات بنا چوں وچرا مان لے گی۔

ہاؤس جاب مکمل کرتے ہی آئینور فاطمہ گھر آجاتی اور ہسپتال میں نوکری کرنے لگتی ہے شمشاد اس کو فون کر کے نوکری کرنے سے منع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے نوکری کرنے والی لڑکیاں پسند نہیں ہیں۔ دونوں میں بحث ہوتی ہے تو وہ یہ کہہ کر فون بند کر دیتا ہے کہ وہ پاکستان نہیں آئے گا جب تک آئینور اپنی ضد نہیں چھوڑے گی۔

ذکی زبور بابا کو پارک میں لے جاتا ہے وہ باتیں کر رہے ہوتے ہیں تو رطابہ وہاں پہنچ جاتی ہے اس وقت زبور بابا ذکی کے بالوں پر بوسہ دے رہے ہوتے۔ رطابہ بابا پر انتہائی گندا الزام لگاتی ہے۔ اور ان کو دھکا دے کر گرا دیتی ہے۔ زبور بابا شاکڈ زمین پر پڑے سنتے ہیں۔ رطابہ انہیں گھسیٹ کر پارک سے باہر لے جانے کی کوشش کرتی ہے کہ ذکی پوری قوت سے اسے پکارتا ہوا زمین پر گر جاتا ہے۔

رطابہ ذکی کو لے کر اسپتال جاتی ہے دانش بھی وہاں پہنچتا ہیں۔ وہاں جا کر علم ہوتا ہے کہ ذکی کے دل میں پیدائشی سوراخ ہے۔

او پی ڈی میں سموئیل کی ملاقات ریچل سے ہوتی ہے وہ عباد سے معافی مانگتی ہے۔ سموئیل اسے کہتا ہے کہ اسے معلوم ہے کہ جو کچھ ریچل نے پانچ سال پہلے اس کے ساتھ کیا۔

ریچل سموئیل سے کہتی ہے کہ آئینور کا بھانجا ہمارے ہسپتال میں ایڈمٹ ہے۔ آئینور مجھے وہیں ملی تھی۔ اس کی رخصتی اب کبھی نہیں ہوگی۔ اس کی طلاق ہو گئی ہے۔

گیارہویں قسط

مزید ایک ہفتے کسی کا بھی شمشاد سے رابطہ نہیں ہو پایا تھا۔ اس نے مڑ کر دوبارہ ابا کو کوئی کال نہیں کی۔ فاطمہ نے کئی بار اسے کال ملا کر کاٹی تھی۔ ایک بیوی کی وفا کہتی تھی کہ اسے اپنے شوہر کو کچھ بھی کر کے منا لینا چاہیے لیکن ایک عورت کی انا کہتی تھی کہ جو کچھ بھی وہ کرنے کو کہہ رہا ہے سراسر غلط ہے۔ وہ اس سے اس کی زندگی کا سب سے بڑا خواب چھیننا چاہتا ہے اور اسے اس خواب کو کسی صورت بھی توڑنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ آخر شمشاد کی بیوی سے ہٹ کر بھی تو وہ کچھ تھی۔ اپنے خوابوں کو تکمیل تک پہنچانے والی ایک محنتی اور مستقل مزاج لڑکی۔ ایک بہادر اور خوددار لڑکی۔ ڈاکٹر آئینور فاطمہ گل۔ یہی اس کی اصل پہچان تھی۔ اور اپنی یہ پہچان اسے عزیز تھی۔

"فاطمہ! کیا شمشاد کو منا لیا تم نے؟" اس دن ابا باہر صحن میں واک کر رہے تھے جب وہ ڈیوٹی سے

ناولٹ



لوٹی تھی۔ ابا کو سلام کر کے وہ اندر جانا ہی چاہتی تھی کہ انہوں نے پوچھ لیا۔ اس نے ایک تھکن بھری سانس لی۔ کچھ سوال سن کر ہی تھکن ہونے لگتی ہے۔

''نہیں ابا'' سچ تو یہ تھا کہ اسے لگتا تھا کہ وہ شمشاد کو نہیں منا پائے گی۔ وہ ضد پہ اتر آیا تھا اور اس کی ضد فاطمہ کو جھکانا تھی۔ جھکانے سے بھی زیادہ اسے توڑنا۔

''تو کیا اس نے تمہیں منا لیا؟'' اس نے ابا کو دیکھا اور سر نفی میں ہلایا۔

''وہ اپنی جگہ کھڑا ہے اور میں اپنی جگہ۔''

''تو معاملہ آگے کیسے بڑھے گا اگر تم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ سے ہلو گے نہیں۔''

وہ ابا کو کیسے سمجھاتی کہ ابا اسی بات کا جواب تو نہیں ہے نا۔ اس نے شانے اچکائے اور اندر چلی گئی۔ ابا سچ مچ پریشان ہوئے تھے۔ اور ہفتے بعد ان کی وہ پریشانی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

اس رات جب وہ ڈیوٹی سے لوٹی تھی تو ابا صحن میں بچھی چارپائی پہ بیٹھے تھے۔ صحن میں بلب جلا ہوا تھا اسی لیے وہ ابا کا چہرہ ٹھیک سے دیکھ سکتی تھی۔ ان کا سر جھکا تھا اور کندھے بھی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح ابا کو سلام کیا تو انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

ان کی بجھی آنکھوں میں فاطمہ کو بہت مایوسی دکھائی دی۔ اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

''کیا ہوا ابا؟'' وہ اسے بغور دیکھتے رہے۔ فاطمہ کو ان کی نظروں سے الجھن ہونے لگی۔

''ابا کیا ہوا؟'' وہ قدم قدم ان کے قریب آئی۔

ابا کے پاس قریب ایک خاکی لفافہ تھا۔ انہوں نے اٹھایا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ تھوڑی دیر ابا کا بڑھا ہاتھ اور اس میں تھاما خاکی لفافہ دیکھتی رہی۔

خاکی لفافہ تھامتے اس کا دل لرزا تھا۔ لفافہ پہلے سے چاک تھا۔ اس نے باہر لکھا پتا نہیں پڑھا تھا۔ بس اس میں موجود کاغذات نکال کر کھولے۔ اپنے نام پہ اس کی نظر سب سے پہلے گئی۔ پھر شمشاد کے نام پہ اور سب سے اوپر کاغذات کے متن پہ۔

''divorce paper'' (طلاق نامہ)

اس کے لب ایسے ہلے کہ آواز دم توڑ گئی۔

شمشاد نے اسے آزاد کر دیا تھا۔ ان کا تعلق ختم ہو چکا تھا۔ اتنی آسانی سے تو کوئی اپنے گھر میں بندھی بکری کو نہیں آزاد کرتا جتنی آسانی سے اس نے اپنی شریک سفر کو آزاد کیا تھا۔ وہ بالکل ساکت سی ان کاغذات کو دیکھے گئی۔

''اس نے طلاق بھیج دی ہے۔'' ابا کی آواز کانپ رہی تھی۔

''چھوڑ دیا اس نے تمہیں۔ بنا کوئی وجہ بتائے اس نے تمہیں چھوڑ دیا۔'' دروازے میں امی کھڑی تھیں۔ ان کی آواز آنسوؤں سے نم تھی۔

''آخر کچھ تو ہوا ہوگا نا۔ وہ تو بہت پیار کرتا تھا تم سے۔''

اور یہ لفظ ''پیار'' ہی تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ کب کیسے بیچ سے نکل گیا تھا۔

''غلطی ہم سے ہوئی تھی کہ ہم نے اپنی اتنی قابل بچی ان لوگوں میں جھونک دی جنہیں اس کی قدر ہی نہیں تھی۔'' ابا اپنی جگہ سے اٹھے۔ ایک عرصے سے وہ اس پچھتاوے کا شکار تھے۔ اب کھل کر کہہ ہی دیا۔ ''زندگی کے کچھ فیصلے ایسے ہوئے ہیں مجھ سے جنہیں میں پلٹانا چاہتا ہوں لیکن میرے بس میں نہیں ہے۔ ان میں سے ایک تمہارا اس سے رشتہ کرنا تھا۔''

وہ اٹھ کر اس کے سامنے کھڑے تھے۔ فاطمہ بس بت بنی تھی۔ اسے کچھ دکھائی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ سب کے لب ہل رہے تھے لیکن وہ بہری ہو گئی۔ روشنی تھی لیکن وہ کیسے اندھی ہو گئی؟

''یہ میرے ہاتھوں کو دیکھو۔'' ابا نے اس کے بالکل سامنے پہنچ کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

فاطمہ کو اتنی دیر میں پہلی بار دو بندھے ہاتھ دکھائی دیے جو اس کے باپ کے تھے۔ پھر اس نے دو نم آنکھیں دیکھیں جو اس کے باپ کی تھیں۔ ان

آنکھوں سے آنسو ٹپکے گالوں پہ جو اس کے باپ کے تھے۔

"میں نے تمہاری زندگی برباد کر دی۔" جو آواز سنائی دی، وہ اسے واپس اس دنیا میں لے آئی، وہ اس کے باپ کی تھی اور اس آواز میں آنسو شامل تھے، جو اس سے معافی مانگ رہے تھے۔

وہ ابا کو دیکھے گئی۔ اس کی آنکھیں بس پتھرائی ہوئی تھیں۔ دماغ سن تھا۔ نہ کوئی خیال آ رہا تھا نہ جا رہا تھا۔ بس ایک بات۔ شمشاد نے طلاق دے دی۔ شمشاد نے اسے آزاد کر دیا۔ اور وہ اسی ایک جملے کی بازگشت کے ساتھ ساکت سی مرے مرے قدموں سے اندر کی طرف چلی گئی۔

اپنے پیچھے اسے اپنے باپ اور ماں دونوں کے رونے کی آوازیں سنائی دیں لیکن اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

"میں نے اس کی زندگی تباہ کر دی۔" وہ ابا تھے جو رو رہے تھے۔

"اتنی سی عمر میں طلاق۔" وہ امی تھیں جو بلند آواز سے کہہ رہی تھیں۔

کمرے میں پہنچ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ اب کوئی آوازیں نہیں تھیں۔ بس ایک آواز تھی، اس کے اونچا اونچا سانس لینے کی آواز۔ اس کے اندر گھٹن تھی اور اس گھٹن سے اس کا دل بند ہو رہا تھا اسی لیے وہ گہرے اونچے سانس لینے لگی اور بستر پہ بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ میں وہ خاکی لفافہ اور کاغذ چڑ مڑ تھے۔

صدمہ تھا۔ بے یقینی تھی۔ دماغ سوچنے سمجھنے سے دور تھا کہ آخر ہوا کیا تھا۔ ہوا کیا تھا کہ اتنی محبت کا دعویٰ کرنے والا وہ شخص اتنی آسانی سے اسے چھوڑ گیا تھا۔ وہ جو اس سے محبت کا کوئی دعویٰ نہیں کرتی تھی لیکن وفا نبھانے کا اس نے قصد کیا تھا، وہ اس رشتے کے ختم ہو جانے پہ ساکت رہ گئی تھی اور اس انسان کو کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

ہاتھ میں تھاما کاغذ اس نے پھر سے دیکھا۔ بڑا واضح لکھا تھا کہ شمشاد نے اسے طلاق دے دی۔ ساتھ میں دس لاکھ کا ایک چیک بھی تھا جو یقیناً اس کا حق مہر تھا۔ اس چیک کو ہاتھ میں تھامے وہ اس پہ لکھی رقم دیکھتی رہی۔ دس لاکھ اور بس۔ اس نے پورا حق مہر ادا کر دیا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ کیا ایک برباد ہو جانے والی زندگی کی قیمت چند لاکھ ہوا کرتے ہیں؟ کسی لڑکی کے نازک جذبات کو ٹھوکر لگانے کا مداوا دس لاکھ سے ہو جایا کرتا ہے کیا؟

کاغذ اور چیک اس نے زمین پہ پھینکا اور منہ میں چادر ٹھونس کر زور زور سے چیخنے لگی۔ نجانے کتنی دیر کر وہ اسی طرح چیختی رہی، روتی رہی کہ اس کی تمام چیخیں اسی چادر میں دم توڑتی رہیں۔

رونا، آنسو بہانا کوئی بزدلی کی علامت نہیں ہوتے۔ یہ درد کی علامت ہوتے ہیں اور درد ہر کسی کو ہوتا ہے اور ایک سا ہوتا ہے۔ بہادر کو بھی بزدل کو بھی۔ ڈٹ جانے والے کو بھی، بھاگ جانے والے کو بھی۔ اسی لیے وہ روئی تھی، خوب روئی تھی کہ رونا اس کا حق تھا۔

اتنی سی عمر میں جب لڑکیاں اپنی نئی زندگی شروع کرنے کے لیے طرح طرح سے خواب دیکھتی ہیں، اس کی نئی زندگی شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گئی تھی۔

"کبھی آپ سے شکوہ نہیں کیا میں نے اللہ کیونکہ مجھے ہمیشہ یہی لگا کہ شکوہ کرنے کا حق نہیں ہوتا انسان کے پاس۔" چادر اس نے ایک طرف ڈالی اور آنسو پونچھے۔

"آپ نے اسے اتنا نوازا ہوتا ہے کہ اس کا شکوہ کرنا بنتا ہی نہیں ہے۔" وہ رو رو کر اپنے ہی آنسو آستین سے مٹا رہی تھی۔

"لیکن بس ایک بات پوچھنا ہے مجھے۔" سسکتے ہوئے اس نے اوپر کی طرف دیکھا۔

"بس ایک بات پوچھنا ہے، شکوہ نہیں کرنا بس کچھ پوچھنا ہے۔" اس نے تیزی سے بہتے آنسوؤں کو صاف کیا۔

"کیا میں ایک بری لڑکی ہوں اللہ جی کہ جس انسان کو چاہا اس نے مجھے دو کوڑی کا کر دیا اور جس سے نکاح کیا اس نے مجھے زمین تلے پہنچا دیا......"
اس نے زمین پہ پڑے کاغذ کو دیکھا جس پہ بڑا بڑا طلاق لکھا تھا۔

"شکوہ نہیں کر رہی۔ قسم سے شکوہ نہیں کر رہی۔ بس میں تو اپنے اوپر سوال اٹھا رہی ہوں کہ کیا میں واقعی اتنی بری لڑکی ہوں کہ کوئی بھی مرد مجھے تھوک دینا پسند کرتا ہے۔"

ایک برا جملہ اس نے خود کے لیے کہا تھا۔ وہ اس سے برا جملہ کہنا چاہتی تھی۔ وہ خود کو اتنا کوسنا چاہتی تھی، طعنے دینا چاہتی تھی، لعنت ملامت کرنا چاہتی تھی کہ کیا ہی کسی نے کی ہوگی۔ یہ اس کا خود سے انتقام تھا اور اس وقت وہ جتنا منتقم ہو سکتی تھی، ہو رہی تھی۔

"بری میں ہی ہوں نا تب ہی تو بار بار میں دھتکاری جاتی ہوں۔ کمی مجھ میں ہی ہوگی نا تب ہی تو۔" اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ "تب ہی تو اللہ مجھے کوئی راس نہیں آتا۔" اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا
۔

اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ زندگی کے کچھ تلخ لمحے، کچھ پل کو ہی سہی لیکن آپ کو بھی تلخ بنا ہی دیتے ہیں
۔

"بس اتنا بتا دیں مجھ میں کیا برا ہے اللہ؟ میری لگن اور آگے بڑھنے کا جنون یا میری خودداری؟ میں انہی باتوں پہ تو دھتکاری گئی ہوں نا۔ کیا یہ سب برا ہے اللہ؟ کیا میں اسی وجہ سے بری ہوں بس اتنا بتا دیں۔"

اس نے روتے ہوئے، اوپر دیکھتے ہوئے اپنے خالق سے سوال کیا۔ خالق کی طرف سے جواب نہ ملے یہ ہو نہیں سکتا، بس جواب ملنے میں وقت لگ جایا کرتا ہے۔

اگلے دو دن تک وہ اپنے کمرے تک محدود رہی۔ وہ اپنی منفی سوچوں کے ساتھ جنگ کر رہی تھی۔ اسے اپنے دکھ کو قبول کر کے اس کے ساتھ جینے کے لیے خود کو تیار کرنا تھا اور اس سب کے لیے اسے تنہائی چاہیے تھی۔

ابا کے ساتھ امی بھی کتنی بار اس کا دروازہ بجا بجا کر جا چکی تھیں لیکن اس نے دروازہ نہیں کھولا۔ کسی سے بات نہیں کی۔ کچھ کھانے کی طلب نہیں ہوئی۔ پانی جو بوتل میں تھوڑا بہت پڑا تھا وہی پی کر گزارا کر لیا۔ وہ اپنا سیاہ پڑتا چہرہ کسی کو نہیں دکھانا چاہتی تھی۔ اسی لیے وہ نہ کمرے سے نکلی نہ ہی ہسپتال گئی۔ وہاں اس نے فون کر دیا تھا کہ وہ بہت سخت بیمار ہے اس لیے نہیں آسکتی۔ اور تیسرے دن اس کے کمرے کی کنڈی کھلی۔ وہ باہر نکلی تو اخبار پڑھتے ابا نے اخبار ایک طرف رکھ کر اسے دیکھا۔ باورچی خانے میں کچھ تلتے ہوئے امی نے ہاتھ میں کفگیر تھامے کھڑکی سے اسے جھانکا۔ شکر تھا کہ بھابھی بھائی اپنے اپنے کاموں پہ جا چکے تھے ورنہ وہ بھی اسے ایسے ہی حیرت سے تکتے جیسے وہ کوئی عجوبہ ہے۔

"جب لڑکیوں کو طلاق ہو جاتی ہے تو کیا وہ پچھل پیری بن جاتی ہیں؟" وہ ابا کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ اس کا لہجہ بالکل معمول کی طرح سادہ تھا۔ کہیں دکھ کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔ اس نے اس دکھ کو قبول کر کے، زندگی جینے کے لیے خود کو منا لیا تھا۔

"نہیں بیٹا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوتی۔" ابا زخمی سا مسکرائے لیکن انہیں اس کا معمول کا لہجہ اچھا لگا تھا۔ بہت کم وقت میں اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

"تو آپ اور امی مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں جیسے میں کوئی خلائی مخلوق ہوں۔"

امی نے جلدی سے واپس چولہے کا رخ کیا۔ ابا نے بھی اخبار اٹھا لیا اور اسے پڑھنے کی اداکاری کرنے لگے۔ وہ اس پہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ کہیں کچھ نہیں ہوا۔

"ابا۔" انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔

"زندگی ختم نہیں ہوگئی۔ نہ ہی برباد ہوگئی ہے۔ ایک باب بند ہوا ہے اور کئی باب ہیں جو ابھی باقی ہیں

۔میں ان تمام بابوں کو ٹھیک طرح سے جینے کے لیے نارمل ہوں۔ان دو دنوں میں بس میں نے اندر بند رہ کر خود کو یہی سکھایا ہے کہ مجھے اس سب کے ساتھ آگے بڑھنا ہے۔"
ابا نے داد طلب نظروں سے اسے دیکھا۔
"اور آپ کیوں اس بات پہ پچھتا رہے ہیں کہ آپ نے میری زندگی برباد کی ہے۔آپ نے کچھ نہیں کیا۔اس کا اور میرا نصیب نہیں جڑا تھا اسی لیے ٹوٹ گیا۔اور۔"
وہ ٹھہری، ابا کو دیکھا۔"اور بس۔"
ابا پھیکا سا مسکرائے۔
"تمہاری تربیت تمہاری ماں اور میں نے ایسی نہیں کی فاطمہ۔نجانے تم کہاں سے یہ سب سیکھ گئی ہو؟"
فاطمہ باپ کو دیکھے گئی۔
"سب سے بہترین تربیت زندگی ہی کرتی ہے ابا۔وہ کچھ سکھا دیتی ہے جو ماں باپ نہیں سکھا پاتے۔"
امی میز پہ ناشتا دھر رہی تھیں۔ابا نے انہیں طلاق کی کیا وجہ بتائی، بتائی بھی کہ نہیں لیکن وہ اس سے نالاں نہیں دکھائی دیتی تھیں۔بس ان کے چہرے پہ روایتی ماؤں والی فکر اور سوگ تھا جو یہ بتاتا تھا کہ اب ان کی بیٹی کا کیا ہوگا؟ وہ انہیں اس فکر سے روک نہیں سکتی تھی۔جلد یا بدیر امی سمجھ جائیں گی وہ جانتی تھی۔ہم سب تکلیفوں میں چھپی مصلحتوں کو سمجھ جاتے ہیں، بس اس سب میں وقت لگتا ہے۔
چوتھے دن ھمدان اس سے ملنے آیا تھا۔وہ کمرے میں تھی جب امی نے اسے بتایا۔
"ھمدان آیا ہے تم سے ملنے۔" وہ چونکی۔
"دانی؟"
امی کو ذرا غصہ تھا جو ان کے چہرے سے دکھائی دے رہا تھا۔
"اندر بلاؤں یا نہیں؟"
"آپ نے ابھی تک اسے اندر نہیں بلوایا؟"
اس نے ہاتھ میں تھامی کتاب جلدی سے ایک طرف رکھی اور اپنا دوپٹا اوڑھنے لگی۔
"کیا اب بھی اسے اندر بلانا بنتا ہے؟"
"امی! اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے اور آپ اچھی طرح سے جانتی ہیں میں کینہ رکھنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ویسے بھی وہ اس رشتے سے پہلے بھی اس گھر میں آتا تھا اور اب بھی جب جی کرے گا آئے گا۔پلیز اسے اندر بلائیں۔" وہ جلدی سے اپنے کھلے بال باندھنے لگی۔امی ناگوار تاثرات کے ساتھ پلٹ گئیں۔
لاؤنج میں آئی تو اس نے چادر سے خود کو چھپا رکھا تھا۔امی نے اسے تاکید کی تھی کہ وہ اس کے سامنے منہ سر کھول کر نہیں بیٹھے گی۔وہ ایک طرف جا کر بیٹھ گئی۔ھمدان نے سلام نہیں کیا۔سر جھکائے بیٹھا رہا۔اسے دیکھا تک نہیں۔سر اٹھاتا تو دیکھتا نا۔اس کا چہرہ سخت سوجا ہوا اور لال پڑ رہا تھا۔غصہ تھا، پچھتاوا تھا، شرمندگی تھی یا نجانے کیا تھا وہ جب سے آیا تھا اس کے سامنے بالکل خاموش بیٹھا تھا۔اس کے ماتھے کی رگیں باہر کو ابھری ہوئی تھیں۔خاموش بیٹھا اپنی پینٹ کی سطح پہ بنے نمونے کو انگلی سے کھرچ رہا تھا۔فاطمہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔
"اس (گالی) کو گولی مار دوں گا میں۔" وہ بولا تو فاطمہ کی آنکھیں وحشت سے پھیل گئیں۔اس نے کبھی ھمدان کو ایسے گالی دیتے نہیں دیکھا تھا۔
"اس کی ہمت کیسے ہوئی آپ کو۔" وہ بات مکمل نہیں کر سکا۔غصے سے اس کے جبڑے بھنچ گئے۔
"دانی۔۔" فاطمہ نے اسے ٹوکا۔جو بھی تھا شمشاد اس کا چاچو تھا۔وہ اپنے چاچو کے لیے ایسے نہیں کہہ سکتا تھا۔ادب لحاظ بھی کوئی شے ہوتی ہے۔
"کیا دانی؟ وہاں دوبئی میں بیٹھا عیاشیاں کر رہا ہے۔یہاں آئے تو زندہ واپس نہیں جا سکے گا۔"
"دانی۔" فاطمہ اس بار چلا اٹھی۔
ھمدان نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں اور

آنکھیں زور کی میچ لیں۔ وہ گہرے گہرے سانس باہر نکالنے لگا۔ اس کا غصے سے برا حال تھا یہ فاطمہ دیکھ رہی تھی لیکن وہ اتنا غصے میں تھا کہ فاطمہ کو اس سے ڈر لگ رہا تھا۔

''دادی، تایا سب ان کی حمایت میں بول رہے ہیں کہ اس نے ٹھیک کیا ہے۔ کیا ٹھیک کیا ہے؟ اپنی عزت کو بے عزت کر کے ٹھیک کیا ہے اس نے؟'' اس نے اب تک ایک بار بھی فاطمہ کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

فاطمہ خاموش رہی۔ اس کے گھر والوں نے اسے یہی درست کہنا تھا۔ یہ کوئی ایسے اچنبے کی بات نہیں تھی۔

''میں گھر نہیں جاؤں گا۔ میں ان لوگوں کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا جو اس (گالی) کو سپورٹ کر رہے ہیں۔''

''دانی پلیز۔'' فاطمہ نے اب کی بار ذرا نرمی سے کہا۔

''میں سچ میں پاگل ہو رہا ہوں یہ سوچ سوچ کر کہ انہوں نے یہ کیا کر دیا؟ وہ تو آپ کو پسند کرتے تھے نا۔ اتنا لڑ جھگڑ کر دادی سے یہ رشتہ جوڑا تھا پھر کیوں آخر؟''

مٹھی بنا کر اس نے میز پہ دھڑ سے ماری تو فاطمہ کا تراہ نکل گیا۔ پہلی بار اس نے ہمدان کا یہ روپ دیکھا تھا جو بالکل الگ تھا۔ وہ اتنا غصے والا بھی ہو سکتا ہے اسے نہیں پتا تھا۔

وہ اٹھ کر اس کے برابر بیٹھ گئی۔ اسے اپنے پیارے سے دوست کو سمجھانا تھا جو اس کے دکھ میں پاگل ہو رہا تھا۔

''ہمدان! میری بات دھیان سے سنو۔ مجھے نہیں پتا کہ تم یہ سمجھ سکو گے یا نہیں لیکن اب تم اتنے چھوٹے نہیں ہو تو مجھے لگتا ہے کہ تم حالات کو سمجھ سکتے ہو۔ دیکھو اس نے یہی کرنا تھا کیونکہ ہم دونوں کے مزاج میں بہت فرق تھا۔ یہ سب ابھی نہ ختم ہوتا تو شاید کچھ عرصے بعد ختم ہو جاتا۔ ابھی ختم ہونے سے میں یہ فائدہ ہوا ہے کہ میں زیادہ نقصان سے بچ گئی ہوں۔ رخصتی کے بعد وہ مجھے چھوڑتا تو تکلیف بھی زیادہ ہوتی اور نقصان بھی۔'' ہمدان نے تاسف سے سر ادھر ادھر ہلایا۔ وہ یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔

''وہ چھوڑتا ہی کیوں آپ کو مس۔؟ کوئی آپ کو چھوڑ بھی کیسے سکتا ہے مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' دو دن کمرے میں بند وہ اللہ سے کہتی رہی کہ وہ بہت بری ہے اسی لیے اس کے ساتھ یہ ہوا ہے اور اب اس کے سامنے بیٹھا وہ چھوٹا لڑکا جو نجانے کب اتنا بڑا ہو گیا، اسے جو کہہ رہا تھا وہ بالکل خاموش رہ گئی۔

''انسان کی پسند اس کی انا کے سامنے ہار جاتی ہے دانی۔ اور مرد کو اپنی انا بہت پیاری ہوتی ہے۔ مرد کبھی ایسی عورت کے ساتھ زیادہ وقت نہیں چل سکتا جو اس سے زیادہ پڑھی لکھی ہو، اپنے حق کے لیے کھڑی ہوتی ہو۔ اپنی عزت نفس کو مقدم سمجھتی ہو اور میں ایسی ہی لڑکی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ میں اس کی پسند کے مطابق نہیں ڈھل سکتی تو اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ اسے لگتا تھا کہ میں اچھی بیوی نہیں بن سکتی کیونکہ میں پڑھی لکھی اور ڈاکٹر ہوں تو اسے خوش نہیں رکھ سکتی اسی لیے، بس اسی لیے اس نے چھوڑ دیا۔''

وہ اس وقت اس کا دل اپنے گھر والوں سے برا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ غصے میں کوئی بڑا قدم اٹھائے۔ کچھ بھی الٹا سیدھا کر لے جو سب کے لیے مسائل پیدا کرے۔

ہمدان نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا۔

''چاچو نے آپ کو اس لیے چھوڑا کہ آپ پڑھی لکھی تھیں۔ ڈاکٹر تھیں؟''

فاطمہ خاموش رہی۔

''آپ کتنی بے وقوف ہیں مس۔''

فاطمہ نے اچنبے سے اسے دیکھا۔

''اس میں بے وقوفی والی کیا بات ہے؟ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں آگے مزید پڑھوں یا نوکری کروں۔ اسے میں ڈاکٹر تو قبول تھی لیکن گھر پہ بیٹھی ہوئی ڈاکٹر۔ جو مجھے قبول نہیں تھا۔''

ہمدان نے تاسف سے سر ہلایا۔

"آپ سچ میں کتنی سادہ ہیں مس۔ مجھے آپ کے لیے بہت افسوس ہو رہا ہے کہ آپ سمجھ ہی نہیں سکیں وہ کیا کر گیا ہے آپ کے ساتھ۔" فاطمہ نے گردن ترچھی کر کے اُسے دیکھا۔ کچھ تھا جو اسے نہیں پتا تھا۔ کچھ ایسا جو ہمدان جانتا تھا بلکہ اس کا پورا خاندان جانتا تھا اور وہ نہیں جانتی تھی۔

"جو کچھ آپ کہہ رہی ہیں اگر اس نے آپ سے یہ سب کہا ہے تو اس نے آپ کو بے وقوف بنایا ہے۔"

فاطمہ کی آنکھوں میں اب الجھن تیرنے لگی تھی۔

"اس نے وہاں کل شادی کر لی ہے۔" فاطمہ کا رنگ سیاہ پڑا۔ شادی۔ اس ایک لفظ نے اس کا اعتماد ڈگمگا دیا۔

مطلب کہ ابھی ہفتہ نہیں گزرا تھا اس کی طلاق کو اور اس نے شادی بھی کر لی۔ وہ اتنی جلدی آگے بڑھ گیا۔ اتنی جلدی سب بھول گیا۔ لیکن کوئی اتنی جلدی اتنا بڑا فیصلہ نہیں لیا کرتا۔ اتنی تیزی سے گھر ٹوٹ جانے، رشتہ ٹوٹ جانے جیسے صدمے سے نہیں گزر جایا کرتا۔ اس کی تو پسند نہیں تھی تو بھی اسے سنبھلنے میں دو دن تو لگے تھے اور وہ اتنی جلدی سنبھل گیا تھا جس کی اس رشتے میں پسند شامل تھی۔ ناممکن۔

"اور وہ بھی ایک ڈاکٹر سے۔" اس کے سر پہ جیسے ایک بھاری وزنی شے آ کر ٹکرائی اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ نظروں کے سامنے سب دھندلا گیا۔

"اگر اسے گھر بیٹھی ڈاکٹر قبول نہ ہوتی تو ایک ڈاکٹر سے ہی شادی کیوں کرتا؟ اس نے بس آپ کو نیچا دکھایا ہے۔ وہ اور کسی طریقے سے آپ کو نیچے نہیں جھکا سکا تو یہ اوچھا کام کیا ہے۔" فاطمہ ایک ٹک اسے دیکھتی رہی۔

"اس کا شاید پہلے سے ہی اس ڈاکٹر کے ساتھ افیئر تھا ورنہ کوئی اتنی جلدی کیسے دوسری شادی کر سکتا ہے۔"

اس سے زیادہ اس سے سنا نہیں گیا۔ وہ وہاں سے اٹھی اور ڈگمگاتے قدموں سے چلتی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

ہمدان نے بھینچے لبوں سے اسے جاتے دیکھا۔ زندگی میں کبھی اتنا تاریک چہرہ، شکستہ قدم، مایوس آنکھیں اس نے نہیں دیکھی تھیں۔

"تم یہاں آئے نا تو مجھے کسی کی قسم میں تمہیں گولی مار دوں گا۔" اس نے موبائل نکال کر اسی وقت شمشاد کو میسج کیا تھا۔

اگلے دو دن اسے اس صدمے سے نکلنے میں لگے تھے کہ شمشاد نے اسے چھوڑ کر شادی کی بھی تو ایک ڈاکٹر سے۔ تو یہ طے تھا کہ شمشاد نے اسے اس لیے نہیں چھوڑا تھا کہ وہ پڑھی لکھی ڈاکٹر تھی۔ گھر نہیں سنبھال سکتی تھی۔ بلکہ وہ پہلے سے کسی اور کا گرویدہ ہو چکا تھا اسی لیے اسے چھوڑنا ضروری تھا۔

"ہمدان ٹھیک کہتا ہے کہ میں بہت سادہ اور معصوم ہوں۔" اس نے کئی بار شمشاد کو کال ملا کر کاٹ دی۔ اب اس سے کیا بات کرنا جب وہ اسے اپنی زندگی سے الگ کر چکا تھا۔

"بلکہ میں بے وقوف ہوں۔" اس نے فوراً تصحیح کی۔

صدمہ کتنا ہی بڑا کیوں نا لگے، اس کے اثر سے جلد از جلد نکلنا ذہنی صحت کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ اس نے بھی خود کو اس دہرے صدمے سے نکالا اور دو دن بعد پھر سے ہسپتال جانے لگی۔ زندگی کچھ معمول پہ آنے لگی تھی۔ اس نے آگے مزید پڑھنے کا ارادہ کر لیا اور خود کو مصروف کر لیا تاکہ کم سے کم سوچ سکے۔

"آگے کا کیا سوچا ہے تم نے؟" امی اس دن اس کے کمرے میں اس کے دھلے ہوئے کپڑے الماری میں رکھنے آئیں تو اسے پڑھتے دیکھ کر پوچھا۔

"پیپر زدوں گی۔ وہ کلیئر ہوں گے تو دیکھوں گی

۔"

"میں پڑھائی کی بات نہیں کر رہی۔" وہ امی سے نظریں چرا گئی۔

"جو آپ پوچھ رہی ہیں اس کا میں نہیں سوچنا چاہتی۔"

"کیوں نہیں سوچنا چاہتیں۔ کیا اسی طرح بیٹھی رہو گی؟ پتا بھی ہے وہ شمشاد تو کب کی شادی کر چکا ہے۔ مجھے صالحہ باجی سے پتا چلا۔ بتا رہی تھیں کہ ہمدان نے گھر میں بہت ہنگامہ کیا تھا۔ ممتاز نے سختی سے شمشاد کو کہہ دیا ہے کہ وہ پاکستان نہ آئے ورنہ ہمدان کا کچھ پتا نہیں ہے کہ کیا کر گزرے۔"

فاطمہ نے گہرا سانس لیا۔

"جانتی ہوں۔ وہ ٹاپک کلوز ہو چکا ہے امی۔ اس کا نام مت لیا کریں۔"

"میری طرف سے جہنم میں جائے۔ میں کیوں لینے لگی اس کا نام۔ صرف بتا رہی ہوں کہ وہ کب کی شادی کر چکا اور تم کب تک بیٹھے رہنے کا ارادہ رکھتی ہو؟"

"ابھی صرف پڑھائی کا سوچا ہے۔ جب کچھ وقت گزرے گا تو اس بارے میں بھی سوچ لوں گی۔"

"وقت گزر جانے سے پہلے سوچ لو تو اچھا ہے۔"

اس نے امی کی طرف دیکھا۔

"وقت سے زیادہ انسان کا مقدر ہوتا ہے امی۔ نکاح تو آپ نے میرا ابھی وقت سے کر دیا لیکن مقدر نہیں تھا تو ختم ہو گیا۔" امی کچھ بول نہیں سکیں۔

ہمدان کبھی کبھار ملنے آتا تھا اس سے لیکن پہلے سے بہت خاموش ہو گیا تھا۔ بس سر جھکا کر بیٹھا رہتا۔ کچھ باتیں وہ پوچھتی تو جواب دے دیتا ورنہ زیادہ تر چپ ہی رہتا تھا۔

"ایسے مت کرو دانی۔ توتے بولتے ہوئے پیارے لگتے ہیں۔" اسے بچپن کا چھوٹا سا ہمدان اب تک یاد تھا۔

"زبان کاٹ دی ہے کسی صیاد نے میری۔ اور پتا ہے جب اس کٹی زبان سے گھر میں چلتا پھرتا ہوں تو سب کے دل کٹ جاتے ہیں اور میرا دل جڑ جاتا ہے۔"

فاطمہ کو دکھ ہوتا۔ وہ اتنا سنجیدہ نہیں تھا جتنا ہو گیا تھا۔ وہ اس کی سزا خود پہ لے کر، اپنے گھر والوں کو لوٹا رہا تھا۔ یہ اس کا بدلہ لینے کا عجب طریقہ تھا۔

"میں سنبھل گئی ہوں ہمدان۔ تم کب سنبھلو گے؟"

"جب آپ سچ مچ سنبھل جائیں گی تو ہمدان بھی سنبھل جائے گا۔"

اس کی بات کا مطلب وہ جانتی تھی۔

☆☆☆

اذکار جب سے ہوش میں آیا تھا بالکل خاموش اور گم صم تھا۔ اس نے نہ ہی کسی کی طرف دیکھا نہ بات کی حالاں کہ دانش اس کے پاس بیٹھا اس کے ہاتھوں کو تھپکتا، چومتا رہا۔ اسے بار بار بلانے کی کوشش بھی کرتا رہا لیکن اس کے وجود میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ اس کی آنکھیں ایسی تھیں جن میں زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی۔ وہ آنکھیں کہیں سے بھی کسی بچے کی آنکھیں نہیں تھیں۔ رطابہ نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ وہ خود بالکل شاکڈ تھی، اس نے اذکار کی بیماری کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اسے یقین تب تک نہیں آنا تھا جب تک ٹیسٹ کی رپورٹس نہ آ جائیں۔

"بیٹا! کچھ تو بولو۔ ایسے چپ کیوں ہو؟" رطابہ نے اسی میں عافیت جانی تھی کہ وہ خاموش تھا۔ دانش کی کوشش کرتا رہا کہ وہ بولے لیکن ناکام ہی اٹھ گیا۔

"اس کی ایسی حالت کیوں ہے جیسے شاک میں ہو؟" کمرے سے باہر نکلتے ہی دانش نے رطابہ کا رستہ روکا۔ وہ کچھ ہچکچا کر، نظریں چراتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"میں نہیں جانتی۔"

"اس وقت تم اس کے ساتھ تھیں نا جب وہ

بے ہوش ہوا تھا؟" دانش اسے جانچتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ رطابہ اس سے نظریں چرا رہی تھیں جو وہ صاف محسوس کر سکتا تھا۔

"مجھے سچ بتاؤ رطابہ، کچھ ہوا ہے؟" رطابہ نے اسے ایک نظر دیکھا اور ایک طرف سے نکل کر آگے چلی گئی۔ دانش وہیں کھڑا اس عورت کی ڈھٹائی پہ حیران رہ گیا۔

وہ واپس اندر اذکار کے پاس لوٹ گیا۔

شام تک فاطمہ بھی اس کے پاس ہسپتال پہنچ چکی تھی۔ اسے دانش نے ہی فون کر کے بتایا تھا۔

"تم کوشش کرو فاطمہ، کہ وہ کوئی بات کرے۔ کچھ تو کہے۔ وہ تم سے اٹیچڈ ہے۔ تمہاری بات بہت سنتا ہے۔" فاطمہ سر ہلاتی اس کے کمرے میں چلی گئی۔

"ذکی۔ دیکھو خالہ آئی ہیں۔" خالہ کی آواز پہ بند آنکھیں کھل گئیں اور فاطمہ کو دیکھتے ہی ان میں پانی بھر آیا۔ وہ ہچکیوں سے رونے لگا تھا۔

"ذکی۔ میرے بچے کیا ہوا؟ ایسے کیوں رو رہے ہو؟" اس کے بستر پہ ٹکنے کے سے انداز میں وہ بیٹھ گئی اور اس کے بال سہلانے لگی۔ وہ کتنی دیر روتا رہا۔

"جانی۔ خالہ کو تو بتا دو۔ ہم تو بیسٹ فرینڈز ہیں نا۔ کچھ ہوا ہے تو خالہ سے شیئر کرو۔"

اس نے اذکار کے آنسو پونچھے اور اس کے گال تھپکنے لگی۔

کچھ دیر تک وہ خاموش ہو گیا اور جو کچھ بھی ہوا تھا اس نے روتے ہوئے سب فاطمہ کو بتا دیا۔ فاطمہ کسی بت کی طرح بیٹھی سب سنتی رہی۔ اس کی بہن، اپنے ہی بچے کے ساتھ، گھر کے پرانے ملازم کے ساتھ، اتنا گھناؤنا کھیل کھیل چکی تھی۔ اس نے اپنے بچے کی ذہنی حالت تک کی پروا نہیں کی کہ اس معصوم پہ کیا بیتے گی۔

"اٹ واز نوٹ آ بیڈ ٹچ خالہ"

کچھ عرصے پہلے ہی جب وہ رہنے آیا تھا تو فاطمہ نے ہی اسے گڈ اور بیڈ ٹچ کا بتایا تھا کہ وہ اب بڑا ہو رہا تھا۔ اس دور میں بچوں کی حفاظت کے لیے انہیں اتنا پتا ہونا چاہیے کہ انہیں کس انسان سے کیسے ملنا اور پیش آنا ہے۔ کس کے قریب رہنا اور کس سے دور جانا ہے۔ اور اذکار کو یہ سب فاطمہ نے بہت طریقے سے سمجھایا تھا۔ جو باتیں والدین کے سمجھانے کی تھیں وہ اکثر فاطمہ اسے سمجھا دیتی کہ وہ یہ بات بخوبی جانتی تھی کہ رطابہ کے پاس اولاد کے لیے وقت ہی کہاں ہوتا ہے۔

"baba is just like grandfather" (بابا میرے لیے دادا جیسے دادا) وہ پھر سے رونے لگا تھا۔

فاطمہ نے اسے ساتھ لگا لیا۔ یہ سب وہ سمجھتی تھی تو کیا رطابہ نہیں سمجھتی ہو گی۔ اپنی بہن کی ذہنیت سے بھی وہ واقف تھی۔ اس نے یقیناً یہ سب کسی اور مقصد سے کیا تھا۔

"بابا کو ماما نے گھر سے نکال دیا۔ پتا نہیں وہ کہاں گئے ہوں گے خالہ؟"

"ہم انہیں ڈھونڈ لیں گے تم پریشان مت ہو۔ وہ کہیں نہیں جاتے۔ اور یہ رونا بالکل بند کرو۔ رونے سے اور طبیعت خراب ہو جائے گی۔" وہ اس کے پاس بیٹھی کتنی دیر اسے تھپکتی رہی حتیٰ کہ وہ سو گیا۔

جب وہ باہر نکلی تو کاریڈور میں دانش نہیں تھا۔ کچھ دیر وہ وہیں کھڑی رہی پھر اس نے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی جب اسے دور سے رطابہ آتی دکھائی دی جو کسی ڈاکٹر سے بات کر رہی تھی۔ رطابہ نے اسے دیکھا تو دور سے رکنے کا اشارہ کیا۔ فاطمہ کو چار و ناچار رکنا پڑا۔ وہ ڈاکٹر سے فارغ ہو کر سیدھا اس کے پاس آئی تھی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" اس کے ماتھے کی شکنیں دور سے بھی فاطمہ کو دکھائی دے گئی تھیں۔ اسے یقیناً اس کا یہاں آنا برا لگا تھا۔

"میں ذکی کو دیکھنے آئی تھی۔ لیکن جو کچھ اس سے پتا چلا یقین نہیں آیا مجھے۔ کوئی اپنی اولاد کے

سامنے بھی ایسی گری ہوئی حرکت کر سکتا ہے۔ کم از کم اس بات کا ہی خیال کر لیتیں کہ اس بچے پہ کیا گزرے گی۔"

رطابہ نے دانت پیستے ہوئے اسے دیکھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ اذکار فاطمہ کے سامنے منہ کھول دے گا۔

"نجانے آپ کب سمجھیں گی باجی، کہ اللہ نے آپ کو کتنا نوازا ہوا ہے اور آپ اس کی دی گئی نعمتوں کے ساتھ کیا کر رہی ہیں۔ آپ سے بڑی ناشکری عورت میں نے کبھی نہیں دیکھی۔"

"میں جو بھی کروں وہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔"

"میرا مسئلہ میرا بھانجا ہے جو مجھے بہت پیارا ہے۔"

"وہ سب سے پہلا میرا بیٹا ہے۔ اور اس کا اچھا برا میں بھی سمجھتی ہوں۔"

"بدقسمت ہے کہ وہ آپ کا بیٹا ہے کیونکہ آپ سے زیادہ اس کے ساتھ برا کوئی کر بھی نہیں سکتا۔"

رطابہ کا چہرہ لال پڑا۔

"شٹ اپ۔ اینڈ گیٹ لاسٹ۔ اس سے پہلے کہ میرا ہاتھ اٹھ جائے اور یہاں تماشا کھڑا ہو جائے۔" وہ یہ تماشا کھڑا کر بھی دیتی جو وہ ایک پروفیشنل پلیس نہ ہوتی تو۔

فاطمہ اسے تاسف سے دیکھتے ہوئے ایک طرف سے نکل کر باہر کی طرف چلی گئی۔

"ڈاکٹر رطابہ۔" وہ اسے مٹھیاں، لب بھینچے، جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی جب پیچھے سے کسی نے اسے پکارا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو ہسپتال کے سی ای او کی بیگم کھڑی تھی۔ ڈاکٹر ریچل۔ جو اس وقت ہسپتال کا راؤنڈ لے رہی تھی۔ رطابہ کو وہ لڑکی زیادہ پسند نہیں تھی لیکن اسے برداشت کرنا اس کی مجبوری تھی۔

"یہ لڑکی۔ آئی مین آپ اسے جانتی ہیں؟"

"شی از مائی سسٹر۔"

"آئینور فاطمہ گل از یور سسٹر؟" رطابہ چونکی۔

"آپ اسے کیسے جانتی ہیں؟"

"شی واز مائی کلاس میٹ۔"

"اوہ۔ ریئلی۔" رطابہ نے ہونٹ سکوڑے۔ پھر زبردستی مسکرا دی۔

ریچل اس سے اذکار کے بارے میں پوچھنے لگی۔

"ٹیسٹ یقیناً نارمل آئیں گے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ میرا بیٹا ہارٹ پرابلم کا شکار ہو اور مجھے ہی نہ پتا ہو۔ ڈاکٹر منصور کو ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔"

ڈاکٹر ریچل جانتی تھی کہ ڈاکٹر رطابہ کو اپنی پروفیشنل ایگو پہ کتنا گھمنڈ ہے۔ اس لیے اس نے مسکرا کر بس اتنا ہی کہا۔ "آئی وش۔"

رطابہ کھل کر مسکرا دی جیسے اسے خود پہ بہت بھروسا ہو۔

"آئینور کی شادی تو ہو گئی ہو گی؟ کالج میں تھے تو نکاح ہوا تھا۔"

رطابہ طنزیہ مسکرائی۔

"اسے ڈائیورس ہو گئی تھی۔" ریچل کچھ شاکڈ سی اسے دیکھنے لگی۔

"ڈائیورس۔"

"اس کے بعد اس نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ابھی تک تو بیچلرز لائف ہی انجوائے کر رہی ہے۔"

"آئی ایم سوری۔" ریچل شرمندہ سی دکھائی دینے لگی۔ لیکن رطابہ کے لب و لہجے میں بہن کے لیے کسی قسم کا دکھ نہیں تھا۔

"ویل یہ اس کا اپنا فیصلہ ہے۔ ہم کیا کر سکتے ہیں؟" رطابہ نے شانے اچکائے۔ تب ہی اس کا موبائل بجنے لگا۔ ڈاکٹر منصور کی کال آ رہی تھی۔ وہ ریچل سے معذرت خواہانہ انداز میں اجازت لے کر ایک طرف چلی گئی۔

ریچل کی آنکھوں میں پشیمانی اور پچھتاوا ابھرا تھا۔ تب ہی اس نے موبائل نکالا اور اپنے کانٹیکٹ نمبر سے ایک نمبر پہ کال ملانے لگی۔ وہ نمبر اس کے

موبائل میں ایس عباد کے نام سے محفوظ تھا۔

☆☆☆

دانش کچھ دیر کے لیے گھر آیا تھا۔ کرنل پاپا اپنے کمرے میں آرام کر رہے تھے۔ انہوں نے فون کر کے ہی اذکار کی طبیعت پوچھ لی تھی۔ ان کا ارادہ رات میں ہسپتال کا چکر لگانے کا تھا۔ اس وقت وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہے تھے۔

"عابدہ۔ اذکار کے لیے دلیہ بنا دو۔"

عابدہ کچن میں تھی جب دانش نے کچن میں جھانکا۔

"ذکی بابا ٹھیک ہیں اب؟"

"دعا کرو۔" اس کے چہرے پہ پریشانی صاف واضح تھی۔

"زیور بابا کہاں ہیں؟" یونہی دانش کو خیال آیا کہ ان سے دعا کا بولے۔ وہ ہمیشہ جب پریشان ہوتا انہیں دعا کے لیے کہا کرتا۔ عابدہ کا رنگ پھیکا پڑا۔

"معلوم نہیں۔ لیکن وہ گھر پہ نہیں ہیں۔" دانش چونکا۔ زیور بابا مغرب کے بعد اکیلے گھر سے نہیں نکلتے تھے۔ کبھی ضروری کام سے نکلنا ہوتا بھی تھا تو ڈرائیور انہیں لے کر جاتا تھا۔

دانش نے بغور عابدہ کو دیکھا جس کی اڑی ہوئی رنگت سے وہ کافی کچھ جان گیا تھا۔

"کل یہاں کیا ہوا تھا عابدہ؟" عابدہ کشمکش و پنج میں تھی کہ جو کچھ بھی ہوا وہ بتائے یا نہیں۔ پھر اس نے نہ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

"میں نہیں جانتی چھوٹے صاحب۔" وہ اسے گھور کر دیکھتا رہا۔

"ظالم اس لیے ظالم ہوتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مظلوم کبھی نہیں بولے گا۔ وہ ڈرتا رہے گا اور ظلم سہتا رہے گا اور اس طرح ظالم کی پکڑ کبھی نہیں ہو گی۔" عابدہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ دانش کی نگاہوں سے جو تحریر پڑھنے کو ملی تھی وہ یہی تھی کہ وہ جانتا ہے جو کچھ ہوا ہے بس تفصیل سننا چاہتا ہے۔

"ایسے میں ظالم کو سزا سنانے سے پہلے مظلوم کو کوڑے مارنے چاہئیں جو ظالم کی پشت پناہی کرتا ہے۔"

عابدہ نے سر جھکا لیا۔ یہ طے تھا کہ وہ منہ نہیں کھولے گی۔ اسے زیور بابا سے کیا وعدہ یاد تھا۔ وہ وعدہ خلافی نہیں کر سکتی تھی لیکن وہ جھوٹ بھی نہیں بولنا چاہتی تھی۔

"میں کسی سے کیے وعدے کی پابند ہوں صاحب۔ بہتر ہو گا کہ آپ ذکی بابا سے پوچھ لیں۔" دانش نے گہرا سانس لیا۔

"وہ صدمے میں ہے۔ کچھ نہیں بول رہا۔" عابدہ کا اترا چہرہ مزید اتر گیا۔

"نجانے زیور بابا کہاں گئے ہوں گے؟" وہ پریشانی سے باہر نکلا تو عابدہ انہیں روکنے کے لیے آگے بڑھی پھر یک دم خاموش ہو گئی۔ اسے یہ راز راز ہی رکھنا چاہیے تھا۔

رات کھانے سے پہلے دانش ہسپتال کے لیے نکل رہا تھا جب فاطمہ گھر آئی تھی۔

"کیا میں زیور بابا سے مل سکتی ہوں؟" دانش اسے باہر ڈرائیو وے پہ مل گیا تھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھ چکا تھا جب گیٹ سے وہ اندر آئی تو اسے دیکھ کر اتر گیا۔

"وہ یہاں نہیں ہیں۔ تمہاری اس کمینی بہن نے نجانے یہاں کیا تماشا کیا ہے کہ زیور بابا غائب ہیں اور ذکی ہسپتال میں پڑا ہے۔" فاطمہ کا سر بہن کی وجہ سے شرمندگی سے جھک گیا۔

"ذکی نے کچھ بتایا؟" فاطمہ خاموش رہی۔ وہ جھوٹ نہیں بولنا چاہتی تھی اور سچ اس گھر کو جلا سکتا تھا۔ اسے اس گھر کے بچوں کا خیال تھا اسی لیے اسے چپ رہنا پڑا۔

"کہاں مل سکتے ہیں بابا؟" دانش نے شانے اچکائے۔

"مجھے پتا ہوتا تو انہیں واپس نہ لے آتا۔ اس وقت میں اتنا پریشان ہوں کہ سمجھ میں نہیں آ رہا انہیں ڈھونڈوں یا ذکی کے پاس جاؤں۔"

"آپ ہاسپٹل جائیں۔ میں یہاں دیکھتی ہوں۔" وہ انہیں بھیج کر خود اندر چلی گئی۔ کچن میں عابدہ کھانا بنا رہی تھی۔ فاطمہ نے اسے سلام کیا۔ حال احوال پوچھا۔

"آپ جانتی ہیں نا کہ زیور بابا کہاں ہیں؟" عابدہ نظریں چرا گئی۔ فاطمہ ہولے سے مسکرا دی۔ اس نے یونہی ہوا میں تیر چلایا تھا جو ٹھیک جگہ لگا تھا۔

"ذکی کا واسطہ دے رہی ہوں آپ کو کہ مجھے بتائیں وہ کہاں ہیں؟ ذکی اس وقت بری حالت میں ہے۔ ہمیں زیور بابا کو اس سے ملوانا ہوگا ورنہ وہ ٹھیک نہیں ہو پائے گا۔" عابدہ چونکی۔

"کیا ہوا ہے ذکی بابا کو؟" فاطمہ خاموش رہی۔

"ڈاکٹرز کو لگتا ہے کہ اس کے دل میں سوراخ ہے۔ اب ٹیسٹ سے ہی کنفرم ہوگا۔" عابدہ نے دل پہ ہاتھ رکھ لیا۔

"میں سب جانتی ہوں جو کچھ بھی یہاں ہوا ہے عابدہ۔ وہ مجھے سب بتا چکا ہے کہ باجی نے کیا کیا ہے۔ میں اپنی بہن کی ان حرکتوں کی وجہ سے بس شرمندہ ہی ہو سکتی ہوں۔ اس وقت مجھے اذکار کی فکر ہے۔ آپ مجھے بابا کا بتا دیں گی تو یہ مشکل کافی کم ہو جائے گی۔ اگر کچھ بھی جانتی ہیں تو پلیز اس بچے کے لیے بابا کا بتا دیں۔ بابا کا ذکی سے ملنا ضروری ہے ورنہ وہ اس صدمے سے نہیں سنبھل پائے گا۔" فاطمہ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور عابدہ کے سامنے باندھ دیے۔ کسی پیارے کے لیے ہاتھ جوڑنے میں کیا قباحت تھی۔

عابدہ نے جلدی سے بڑھ کر اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"نہیں باجی، ایسے نہیں کریں۔ میں تو اس گھر کی ملازمہ ہوں اور آپ مالکوں میں سے ہیں۔ یوں ہاتھ مت جوڑیں۔ میں بتا دیتی ہوں صرف ذکی بابا کے خیال سے۔ بابا محفوظ ہیں۔ میں انہیں یہاں سے اپنے گھر لے گئی تھی۔ وہ وہیں ہیں اس وقت میرے شوہر اور بچوں کے ساتھ۔" فاطمہ نے سکھ کا سانس لیا۔

"انہیں کل یہاں لے آئیں عابدہ۔ انہیں کہیں بھلے وہ گھر کے اندر نہ آئیں۔ باہر تک آ جائیں لیکن بس آ جائیں۔ انہیں بتایئے گا کہ ذکی بیمار ہے۔ اسے ان کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ ذکی ان سے مل لے گا تو اس کا یہ دکھ اور صدمہ کم ہوگا۔ اس کی طبیعت میں بہتری آنے لگے گی۔ ہمیں اس کے علاج میں آسانی ہو جائے گی۔ کل شاید وہ ڈسچارج ہو جائے لیکن اس سے پہلے بابا کا یہاں ہونا بہت ضروری ہے۔" عابدہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے سر ہلایا۔

فاطمہ پھیکا سا مسکرا دی۔

☆☆☆

اذکار کی رپورٹس ڈاکٹر منصور کی تشخیص کے مطابق ہی تھیں۔ فی الوقت اسے ادویات اور ہدایات دے کر گھر بھیجا جا رہا تھا لیکن آپریشن ہی آخری حل تھا۔ رطابہ چاہتی تھی کہ جو کام بعد میں ہونا ہے وہ جلد از جلد کر لیا جائے۔

رطابہ ہاتھ میں رپورٹس پکڑے بے یقینی سے انہیں دیکھ رہی تھی کہ اس کے بیٹے کو بھی دل کا مسئلہ ہو سکتا ہے۔ وہ جو خود ہارٹ سرجن تھی۔

"مجھے کیسے نہیں پتا چل سکا آخر؟" ڈاکٹر منصور اس کی کیفیت سمجھتے تھے۔ وہ ایک بے حد قابل ڈاکٹر تھی جس نے بہت ہی کم عمری میں بہت کامیابی سمیٹی تھی۔ انتہائی مشکل سرجریز کی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں اللہ نے بہت شفا بھی رکھی تھی۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ اپنی قابلیت کو لے کر کتنے پاگل پن کا شکار تھی۔ اسے لگتا تھا کہ وہ اپنے سے کئی سال سینئر ڈاکٹرز کے برابر کی قابلیت رکھتی ہے بھلے اس کا تجربہ ان سے کم ہی کیوں نہ ہو۔ اسی لیے وہ زیادہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی اور ان کے نزدیک یہی اس کی سب سے بڑی برائی تھی۔

قابلیت پہ گھمنڈ انسان کو بہت دیر تک کامیاب

نہیں رہنے دیتا۔

"ڈاکٹر رطابہ ایک قابل استاد کی اولاد ہمیشہ قابل نہیں نکلتی۔ عالم کے گھر جاہل پیدا ہو سکتا ہے۔ پولیس کا بچہ بھی چوری کر سکتا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر کا بچہ اسی بیماری کا شکار ہو جائے جس کا وہ ڈاکٹر ہے تو اس میں کیا اچنبے کی بات ہے۔ آخر اتنی سی بات کو آپ کیوں قبول نہیں کر پا رہیں۔"

لیکن یہ بات رطابہ کو سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

"ڈاکٹر مسیحا ہوتے ہیں رطابہ، خدا نہیں ہوتے کہ سب اپنے ہاتھ میں لے سکیں۔ وہ علاج کرتے ہیں، صحت یاب نہیں کرتے۔ ان کی ایک حد ہوتی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ وہ انسان ہیں اور ان کا علم محدود ہے۔ اینڈ مائنڈ اٹ ڈاکٹر رطابہ، کہ ہر علم والے پہ ایک علم والا ہوتا ہے۔ اور سب سے بڑا علیم وہ ہے جو اوپر ہے۔ اس کے سامنے ہمارا علم کچھ نہیں ہے۔" ڈاکٹر منصور نے بہت نرمی سے اسے سمجھایا لیکن وہ بے یقینی سے بس انہیں دیکھ کر رہ گئی۔

☆☆☆

اذکار گھر پہنچا تو زیور بابا گیٹ کے باہر ہی گھاس پہ بیٹھے تھے۔ وہ صبح سے ہی اس کے منتظر تھے جب سے عابدہ نے انہیں بتایا تھا۔

وہ جلدی سے اتر کر ان کی طرف لپکا اور زور زور سے رونے لگا۔ گاڑی میں فاطمہ اور دانش ہی موجود تھے۔ رطابہ ہسپتال ہی رک گئی تھی۔ اسے اذکار کا کیس کچھ مزید سینئرز سرجن سے ڈسکس کرنا تھا۔

کبھی وہ ان کے سامنے ہاتھ جوڑتا اور کبھی ان کے گلے لگ جاتا۔ وہ ان سے ایک ہی بات کہے جا رہا تھا۔

"معاف کر دیں بابا۔ معاف کر دیں ہمیں۔"

دانش اور فاطمہ کی آنکھیں اس بچے کی حالت دیکھ کر بھرا گئیں۔ نجانے وہ اندر سے کس آگ میں جل رہا تھا۔ کس تکلیف سے گزر رہا تھا وہ بھی اس ہستی کی وجہ سے جو اولاد کے لیے دنیا میں سب سے اہم اور سکون کی ضامن ہوتی ہے۔ اس کی اپنی ماں۔

بابا بھی خاموشی سے آنسو بہا رہے تھے۔ اس کا سر تھپک رہے تھے، اس کے بندھے ہاتھوں کو بار بار کھول رہے تھے جنہیں وہ بار بار ان کے سامنے جوڑ کر معافی مانگنے لگ جاتا تھا۔ جب وہ ان کے گلے لگتا تو اس کا سر تھپک کر اسے پیچھے کرتے۔ جو والہانہ محبت وہ لٹایا کرتے تھے وہ مفقود تھی۔ رطابہ کے لگائے الزام نے انہیں تین دن میں بے حد اتنا محتاط کر دیا تھا کہ وہ اس کے قریب ہونے سے بھی جھجک رہے تھے۔ دانش نے اذکار کو پیچھے کیا۔

"اندر چلیں بابا۔" بابا کرنٹ کھا کر پیچھے ہوئے۔

"نہیں بیٹا۔ میں بس ذکی بابا سے ملنے آیا تھا۔ مل لیا تو تسلی ہو گئی۔"

"بابا! یہ آپ کا گھر ہے۔ اندر چلیں پلیز۔"

"نہیں بابا۔ میں پھر آؤں گا۔ روز آؤں گا۔ بلا ناغہ آؤں گا لیکن اندر نہیں جاؤں گا۔ میں دن رات بابا کے لیے دعا کروں گا مگر اندر نہیں جاؤں گا۔ میں جنت سے نکالا ہوا ہوں، اب واپس جنت نہیں جا سکتا۔" وہ ہاتھ ہوا میں ہلاتے ہوئے تیزی سے پلٹے۔

"اندر نہیں جا سکتا میں بابا۔ اندر کبھی نہیں جا سکتا۔" ہاتھ کو انکار کی صورت ہوا میں جھلاتے وہ تیزی سے دور ہوتے گئے۔

دانش ان کو آوازیں دیتا رہ گیا لیکن انہوں نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

"ایک عزتِ نفس ہی تو تھی اس انسان کے پاس وہ بھی نہیں چھوڑی اس عورت نے۔" دانش بڑبڑایا۔

فاطمہ اذکار کو تھام کر اندر لے گئی۔

رات میں فاطمہ اذکار کو سلا کر جب چہل قدمی کے لیے باہر لان میں آئی تو رطابہ وہیں جھولے پہ بیٹھی تھی۔ وہ بالکل گم صم تھی۔ خون کی کشش تو بہر حال ہوتی ہی ہے اسی لیے فاطمہ کو بہن سے

ہمدردی ہوئی۔

''ذکی ٹھیک ہو جائے گا باجی۔'' وہ خاموشی سے دبے قدم اس کے پاس چلی گئی۔ رطابہ نے چونک کر اسے دیکھا لیکن کہا کچھ نہیں۔

''یہ بس آزمائش ہے اگر آپ سمجھیں تو۔''

رطابہ اسے دیکھتی رہی۔ فاطمہ کو لگا تھا کہ وہ چوٹ کھائے ہوئے ہے اسی لیے اسے سمجھانے کا یہی موقع مناسب ہے۔ پتھروں پہ زلزلے آئیں تو وہ شق ہو جاتے ہیں، گر جاتے ہیں۔ ایسا ہی رطابہ کے ساتھ ہوا تھا لیکن فاطمہ بس یہ بھول گئی تھی کہ کچھ دل پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہوتے ہیں جنہیں حالات کے چھوٹے موٹے زلزلے اتنی آسانی سے شق نہیں کر پاتے۔

''ذکی بچہ ہے۔ بچے اللہ کے باغ کے پھول ہوتے ہیں۔ اللہ نے یہ تکلیف اسے نہیں دی۔ اللہ نے اس کے ذریعے یہ تکلیف آپ کو دی ہے تاکہ آپ سنبھل سکیں۔ یہ تو اللہ کا شکر ہے تاکہ اس نے وقت سے بیماری کھول دی۔ دیر ہو جاتی تو نقصان ہو سکتا تھا۔ لیکن اس سب میں آپ کے لیے سبق ہے باجی کہ جو دے سکتا ہے وہ لے بھی سکتا ہے اور انسان اس مالک کے سامنے کچھ نہیں کر سکتا۔'' رطابہ بس اسے دیکھ رہی تھی لیکن اندھیرے میں اس کے چہرے پہ ناگوار تاثرات کو فاطمہ دیکھ نہیں سکی تھی ورنہ شاید آگے کچھ نہ کہتی۔

''آپ کو اللہ نے ہمیشہ عطا کیا ہے اور بہت آسانی سے عطا کیا ہے بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ جن لوگوں کو اللہ بنا مانگے دیتا ہے، آپ ان میں سے ایک ہیں۔ کبھی آپ سے کچھ نہیں لیا، کسی مشکل اور پریشانی میں نہیں ڈالا۔ لیکن بدلے میں کبھی آپ نے یہ تسلیم نہیں کیا کہ جو نعمتیں بھی آپ کو حاصل ہیں وہ اللہ کی دین ہیں۔ میڈیکل کی تعلیم، ایک مخلص شوہر، اچھا سسرال، اتنی اچھی نوکری، پیارے اور قابل بچے، مال و دولت، عزت۔ اللہ نے آپ پہ بے پناہ کرم کیا ہے تو آپ پہ بھی شکر واجب تھا لیکن آپ نے ہمیشہ نخوت سے اس سب کو دیکھا۔ ہمیشہ اس گھمنڈ میں مبتلا رہیں کہ آپ اس قابل تھیں تو یہ سب آپ کے پاس ہے۔ یہ رویہ غلط ہے باجی۔ نعمتیں شکر کرنے سے بڑھتی ہیں۔ شکر ہم پہ واجب ہے کیونکہ ہم بنا مانگے بہت نوازے گئے ہیں۔ شاید اس تکلیف سے اللہ آپ کو کچھ سمجھانا چاہتے ہیں۔''

یہ وہ لڑکی کہہ رہی تھی جسے کچھ بھی آسانی سے نہیں ملا تھا، اس نے جو کچھ بھی حاصل کیا اس کے لیے اسے بے حد جان مارنا پڑی اور بہت کچھ نہیں بھی مل سکا لیکن اس نے کبھی اللہ سے ناشکری کے بول نہیں بولے۔ شکوہ نہیں کیا تھا۔ شکوہ وہاں بنتا ہے جہاں ہمارا حق ہو اور وہ اللہ سے کچھ بھی لینا اپنا حق نہیں سمجھتی تھی۔ یہ اس کا احسان تھا جو اس نے دے دیا۔

اس لڑکی کے منہ سے یہ باتیں بری نہیں لگنی چاہیے تھیں لیکن سننے والی بھی تو رطابہ تھی نا۔ وہ جس نے کبھی کسی کی ایک نہیں سنی وہ اتنا کہاں سن سکتی تھی۔

''میں نے جو بھی حاصل کیا ہے، یا جو کچھ بھی مجھے ملا میں بالکل وہ ڈیزرو کرتی تھی تب ہی مجھے ملا۔ اچھا شوہر، اچھا سسرال، اچھے بچے یہ سب میں ڈیزرو کرتی تھی اسی لیے میرے پاس ہے۔ اپنے آپ کو دیکھو۔ ہم بہنیں ہیں۔ ایک جیسے ماحول میں پلی بڑھی ہیں لیکن یہ سب میرے پاس ہے اور تمہارے پاس نہیں۔ کیونکہ میں یہ سب ڈیزرو کرتی تھی اور تم نہیں۔ جس مقام پہ بھی ہوں وہ سراسر میری اپنی محنت ہے۔ میری ذہانت نے مجھے یہ عزت اور مقام دیا ہے۔ اس میں اللہ کی دین کہاں سے آ گئی؟ سب میں نے خود کمایا ہے، کسی کا احسان نہیں ہے مجھ پہ تو شکر کس بات کا کروں۔ فخر ہے، گھمنڈ ہے تو اسی لیے ہے کہ میں قابل ہوں۔ اور قابل ہوں تو یہ سب ہے میرے پاس ورنہ نہ ہوتا۔ اور تم جس بیماری کو میری آزمائش کہہ رہی ہو، وہ میرا چیلنج ہے۔ یہ چیلنج ہے کہ میرا بیٹا اسی بیماری میں مبتلا ہوا جس کی میں اسپیشلسٹ ہوں اور میں اسے اس مرض سے نکالوں

گی بھی۔ تم جیسے ہی لوگ ہوتے ہیں نان پریکٹیکل جو ہر چیز کو آزمائش اور سزا سمجھ لیتے ہیں۔ میں بہت پریکٹیکل ہوں اس لیے میں اسے بس اپنے لیے ایک چیلینجنگ کیس سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتی۔ ذکی ٹھیک ہوگا اس کا مجھے سو فیصد یقین ہے۔ شک کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔" فاطمہ بالکل گنگ رہ گئی۔ اسے پتا تھا کہ اس کی بہن ایک چکنا گھڑا ہے جس پہ کچھ نہیں ٹھہرتا لیکن اتنی ڈھیٹ ہے کہ اتنی پریشانی میں بھی اپنی ڈھٹائی سے ایک انچ نہیں ہلے گی یہ نہیں پتا تھا۔ آج وہ بھی پتا لگ گیا۔

"اللہ تمہیں کسی نقصان کے بنا اس گمراہی سے نکال دے جس کا تم شکار ہو۔" وہ دل میں دعا کرتی لوٹ گئی تھی۔

☆☆☆

زیور بابا روزانہ فجر کی نماز کے ساتھ ہی باہر آ کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ عابدہ بھی ان کے ساتھ ہی کام پہ آتی تھی اور پہلا کام ہی ان کو ناشتا بنا کر دینے کا کرتی۔ اس سے پہلے کہ گھر والے جاگ جاتے بابا ناشتے سے فارغ ہو جاتے۔

کرنل بابا نے خود ان سے پوچھا تھا کہ وہ گھر کے اندر کیوں نہیں آتے۔ وہ اس سارے معاملے سے بے خبر تھے جو ہوا تھا۔ انہیں بھلا کس نے بتانا تھا؟ اس گھر میں جو فساد ڈالنے کا کام کرتا تھا وہ رطابہ ہی تو تھی اور جب سارا کیا دھرا اس کا تھا تو کس نے یہ خبر کرنل سدھو تک پہنچانا تھی بھلا۔ زیور بابا کرنل سدھو کے ہر سوال پہ خاموش رہتے۔ کرنل سدھو کے پوچھے جانے والے سوالوں کے جوابات جانتے ہوئے وہ نہیں دینا چاہتے تھے۔

رطابہ سے انہوں نے پوچھا تو اس نے باسانی جواب دے دیا۔

"زیور بابا کی دماغی حالت کافی خراب ہو چکی ہے۔ نجانے کہاں کہاں پھرتے رہتے ہیں پورا دن۔ اچھا ہی ہے ویسے کہ گھر نہ آئیں تو۔ کیا خبر کسی بھی وقت کچھ بھی کر دیں۔ ایسے بندے کا فیملی میں رہنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ کسی وقت کوئی بڑا نقصان کر سکتا ہے۔"

کرنل صاحب کو بھی اب زیور بابا مجذوب سے دکھائی دینے لگے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھے کہ جو پرانے ملازموں کو سر پہ بٹھا کر ان کی پوجا کریں یا ان کی خدمت کریں۔ اگر دماغی طور سے کچھ مسئلہ ہوا تھا تو ٹھیک ہی تھا کہ وہ خود ہی گھر سے چلے گئے تھے۔ کچھ باتوں میں کرنل سدھو کا مزاج بالکل رطابہ جیسا تھا جس میں خود غرض ہونا سب سے اوپر تھا اور زیور بابا کے لیے وہ بے حس اور خود غرض دونوں ہو چکے تھے۔

دانش نے اس دن کے بعد سے رطابہ کو مخاطب کرنا چھوڑ دیا تھا۔ رطابہ کو کچھ زیادہ فرق بھی نہیں پڑا تھا لیکن وہ ہر وقت ڈسٹرب دکھائی دیتی تھی۔ جیسے ذہن کہیں الجھا ہوا ہو۔ اسے لگتا تھا کہ بطور ماں رطابہ اذکار کے لیے پریشان ہے لیکن وہ غلط تھا۔ رطابہ کسی اور وجہ سے الجھن کا شکار تھی۔

اذکار کو دانش نے بہت طریقے سے سمجھایا تھا کہ اس کے دل کا آپریشن ہونا ہے۔ اس لیے اسے ہمت کرنا ہو گی۔ وہ اس کی ذہن سازی کر چکا تھا لیکن اذکار نے زیادہ ردِ عمل نہیں ظاہر کیا۔

"جتنا دل کمزور تھا، اسے آپریشن کی سخت ضرورت تھی۔" ذکی کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ نہیں تھا۔ وہ جیسے اس سب کے لیے تیار تھا۔

"آپ کہتے تھے نا بابا، کہ ہمیں مضبوط ہونا چاہیے تاکہ جب بڑی باتیں ہوں تو ہم برداشت کر سکیں۔ اسی لیے چھوٹی چھوٹی باتوں پہ نہیں رونا چاہیے تو دیکھیں مجھے۔ میرے دل میں سوراخ ہو گیا لیکن میں بالکل نہیں رویا کیونکہ میرے نزدیک یہ زیادہ بڑی بات نہیں ہے بابا۔ جانتے ہیں کہ میرے نزدیک ماما بابا کی لڑائی اور آپ کو گھر سے نکالنا زیادہ بڑی باتیں تھیں۔ جو کچھ میں دیکھ چکا ہوں اس کے مقابلے میں یہ بات بڑی لگ ہی نہیں رہی۔ اسی لیے میں بالکل نہیں رویا۔ میں ذرا بھی نہیں ہوں بابا۔" وہ

دن میں کچھ دیر زیور بابا کے پاس باہر جا کر بیٹھتا تھا۔ بابا خاموشی سے ذکر کرتے اسے سنتے رہتے۔ وہ خاموش رہتے لیکن جب ذکی ان سے بات کرتا وہ بس تب ہی بولا کرتے۔

"آپ بہت بہادر ہیں۔ اور اپنی اس بہادری کے ساتھ آپ یہ جنگ جیت جائیں گے۔"

"بہادر تو نہیں ہوں بابا، اسی لیے کیا پتا جنگ جیت پاؤں بھی یا نہیں۔"

زیور بابا دل میں اللہ نہ کرے کہتے۔

"آپ نے ہمیں معاف کر دیا؟" اس بات پہ وہ خاموش ہو جاتے۔ چوٹ بہت گہری لگی تھی۔ وہ اس کے بارے میں سوچتے بھی تو اتنا درد اٹھتا کہ ان سے برداشت نہ ہوتا۔

"آپ ہمت دکھائیں گے تو آپریشن ٹھیک ہو جائے گا اور آپ جلدی صحت یاب ہو جائیں گے۔"

"ہمت سے کچھ نہیں ہوگا۔ دعاؤں سے ہوگا۔ آپ دعائیں کریں گے تو ٹھیک بھی ہو جاؤں گا۔"

"میری ہر پل کی دعائیں بس آپ کے لیے ہیں۔" وہ اس پہ اپنا پڑھا ہوا دم کر دیتے۔

"مجھے لگتا ہے اللہ نے ماما کو سزا دی ہے تب ہی میں بیمار ہو گیا۔"

"ایسے نہیں کہتے بیٹا۔"

"آپ کی بد دعا لگی ہو گی۔" زیور بابا نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔

"میں نے کبھی کسی کو بد دعا نہیں دی۔ دعا دینے والے ہاتھ بد دعا نہیں دیا کرتے۔"

ذکی انہیں دیکھتا جاتا۔ نجانے کیوں اسے معصوم سے چہرے والے بابا سے اتنی محبت تھی۔

رطابہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اذکار دن میں زیور بابا کے ساتھ باہر بیٹھا رہتا ہے۔ لیکن اس نے ہسپتال جاتے ہوئے اکثر زیور بابا کو گھر کے باہر دوسری دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھے دیکھا تھا۔ اب اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ انہیں کالونی سے ہی نکلوا دے۔ یوں بھی ان دنوں وہ اذکار کے آپریشن کو لے کر کچھ پریشان تھی۔

فاطمہ ویک اینڈ پہ لازمی چکر لگا لیا کرتی اور اذکار کو کہیں گھما بھی لاتی تھی تا کہ اس کا دل بہل جائے۔ وہ اسکول نہیں جا رہا تھا۔ اسے آرام کی ضرورت تھی کیونکہ اس کا آپریشن جلد از جلد ہونا ضروری تھا۔ رطابہ نے آپریشن کے لیے ہسپتال کے ساتھ مہینے بعد کی تاریخ طے کر لی تھی۔ ولید اور لائبہ بھی چھٹی لے کر پاکستان آ گئے تھے۔ اخبا بھی ان کے ساتھ تھی۔ گھر میں خاصی رونق ہو گئی تھی۔ رطابہ نے عابدہ کو تاکید کی تھی کہ وہ فجر سے بھی پہلے آ جایا کرے تا کہ گھر میں کسی کو کسی قسم کا مسئلہ نہ ہو۔

اس دن فاطمہ رات میں اذکار کے کہنے پہ وہیں اس کے پاس رک گئی تھی۔ وہ بضد تھا کہ جب تک ٹھیک نہیں ہو جاتا فاطمہ وہیں رہے۔ ان دنوں وہ ہسپتال نہیں جا رہی تھی۔ اس نے نوکری سے چھٹی لے لی تھی کہ ابھی ذکی کو اس کی بے حد ضرورت تھی۔

صبح وہ فجر کی نماز کے بعد واک کے لیے نکلی تو باہر زیور بابا کو بیٹھے دیکھا۔ عابدہ انہیں ناشتا دے رہی تھی۔ فاطمہ کو دیکھ کر چونک گئی۔

"باجی وہ۔" وہ گھبرا گئی۔

"نیک کام میں ڈرا نہیں کرتے عابدہ۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ بابا کا خیال بیٹیوں کی طرح رکھتی ہیں۔" عابدہ مسکرا کر یہ سوچتے ہوئے اندر چلی گئی کہ دونوں بہنوں میں کتنا فرق ہے۔

فاطمہ کی قمیص کی جیب میں وہی کاغذ تھا جو وہ ہمیشہ دوسروں کو صدقہ دینے کے لیے اپنے پاس رکھا کرتی تھی۔

اس نے خاموشی سے وہ لفافہ ناشتا کرتے ہوئے بابا کے قریب رکھ دیا۔

"ذکی کے لیے دعا کیجیے گا۔ مجھے لگتا ہے کہ جیسی دعا ایک بچے کو اس کی ماں دے سکتی ہے، وہ آپ ذکی کو دے سکتے ہیں۔" زیور بابا نے لفافے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ بس دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔

تب سے فاطمہ کا معمول بن گیا تھا کہ وہ فجر کی نماز پڑھتے ہی عابدہ سے ناشتا لے کر باہر آتی اور ساتھ ایک لفافہ بھی لے آتی۔

"ذکی کے لیے دعا کیجیے گا بابا۔" ان کے پاس سے اٹھتے ہوئے وہ التجا کرنا نہیں بھولتی تھی۔

"دعا کے لیے اس کی ضرورت نہیں ہے بیٹا۔"

بابا نے لفافہ لوٹا دیا۔

"یہ دعا کے لیے نہیں دیتی میں آپ کو۔ یہ آپ کے اپنے لیے ہے بابا۔ اور انسان جب تک زندہ رہتا ہے، اس کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ ویسے بھی میں اس بات پہ یقین رکھتی ہوں کہ جن لوگوں نے اپنی پوری عمر ہماری خدمت میں گزاری ہو، بھی ان کی خدمت کرنا ہمارا بھی فرض ہے۔"

بابا اس کے ملازم نہیں تھے لیکن وہ جانتی تھی کہ اذکار کے لیے وہ کتنے اہم ہیں، دانش کے لیے وہ کیا ہیں اسی لیے اسے ان کا احساس تھا۔ بابا نے بس تشکر نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"ایک دعا میری بہن کے لیے بھی کر دیجیے گا کہ اللہ اسے ہدایت دے دے۔ اسے وہ سمجھا دے جو آج تک کوئی انسان اسے نہیں سمجھا سکا۔" زیور بابا نے سر جھکا لیا اور ہاتھ اٹھا لیے۔

دھکے دینے والے کو دعا دینا بڑی فقیری ہے۔ بابا نے یہ کام بھی کر دکھایا۔

روزانہ وہ لفافہ لا کر بابا کو دیتی اور روزانہ بابا واپسی پہ وہ لفافہ عابدہ کو تھما دیتے کہ وہ اس کے گھر میں رہ رہے تھے اور عابدہ کے گھر میں اس کا ایک معذور شوہر اور دو بچے بھی تھے جن کی سو ضرورتیں تھیں۔ زیور بابا نے پیسہ کبھی جمع نہیں کیا تھا، پیسہ انہیں اب بھی پیارا نہیں تھا جب وہ دوسروں کے محتاج ہو چکے تھے۔ یہی اس انسان کی قلندری تھی۔

☆☆☆

آپریشن کی تفصیلات پہ بات کرنے کے ساتھ رطابہ نے ڈاکٹر منصور سے ہسپتال کی سہولیات کے متعلق بھی تفصیلی بات کی تھی۔

"ڈونٹ وری ڈاکٹر رطابہ اذکار کو اس ہاسپٹل میں ہر طرح کا پروٹوکال ملے گا۔ وہ آپ کا بیٹا ہے آخر۔ اور یہ بات یہاں کا سارا اسٹاف جانتا ہے۔"

کچھ تحفظات تھے جو اس کے دور ہو گئے تھے۔

"آئی نو لیکن۔" جس بات پہ وہ کافی دنوں سے پریشان تھی وہ اسے کہنا تھی۔

"اس ہاسپٹل کی بیسٹ ڈاکٹرز میں سے ایک نام میرا ہے آپ جانتے ہیں۔" انہوں نے اس کی بات پہ سر ہلایا۔

"اور جب سے ذکی کا ڈائگناسز ہوا ہے میں بہت اپ سیٹ ہوں۔"

"obviously u r his mother... (ظاہر ہے آپ اس کی ماں ہیں) آپ کے لیے یہ ایک بڑا شاک ہے" وہ بالکل سمجھ رہے تھے۔

رطابہ نے سر نفی میں ہلایا۔

"میں اس لیے اپ سیٹ نہیں ہوں ڈاکٹر کہ وہ میرا بیٹا ہے بلکہ اس لیے کہ اب سوال میری Competency (قابلیت) کا ہے۔"

انہوں نے ناسمجھی سے رطابہ کو دیکھا۔

"میں سمجھا نہیں۔"

"ڈاکٹر منصور! اگر اپنے بیٹے کی ہارٹ سرجری میں خود سرجن ہو کر کسی اور سے کرواؤں گی تو کیا یہ میری قابلیت پہ سوال نہیں ہے۔ دنیا کہے گی نہیں کہ ماں خود بیسٹ ہارٹ سرجن تھی اور بیٹے کا علاج نہیں کر سکی۔"

"دنیا یہ کیوں کہے گی۔ ظاہر ہے ایک ماں کیسے اپنے ہاتھوں اپنی اولاد کا ایسا علاج کر سکتی ہے جس میں اس کے جسم کو کاٹا چیرا جائے۔" ڈاکٹر منصور کو اس کی بات سمجھ میں ہی نہیں آ رہی تھی کہ وہ کہنا کیا چاہتی ہے۔

"کر سکتی ہے۔ ماں اگر رطابہ ہو تو کر سکتی ہے ڈاکٹر۔" ڈاکٹر منصور رطابہ کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ دیکھ کر چونکے۔

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اذکار کی سرجری میں خود کروں گی۔" وہ پورے اعتماد سے کہہ رہی تھی۔

ڈاکٹر منصور اس کی بات پہ شاکڈ رہ گئے۔

(آخری قسط ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

☆☆

سالگرہ نمبر



عندلیب زہرا

اباجی کی دلہن

گھڑی کی سوئیاں تیزی سے سفر طے کر رہی تھیں۔ کمرے کا دروازہ ہنوز بند۔ صباحت کی جھنجلاہٹ بلکہ تلملاہٹ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ آخر دروازہ وا ہوا۔ عالیہ کا رخ روشن اپنا دیدار کروانے لگا۔ صباحت نے محض نظروں سے خفگی ظاہر کی اور یہ جا، وہ جا اس کے حصے کا کام ختم ہو چکا تھا۔ اب عالیہ کی باری تھی۔

"کیا ہے بندہ اب ذرا دیر آرام بھی نہیں کر سکتا۔" اس نے بے زاری سے سوچا اور آٹا گوندھنے لگی۔

☆☆☆

"سسرال میں یا تو ڈر ہوتا ہے یا شوق......اور یہ مقولہ صباحت اور عالیہ پر پورا اتر رہا تھا۔ جب تک ساس صاحبہ حیات رہیں۔ دونوں ہر کام ذمہ داری سے کرتیں۔ لب پہ......تابع داری سے......سب کہتے نفیسہ کو کتنی اچھی بہوئیں ملی ہیں۔ اب یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ انہیں اچھی بہوئیں بنانے میں ساس کا کتنا ہاتھ تھا۔ نہ بک بک نہ چخ چخ پھر بھی ہر کام وقت پر سرانجام پاتا۔ بیٹے ماؤں کے تابعدار۔ بہنوں کا میکا آباد۔ صحت مند، خوش مزاج نفیسہ بیگم ظالم ساس نہ تھیں۔ بہوؤں کو بھی مناسب حد تک آزادی تھی۔ دائرے میں رہ کر گویا ان کی سلطنت میں راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ اچانک ہارٹ اٹیک ہوا۔ لمحوں میں چٹ پٹ گھر کا انتظام تلپٹ ہو گیا تھا۔"

"کیسی اچھی منتظم تھیں نفیسہ بیگم ہر شے، رشتہ اپنے مقام پر تھا۔"

ہر فرد کے احساسات مختلف تھے۔ بہوئیں آزادی کے احساس سے سرشار بیٹے خود کو خود مختار سمجھ رہے تھے۔ بیٹیاں میکے کے احساس سے محروم ہو گئیں۔ سب سے کمزور حالت وحید صاحب کی تھی۔ تنہائی......اداسی......بیماری۔

"اباجی پہلے تو بیمار نہ ہوتے تھے۔" عالیہ نے سوپ بناتے ہوئے سوالیہ انداز اختیار کیا۔

"نخرے ہیں سب......اولاد کو متوجہ کرنے کے طریقے۔" صباحت نے بے زاری سے کہا۔

"نہیں بھابھی ...... پہلے امی جان سب کام کرتی تھیں۔ اب بہوؤں کی ذمہ داری ہے تو مشکل ہو رہی ہے۔" عالیہ مزاجاً نرم تھی سو اب بھی سہولت سے بات کہہ دی۔

صباحت چند لمحے خاموش رہی۔ جیسے سرا ڈھونڈ رہی ہو۔

"ابا جی صحت مند ہیں۔ پنشن یافتہ ...... کیوں نہ ان کی شادی کردی جائے۔" عالیہ نے برتن چھوڑ کر دیکھا۔ (کچھ حیرت کچھ ناگواری)

"ہاں، ناں ...... دیکھو اگر سنبھالنے والی آجائے گی تو ہماری جان چھوٹ جائے گی۔" اس نے عالیہ کو قائل کر ہی لیا تھا۔

"کون ہے وہ؟" عالیہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

"میری پھوپھی مطلقہ ہیں۔ اولاد نہیں۔ اچھی صحت مند خوش شکل ہیں۔ سرکاری اسکول کی ہیڈ مسٹریس رہ چکی ہیں۔ اچھا ہے ناں ...... ان بہنوں کا داخلہ اس طرح بند کریں جیسے نالائق طالبات کا کلاس روم میں کیا جاتا ہے۔ ہمارے قبضے میں رہیں گی۔ ابا جی بھی خوش اور ہم بھی مطمئن۔"

عالیہ، صباحت کی پلاننگ پر اش اش کر اٹھی۔ دونوں سر جوڑے پروگرام مرتب کر رہی تھیں۔ یہ جانے بنا کہ ان کا ردعمل کیا ہوگا۔

☆☆☆

"سچ ہے نمو، میکے ماؤں کے دم سے آباد ہوتے ہیں۔ امی جان حیات تھیں تو کیسے کیسے کھانے پکتے تھے۔ ہر موسم کے کپڑے خرید کر رکھتیں۔ بچے بھی بیتاب رہتے۔" تجمل گزرے لمحے کرید رہی تھی۔ آنکھوں میں نمی تھی۔

"اب تو امی کا کمرا کھانے کو آتا ہے۔ اتنی ویرانی ...... اداسی ...... سچ ہے کہ میکے آنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔" نمو نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

"بھائی بھی بدل گئے ہیں۔ نہ پہلے سی گرم جوشی، نہ محبت۔" تجمل نے اداس لہجے میں کہا۔

"ابا جی بھی کمزور اور اداس رہتے ہیں۔" نمو نے دل گرفتگی سے کہا۔

"کیوں نہ ابا جی کا نکاح کروا دیں۔" تجمل ہمیشہ سے منہ پھٹ تھی۔

"شریعت میں کیسی شرم ......" بہن کے چہرے پر حیرت دیکھ کر وضاحت دی۔

"اس عمر میں لوگ کیا کہیں گے۔" نمو سدا کی ڈرپوک کمزور دل ......

تجمل نے ہاتھ کے اشارے سے لوگوں کی

رائے کو پرے کیا۔
"خالہ بھی ماں جیسی ہوتی ہے۔ فضیلت خالہ یاد ہیں تمہیں ہم سے کتنا پیار کرتی تھیں۔" تجل نے جوش سے کہا۔ نمو نے نا سمجھنے والے انداز میں دیکھا۔
"ابا جی کا نکاح ان سے کروا دیتے ہیں۔ اچھا ہے میکا بھی آباد ہو جائے گا۔ بچوں کو نانی کی ہم شکل مل جائے گی۔" تجل نے داد لینے والے انداز میں دیکھا۔
فضیلت خالہ امی کی کزن تھیں۔ جوانی میں بیوہ ہوئیں تو دوبارہ گھر نہ بسا۔ بس بہن بھائیوں کے بچے پال رہی تھیں۔ تجل اور نمو سے خصوصی لگاؤ تھا۔ ان کی شکل مزاج امی جان سے بہت ملتا تھا۔ کزنز کی بجائے سگی بہنیں لگتیں۔
اب بھی تجل کو خیال کوندا۔ وہ شروع سے حسابی کتابی تھی۔ نفع نقصان مدنظر رکھ کر چلتی۔ خالہ کو لانے میں فائدے ہی تو تھے۔
بھابیوں پر کڑی نگاہ، میکہ آباد، ابا جی بھی خوش، شش و پنج کے بعد نمو مان گئی تھی۔ دونوں پلان بنانے لگیں۔ جلد باز دونوں بہنیں تھیں۔ اب بھی یہ سوچے بنا کہ ابا جی کی رضامندی بھی ضروری ہے۔ ہال تک منتخب کر بیٹھی تھیں۔
تجل شروع سے جلد باز تھی۔ چالاک بھی اور مفاد پرست بھی۔ نمو چھوٹی تھی۔ جذباتی بے وقوف ہمیشہ اس کی باتوں میں آ جاتی۔ بھابیاں دونوں کو ناپسند کرتیں۔
☆☆☆
وحید صاحب کو اب معلوم ہوا تھا کہ بیوی کی اصل ضرورت بڑھاپے میں ہوتی ہے۔ جوانی تو بھاگتے دوڑتے، لڑتے جھگڑتے اور مناتے گزر جاتی ہے۔ لیکن اصل دم ساز، غم گسار کی ضرورت بڑھاپے میں ہوتی ہے۔
"ابھی تو بہت کچھ کہنا سننا باقی تھا۔ نفیسہ بیگم۔"
پارک کے بنچ پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے خود کلامی کی تھی۔ اداسی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ تنہائی جان لیوا بنتی جا رہی تھی۔ شکر ہے کوئی خاص بیماری نہ تھی۔ پنشن کا سہارا تھا۔ گویا بیٹوں کے محتاج نہ تھے۔ بس تنہائی کا تدارک نہ تھا۔ نفیسہ ان کی ہم مزاج تھیں۔ ابرو تیک کا اشارہ سمجھتیں۔ ہنس کر ہر خطا ٹال جاتی۔ بیوی اچھی تھی یا ماں...... وہ اکثر سوچتے تھے۔
"شاید انسان اچھی تھی۔ جوانی میں کتنا جھگڑا کرتا تھا میں۔ ماں بہن کے سکھاوے میں آ کر میکے چھوڑ آتا۔"
اب انہیں اپنی کوتاہیاں شرمسار کر دیتی تھیں۔
جب ہنسنے بولنے سمجھنے کا وقت ہوتا ہے تو میاں بیوی گلے شکوے کرتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کی مداخلت، انا جب اکٹھے بیٹھنے کی گھڑیاں ملیں تو عمر کی نقدی ختم ہو جاتی ہے۔ انہوں نے آنکھوں کے گوشے صاف کیے تھے۔
"آج اچھی دھوپ ہے۔" خود کلامی کی تھی۔
"جی ہاں۔" کسی نے جواب دیا۔
چونک کر دیکھا تو بنچ کے دوسرے کنارے درمیانی عمر کی خاتون سامنے درختوں کو دیکھ رہی تھیں۔
"خاتون! آپ کون ہیں میں نے نہیں پہچانا۔" وہ حیرت سے گویا ہوئے۔
"ظاہر ہے ہم پہلی بار مل رہے ہیں۔ میں آدھے گھنٹے سے آپ کی خود کلامی سن رہی تھی۔ آپ مرحومہ شریک سفر کو یاد کر رہے تھے۔"
"ہاں بس۔" وہ خجل ہو گئے اور اٹھ کر چل دیے۔
"نجانے کیا اول فول بکتا رہا۔ کیا سوچتی ہو گی بڈھا سٹھیا گیا ہے۔" راستے میں خود کو کوستے رہے۔
اگلے روز پھر پارک میں گئے لیکن چہل قدمی کر کے واپس لوٹ آئے۔
موسم بدل رہا تھا سو ہلکی سی حرارت تیز بخار میں بدل گئی۔ اور وہ بستر پر پڑ گئے۔
بہوئیں مصروف...... بیٹے مگن...... بیٹیاں دور۔ چند دن بعد طبیعت بحال ہوئی تو پارک چلے گئے۔
"خالی در و دیوار دیکھنے سے بہتر ہے کہ پارک کے کوے چڑیاں اور مینڈک دیکھ لوں۔" جوتے کسے اور گھر سے نکل پڑے۔
سہ پہر کا ٹائم تھا۔ سنسان پارک تھا۔ چند لوگ دور دور بیٹھے تھے۔ وہ مخصوص جگہ پر بیٹھ گئے اور من پسند مشغلے میں کھو گئے۔ مطلب ماضی کی یادیں۔ نوسٹلجیا۔
"شادی کے شروع کے دنوں میں میں اور

نفیسہ ایک دو بار آئے تھے۔ کیسا رومان پرور وقت تھا۔ سرخ سلک کے جوڑے میں نفیسہ...... شرمائی شرمائی تھی۔ بھٹے اور قلفی کا بھی اپنا ہی مزا تھا۔" وہ ماضی کے ورق الٹ پلٹ کر رہے تھے۔

"بھٹہ اور قلفی اب بھی ملتی ہے۔ کھاپی لیں لیکن وہ مزا نہ ہوگا کیونکہ نفیسہ جو نہیں ہے۔"

نسوانی آواز انہیں ماضی سے واپس حال میں کھینچ لائی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر سیدھے ہو گئے۔

"آپ میری جاسوسی کرتی ہیں خاتون۔" انہیں بہت برا لگا تھا۔ مطلب کوئی پرائیویسی نہیں ہے۔

"جی نہیں...... مجھے ایسا کوئی شوق نہیں ہے۔" خاتون نے بنا خائف ہوئے جواب دیا۔

عینک کے پیچھے سے بغور جائزہ لیا تو پچاس پچپن کے لگ بھگ خاتون تھیں۔ کریم رنگ کی چادر اوڑھے۔ سانولی رنگت۔ چہرے پر ملائمت۔ بھلا سا رنگ وروپ۔

"میں ادھر قریب ہی رہتی ہوں۔" ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔

"میرا بھانجا ہے اس کے بچے ادھر آتے ہیں کھیلنے۔" خاتون نے وضاحت دی۔ وہ سر ہلا کر رہ گئے۔

اگلے چند روز میں وہ ایک دوسرے مانوس ہو گئے۔ حالات سے آگاہ بھی۔ نو وارد خاتون کراچی سے آئی تھیں۔

"والد فوت ہو گئے تو خود کو بیٹا سمجھ کر گھر والوں کی کفالت کی۔ اب سب اپنے گھروں میں آباد ہیں۔ کامیاب مکمل بس میں ہی تنہا۔ کبھی ایک بہن رکھتی ہے۔ کبھی دوسرا بھائی۔ آج کل بھانجے کے گھر پر ہوں۔ بیوی جاب کرتی ہے۔ مجھے ادھر لے آیا۔" میں بھی خالہ سے محبت ہے۔ اب علم ہوا کہ وہ تو بڑا موقع پرست ہے۔ خیر زندگی تو گزارنی ہے۔"

خاتون نے ہنستے ہنستے آنکھیں صاف کیں۔

"کیا بیٹا سمجھنے سے بیٹی، واقعی بیٹا بن جاتی ہے۔ اس کے احساسات، جذبات مردہ ہو جاتے ہیں۔" وحید صاحب نے دکھ سے ان کا اداس چہرہ دیکھا۔ "آپ کا نام کیا ہے؟" انہوں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"ناموں میں کیا رکھا ہے اب؟" خاتون نے اداسی سے آسمان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ملیحہ۔" چند لمحے توقف کے بعد کہا۔

"ملیحہ۔" انہوں نے زیر لب دہرایا۔

یوں دونوں بنا کچھ کہے رخصت ہو گئے۔

پہلے وہ تنہائی سے گھبرا کر پارک میں چلے جاتے۔ وہاں لوگ تو تھے۔ آوازیں چہرے اب کسی کو سننے کے شائق تھے۔ اپنی سنانے کے مشتاق۔ کوئی نئی خبر۔ نئی بات خواب نفیسہ کی یادوہ کسی کو سنانا چاہتے تھے۔ سامع نہ ملتا اب مل گیا تھا تو دل کرتا اس کی بھی سنی جائے۔ دونوں ایک بے نام رشتے بندھ گئے تھے۔ نہ دوستی، نہ تعلق، بس ایک احساس کا رشتہ تھا۔

☆☆☆

ایک روز پارک میں گئے تو حلیمہ صاحبہ غیر حاضر تھیں۔ دل اداس ہو گیا اور یہ اداسی آنے والے کئی دن طبیعت پر چھائی رہی جیسے کوئی شے کھو گئی ہے۔ آخر ساتویں دن جب پارک میں بیٹھے تھے تو سامنے ملیحہ نظر آئیں۔ کمزور اور اداس۔ استفسار پر بتایا کہ طبیعت خراب تھی۔

"میں گھر آنا چاہتا تھا۔" وہ چند لمحے ٹھہرے۔

"پھر سوچا...... آپ کے گھر والے نجانے کیا سمجھیں گے سوچیں۔"

ملیحہ سر ہلا کر رہ گئیں۔ چند لمحے سرکے خاموشی سے۔

"میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" نجانے کیسے زبان پھسلی۔

"شرم نہیں آتی...... عمر دیکھی ہے۔" ملیحہ کھڑی ہو گئیں۔

"کس کی عمر؟ میری یا آپ کی؟" بوکھلاہٹ میں وحید صاحب کے منہ سے یہی نکل سکا۔

"اونہہ......!" وہ بڑبڑاتے ہوئے دوسری طرف دیکھنے لگیں۔

"میں فلرٹ نہیں کر رہا۔ نہ میری عمر ہے نہ

آپ کی۔ عزت سے رشتے کی پیشکش کی ہے اور بس ...... ایک دفعہ سوچ لیں۔" ملیحہ نے اپنے عقب میں آواز سنی ...... تاہم وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے پارک سے باہر نکل گئیں۔

☆☆☆

"تمہارا طریقہ غلط نہیں تھا بس مناسب جگہ پر نہیں تھا۔" اجمل ان کا دیرینہ دوست تھا۔ سارے حالات سن کر تجزیہ کیا۔

"اگر تم سنجیدہ ہو تو میں اور تمہاری بھابھی باقاعدہ رشتہ لے کر جائیں گے۔ خاتون کے بھانجے کی بیوی، فرحانہ کی سہیلی ہے اور فروا (بہو) اس کے بچوں کی کلاس ٹیچر ......" اجمل نے پلان بتایا۔

"بس اس کے گھر والوں کو علم نہ ہو کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔" وحید صاحب نے یاد دلایا۔

"نو پرابلم۔" اجمل نے کندھا تھپتھپایا۔

"گھر والوں کو راضی کر لینا۔"

"ہمم۔" انہوں نے بے دھیانی سے سر ہلایا۔

☆☆☆

گھر کی فضا میں کشیدگی تھی۔ نمو اور نجل، فضیلت خالہ کو لانے کے منصوبے بنا رہی تھیں کوشش تھی بھائیوں کو ساتھ ملایا جائے۔ عالیہ اور صباحت ریٹائرڈ پھوپھو کے یہاں رشتہ لے جانے کے لیے راہ ہموار کر رہی تھیں۔

"میرا خیال ہے کہ ڈائریکٹ ابا جی کو راضی کرتے ہیں۔ جب لڑکا لڑکی راضی تو کیا کرے گا قاضی؟" صباحت بہت پرجوش تھی۔ اشارہ دونوں بیٹیوں کی طرف تھا۔

"پھوپھو کو بتا دیا۔" عالیہ نے پوچھا۔

"بس، ابا جی کی تعریفیں کرتی رہتی ہوں۔" اس نے لاپروائی سے جواب دیا۔

لائق اور آصف دونوں کو وحید صاحب نے اعتماد میں لیا۔

"مگر ابا جی! لوگ کیا کہیں گے؟" آصف نے چشم تصور میں ابا جی کو دولہا بنے دیکھا تو چیں بہ چیں ہو کر پوچھا۔

"کیا کہیں گے؟" الٹا انہوں نے سوال کیا۔

دونوں بغلیں جھانکنے لگے۔

"میں اپنا کفیل خود ہوں۔ پنشن یافتہ ہوں صاحب جائیداد ہوں (گردن اکڑا کر جواب دیا گیا) سو مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔ تم اپنی مرضی بتاؤ۔" قدرے رعب سے پوچھا گیا۔

"جو آپ مناسب سمجھیں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔"

لائق شروع سے موقع شناس تھا۔ سو اب بھی مدبر بن گیا۔

"راز داری شرط ہے۔" ہدایت جاری کی گئی اور دونوں نے سر ہلا دیا۔

☆☆☆

اس عمر میں جب عورتیں اپنے بچوں کے فرائض ادا کر رہی ہوتی ہیں۔ اس وقت ہاتھوں میں مہندی لگانا یا شادی کے خواب دیکھنا بہت عجیب تھا۔ کم از کم ملیحہ کے لیے۔

"لوگ کیا کہیں گے۔" انہوں نے بھانجے کی بیوی سے سوال کیا۔

"کیا کہیں گے بھلا؟" الٹا ان سے سوال کیا گیا۔

"آپ سمجھ دار باوقار خاتون ہیں۔ خوشیوں پر آپ کا بھی حق ہے۔ قدرت کی طرف سے یہی وقت تھا۔" ماریہ نے ہاتھ تھام کر رسانیت سے کہا۔

"خالہ! آپ نے کبھی اپنا نہیں سوچا ...... اب زندگی نے موقع دیا ہے تو بس فیصلہ کر لیں۔ شروع میں کیسی شرم۔" ماریہ نے ماہر وکیل کی طرح دلائل دیے۔

"مجھے افسوس ہے خالہ! ہم سب نے خود غرضی کی۔" بھانجے امتیاز نے اپنی بلکہ سب کی کوتاہی کا اعتراف کیا۔

"نہیں بچے! بس میں وسیلہ بنی تھی۔ اس وقت

تم سب کو میری ضرورت تھی۔" ملیحہ نے اس کے ہاتھ پر پیار کیا تھا۔

"اب میں آپ کا ولی ہوں۔" اس نے خالہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔ جس نے اپنی عمر کے بہترین سال گھر والوں کے لیے وقف کر دیے تھے۔

"سب خوش ہیں خالہ بہت خوش۔" ماریہ نے سب کے جذبات کی ترجمانی کی۔

"اور میں تم سب کی خوشی میں خوش۔" ملیحہ نے آہستگی سے اپنی رضامندی دے دی۔

☆☆☆

عید کی آمد آمد تھی۔ اپنی اپنی جگہ سب پر جوش تھے۔

"ہم تو خوش ہیں کہ فضیلت خالہ کو لا رہے ہیں یہ ابا جی کیوں خوش ہیں بھلا؟" تجل نے ابا جی کی حرکات وسکنات پر غور کیا۔ تو نمو کو اپنے ساتھ شریک گفتگو کیا۔

"عید پر ان کی دعوت کرتے ہیں دیکھنا ابا جی کو امی کی یاد آجائے گی۔" نمو نے پلان بتایا۔

"ہم سب اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ آجائیں گے۔"

ادھر عالیہ اور صباحت اپنی منصوبہ بندی کر رہی تھیں۔

"یار! پھوپھو کی تو امتحان میں ڈیوٹی لگی ہے۔ ابا جی سے آمنا سامنا کیسے ہوگا۔" عالیہ نے فکر مندی سے پوچھا تھا۔

"میں عید کے تیسرے دن دعوت کا بہانہ کر کے ابا جی کو لے جاؤں گی۔" صباحت نے پلان بتایا۔

دونوں مطمئن ہو کر مزید معاملات سیٹ کرنے لگیں۔

عید سے چند دن پہلے ابا جی کی مصروفیات بڑھ گئی تھیں لیکن سب اتنے الجھے ہوئے تھے۔ کسی کے پاس وقت نہ تھا۔

عید کے دن نماز پڑھ کر ابا جی اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ کہیں چلے گئے۔ کہاں؟ یہ پوچھنے یا بتانے کی فرصت کسی کے پاس نہ تھی۔

فضیلت خالہ باوجوہ جوڑوں کا درد نہ آسکیں۔ سو وہ دونوں دل مسوس کر بیٹھی تھیں۔

عالیہ اور صباحت کی اپنی تیاریاں تھیں۔

جب شام کو گیراج میں گاڑیاں رکنے، دروازے کھلنے کی آواز آئی۔ سب چونک کر کھڑی ہو گئیں۔ کھڑکی سے جھانکا۔ سب سے پہلے سنہری سینڈل میں مقید پیر نظروں میں آئے یہ ایک زرتار آنچل میں لپٹی خاتون وحید صاحب کے ہمراہ اندر داخل ہوئیں۔ درمیانی عمر کی خاتون تھیں۔

"ابا جی! یہ کون ہیں؟" تڑپ کر نمو نے سوال کیا۔

"تمہاری ماں۔"

"فضیلت خالہ۔" پہلا خیال انہی کا آیا۔ وحید صاحب نے خفا نظروں سے دیکھا۔

"یہ تمہاری نئی ماں ہے ملیحہ جو اب ملیحہ وحید ہیں۔" انہوں نے تعارف کروایا۔ دونوں بیٹے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ مطمئن گویا ابا جی کے انتخاب پر مطمئن تھے۔

عالیہ اور صباحت سکتے کی حالت میں تھیں۔ نئی دلہن نے سامنے دیکھا تو تجل اور نمو سامنے کھڑی تھیں۔

"سلام کرو بھئی انہیں۔" وحید صاحب نے ڈپٹ کر کہا۔

عالیہ اور صباحت نے سلام کیا انہوں نے پیار سے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"نمو...... تجل۔" وحید صاحب نے آواز دی۔

ملیحہ نے اپنی بانہیں وا کر دیں۔ دونوں بے اختیار ان سے لپٹ گئیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

"تمہارا میکا ہمیشہ آباد رہے گا پیاری بیٹیوں۔" نئی دلہن نے ان کی پیشانی چوم کر کہا۔

"امی جان۔" دونوں بہنوں کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

ابا جی کی دلہن سب کو پسند آئی تھی۔

☆☆

سالگرہ نمبر



آیمل رضا

تاش گھر

بائیسویں قسط

''کیا مجھے مارنا چاہتے ہو۔؟'' ڈر سے کانپتے ہوئے باریشہ نے پوچھا تھا۔

''ہاں...... '' اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے لڑکے نے اتنے ٹھوس لہجے میں کہا تھا کہ باریشہ کو یقین ہو گیا تھا کہ اب اس کے پاس زندگی کے بس چند لمحے ہی باقی بچے ہیں۔ اور پھر اگلے ہی لمحے فضا میں ایک فائر کی آواز گونجی تھی۔ باریشہ نے دلدوز چیخ ماری تھی۔ موت قریب تھی۔ اس نے سختی سے آنکھیں بھینچ لی تھیں اور خدا کو یاد کرنے لگی تھی۔

''لڑکی کو چھوڑ دو...... '' کوئی تیسری مردانہ آواز گونجی تھی۔ باریشہ نے آنکھیں کھولی تھیں۔ اور اسے احساس ہوا تھا کہ گولی اس پر نہیں داغی گئی ہے۔ ایک لڑکا گلی کے سرے پر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ فائر اسی نے فضا میں کیا تھا اور اب پستول اس لڑکے پر تان لی تھی۔ جو اپنی گن سے باریشہ کی گردن دبوچے کھڑا تھا۔

''میں کہتا ہوں کہ لڑکی کو چھوڑ دو...... ورنہ میں گولی چلانے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگاؤں گا۔'' گلی کی شروعات میں کھڑے لڑکے نے دھمکی آمیز بلند آواز میں کہا تھا۔

''اور نہ چھوڑوں تو......؟''



جواباً فضا میں دوسرا فائر کیا گیا تھا۔

"قسم کھاتا ہوں کہ تیسرا فائر تمہارا سر اُڑا دے گا۔" لڑکے نے اتنے دبنگ انداز میں کہا تھا کہ سو فی صد اُمید کی جا سکتی تھی کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔ باریشہ نے اپنے چہرے تک آئے لڑکے کو دیکھا تھا۔ جو غصے سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بادل زور زور سے گرج رہے تھے اور بارش دھواں دار ہو رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو



دیکھتے جارہے تھے۔
''آخری بار کہہ رہا ہوں۔لڑکی کو چھوڑ دو......''
''آج تو بچ گئی ہو۔اگلی بار نہیں بچ سکو گی۔''لڑکے نے اپنی پستول سے اس کے چہرے پر دستک سی دیتے ہوئے کہا تھا اور پھر اس سے پرے ہو گیا تھا۔پستول کو اس نے اپنی پینٹ کی بیک پر رکھا تھا۔بائیک پر بیٹھا تھا اور کک مارتے ہوئے وہاں سے چلا گیا تھا۔باریشہ کی جان میں جان آئی تھی۔بہت دیر سے رکا ہوا سانس بحال ہوا تھا۔اس نے اس لڑکے کی طرف دیکھا تھا جو گلی کے شروع میں کھڑا تھا۔جواب آہستگی سے چلتا ہوا اس کے قریب آرہا تھا۔
''تم ٹھیک ہو۔؟''وہ پیار سے پوچھ رہا تھا۔
''ہاں......میں ٹھیک ہوں۔''باریشہ نے بمشکل ہاں میں سر ہلایا تھا۔
''جانتی تھیں تم اسے......؟''
''نہیں بالکل نہیں......''
''لگتا ہے کہ کوئی اوباش تھا۔لڑکی کو اکیلا دیکھ کر تنگ کرنے لگا۔''لڑکے نے آگے بڑھ کر فاصلے پر گرا ہوا باریشہ کا ہینڈ بیگ اُٹھالیا تھا
''یہ تمہارا ہے۔؟''
''ہاں......یہ میرا ہے۔''
''پکڑو......فون کر کے گھر سے کسی کو بلا لو۔''
''میں آج موبائل لانا بھول گئی ہوں۔''بیگ پکڑتے ہوئے اس نے کہا تھا۔
''یہ لو میرے موبائل سے کال کر لو......''اس نے اپنا موبائل نکال کر اس کے آگے کیا تھا۔باریشہ نے موبائل نہیں پکڑا تھا۔
''مجھے گھر میں کسی کا نمبر یاد نہیں ہے۔''اس نے کہا تو لڑکے نے اسے ایسے دیکھا تھا جیسے اس کی بے وقوفی پر افسوس کر رہا ہو۔
''کیا تم مجھے میرے گھر تک چھوڑ سکتے ہو۔''بارش میں سردی سے کانپتے ہوئے اس نے کہا تھا۔
تیز بارش کی وجہ سے باریشہ کے ہونٹ جامنی ہونے لگے تھے۔لڑکے کو فوراً سے اس کی حالت کا اندازہ ہوا تھا۔اس نے اپنی شرٹ اُتاری تھی اور باریشہ کی طرف بڑھائی تھی۔خود وہ وائٹ سفید باریک ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔جو بارش کی وجہ سے اس کے کسرتی جسم سے چپک چکی تھی۔
''یہ خود پر لپیٹ لو......موٹی تو نہیں ہے۔لیکن کچھ نہ کچھ فائدہ تو دے گی ہی......''باریشہ نے انکار نہ کرتے ہوئے شرٹ پکڑ کر خود پر لپیٹ لی تھی۔
''گھر کہاں ہیں تمہارا......؟''
''زیادہ دور نہیں ہے۔تھوڑے فاصلے پر ہی ہے۔''
''چلو......چلتے ہیں پھر......''اس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔باریشہ اس کے پیچھے چلنے لگی تھی۔
''میرا نام ضامن ہے۔تمہارا کیا ہے۔؟''
''باریشہ......''اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے باریشہ نے کہا۔
ساون کی وہ بارش رکنے کا نام نہ لیتی تھی۔بارش جیسے سارے پرانے قرض آج اُتارنے کا قصد کیے ہوئے تھی۔بادل گرجتے ہوئے جاتے تھے اور نجانے کہاں سے پانی بھر کر واپس وہی لوٹ آتے تھے۔سڑکوں پر اسی

باعث ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔
وہ دونوں درختوں کے نیچے سے ہوتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ لیکن یہ کام خود کو دھوکا دینے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ درختوں کے پتے بارش کے بوجھ سے بارش سے زیادہ پانی ٹپکا رہے تھے۔ وہ دونوں لحہ بہ لحہ زیادہ گیلے ہو رہے تھے۔ پھر اک جگہ رک کر ضامن نے ایک کیلے کے درخت کی نیچے جھکی ہوئی شاخ کو مزید نیچے جھکا لیا تھا۔ اس نے کیلے کا ایک بڑا سا پتا توڑا تھا اور باریشہ کو دیا تھا۔
"یہ خود پر رکھ لو...... چھتری کا کام دے گا۔"
باریشہ نے بڑا سا پتا پکڑ لیا تھا۔ جبکہ بارش میں وہ بری طرح سے بھیگ تو چکی ہی تھی۔
"تم......"
"میری خیم ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور باریشہ اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ وہ پھر سے اس کے آگے چلنے لگا تھا۔ کسی شہنشاہ کی طرح...... اور وہ سر پر دونوں ہاتھوں سے کیلے کا پتا رکھے ہوئے اس کی محکوم رعایا کی طرح اس کے پیچھے چل رہی تھی۔

☆☆☆

کمرے کی کھڑکی بند تھی پھر بھی باہر ہوتی بارش کا شور سنائی دے رہا تھا۔ رات وقت سے پہلے ہی گہری ہو چکی تھی۔ کمرے میں پوری طرح سے اندھیرا اتر آیا تھا۔ لیکن اسے شاید اس بات کا احساس نہیں تھا۔ بازو کو اپنے سر کے نیچے رکھے، بیڈ پر لیٹا وہ نجانے کتنی دیر سے چھت کو گھور رہا تھا۔ لیکن درحقیقت وہ چھت کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ تو کسی منظر کو سوچ رہا تھا۔
"ک...... کیا چاہتے ہو۔؟" باریشہ کا بری طرح سے گھبراتے ہوئے کہنا اسے یاد آرہا تھا۔ اور یہ یاد ایسی تھی جو اس کے چہرے پر سنجیدگی کو ختم کرتے ہوئے مسکراہٹ بکھیرنے کی کوشش کر رہی تھی۔
"یہ لو......" ڈر سے کانپتی ہوئی باریشہ نے اپنا ہینڈ بیگ اس کی طرف اُچھال دیا تھا۔ یاد کرتے ہوئے خیام کے چہرے پر مسکراہٹ نظر آنے لگی تھی۔
"کیا چاہتے ہو؟" لڑکی پر خوف طاری تھا۔ اس نے اگلے ہی پل اپنی کہنی اس کی گردن پر رکھتے ہوئے اسے دیوار کے ساتھ لگا دیا تھا اور اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا تھا۔ اس نے اسے خوف زدہ کرنا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ اپنا مقصد بھولنے لگا تھا۔ باریشہ کی آنکھوں میں متوقع موت کا خوف تھا۔ لیکن اس خوف نے بھی اس کی آنکھوں میں موجود معصومیت کو مندمل نہیں ہونے دیا تھا۔ اس کے چہرے پر پانی کی بوندیں گر رہی تھیں اور خیام کا دل چاہا تھا کہ وہ اسی طرح کھڑا رہے اور بہت دنوں تک اس لڑکی کو اسی طرح اپنے سامنے دیکھتا رہے۔
"کیا مجھے مارنا چاہتے ہو۔؟" ڈر سے کانپتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔ اور یاد کرتے ہوئے خیام ایک دم سے ہی ہنسنے لگا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی فلم کا منظر ہو۔ ہنستے ہوئے وہ بیڈ پر اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔
"کیا ہوا ہے خیام...... آج بہت ہنس رہے ہو۔" اس کی والدہ نے کمرے کا دروازہ ذرا سا کھول کر اندر جھانکا تھا۔
"نہیں کچھ نہیں......" وہ تب بھی اپنی ہنسی پر قابو نہیں پا سکا تھا۔ شائستہ کمرے کے اندر چلی آئی تھی۔ انہوں نے لائٹ آن کر دی تھی
"کچھ تو ہے۔" وہ ذومعنی مسکرا رہی تھیں۔
"ایک جوک یاد آ گیا تھا۔" اس نے جھوٹ بولا تھا۔ شائستہ نے اپنے جوان بیٹے کی طرف ایسے دیکھا تھا

جیسے کہہ رہی ہو کہ میں سب سمجھ رہی ہوں۔

"رات کھانے میں کیا کھاؤ گے۔؟"

"جو آپ کا دل کرے بنوالیں۔"

"تمہارا دوست کہاں ہے۔؟"

"وہ کسی کام سے باہر گیا ہے۔"

"ایسا کرو کہ فون کر کے اسی سے پوچھ لو کہ وہ رات کھانے میں کیا کھائے گا۔ وہ ویسے بھی ہمارا مہمان ہے۔ ہمیں اس کی پسند سے کھانا بنوانا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے میں پوچھ لیتا ہوں۔" خیام نے کہا تھا۔ شائستہ کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔ خیام نے موبائل پکڑ کر اپنے دوست کو کال کی تھی۔

"ہیلو ضامن...... کہاں ہے تو......؟"

"ابھی اس لڑکی کو اس کے گھر تک چھوڑا ہے۔"

"ویسے بہت بڑا بے غیرت ہے تو...... قسم کھانے کی کیا ضرورت تھی کہ اگلا فائر تمہارا سر اڑا دے گا۔" خیام نے کہا تو ضامن ہنسنے لگا تھا۔

"وہ کیا کہتے ہیں۔ جوش خطابت......" ضامن نے کہا تو دونوں ہنسنے لگے تھے۔

"مام پوچھ رہی ہیں کہ رات کھانے میں کیا کھائے گا۔"

"جو تیرا دل کرتا ہے بنوا لے۔ میں سب ہی کچھ کھا لیتا ہوں۔"

"چائنیز کھائے گا۔"

"کیوں نہیں...... شوق سے......"

"ٹھیک ہے۔ میں مام سے کہہ دیتا ہوں۔"

"تھوڑی دیر میں پہنچتا ہوں تیری طرف......"

"بائے جانی......"

"بائے......"

فون بند ہو گیا تھا۔ ضامن نے موبائل جیب میں رکھا تھا۔ اور خیام کے گھر تک جانے کے لیے ایک ٹیکسی کو روکا تھا۔

☆☆☆

"باریشہ...... کہاں تھیں تم اتنی دیر سے......؟" وہ اپنے کمرے میں جا رہی تھی۔ جب کومل بیگم نے اسے روکا تھا۔

"میں گھر سے باہر تھی۔"

"تم تو کافی بھیگ چکی ہو۔"

"جی...... راستے میں ہی بارش شروع ہو گئی تھی۔"

"یہ شرٹ کس کی ہے۔" کومل بیگم کی نظر شرٹ پر اب گئی تھی۔

"راستے میں کسی نے میرا پرس چھیننے کی کوشش کی۔" اس نے ادھوری بات بتائی تھی۔

"اوہ میرے خدایا...... پھر......؟"

"ایک لڑکے نے بروقت مدد کی...... اسی نے مجھے گھر تک چھوڑا ہے۔ یہ اسی کی شرٹ ہے۔ میرا لباس بری

طرح سے گیلا ہو چکا تھا۔"
"تو تم اس لڑکے کو گھر کے اندر تو بلاتیں...... میں اس کا اچھے سے شکریہ ادا کرتی۔"
"میں نے کہا تھا لیکن اس نے منع کر دیا۔"
"ٹھیک ہے۔ تم کمرے میں جا کر فریش ہو جاؤ...... پھر بات کرتے ہیں۔"
"جی......" کہہ کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ اس نے دروازہ بند کیا تھا اور سست چال سے چلتی ہوئی بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے کپڑے بدلنے کا تردد نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ بال بھی نہیں سکھائے تھے۔ وہ نیم گیلے کپڑوں کے ساتھ ہی اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ بارش کے جھلماتے ہوئے قطرے اس کی آنکھوں میں اترے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلنے لگی تھی۔
"یہ خود پر لپیٹ لو...... موٹی تو نہیں ہے۔ لیکن کچھ نہ کچھ فائدہ تو دے گی ہی......" ضامن نے اپنی شرٹ اُتار کر اسے دی تھی۔ منظر اس کی نظروں کے سامنے ایسے چل رہا تھا جیسے وہ کسی سینما میں بیٹھی ہو اور سامنے اسکرین پر سب چل رہا ہو۔
"میرا نام ضامن ہے۔" ضامن کا خوشبودار لہجہ کمرے میں اتر آیا تھا۔
"میرا نام ضامن ہے۔" بازگشت ہونے لگی تھی۔
"اور مسٹر ضامن...... کیا تم مجھ سے دوبارہ بھی ملو گے یا نہیں......" اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے خود سے سوال کیا تھا۔ اور اپنے سوال کا جواب نہ ملنے پر وہ بے چین ہونے لگی تھی۔ وہ کس بہانے سے اس سے ملنے آ سکتا تھا۔ کیا شرٹ لینے کے بہانے......؟ جب کہ وہ اسے کہہ چکا تھا کہ وہ اسے اپنے پاس رکھ لے۔ پھر وہ کیسے اسے مل سکتا تھا۔ وہ اس بڑے شہر میں اسے کہاں تلاش کر سکتی تھی.....؟ اور یہ بھی حقیقت تھی کہ جب کسی کو تلاش کرنا ہو تو حویلیاں جیسا چھوٹا شہر بھی پورا ملک بن جاتا ہے۔
"مجھے اپنی زندگی میں اس سے ملاقات کا اتفاق بار ہا چاہیے میرے اللہ......" اور اس نے شدت سے خدا کے حضور دعا کی تھی۔ اسے نہیں یاد پڑتا تھا کہ اس نے آخری بار کب دعا کی تھی۔ وہ خدا سے ہم کلام ہونے میں بہت سست اور مطلب پرست تھی۔ صرف اپنی ضرورت کے وقت وہ خدا کو یاد کیا کرتی تھی۔ جیسے اب کر رہی تھی۔
"میں کیسے ملوں گی اسے دوبارہ......" وہ اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی تھی۔ بازوؤں کو اس نے سختی سے بھینچ لیا تھا۔ تب ہی اس کا ہاتھ شرٹ کی پاکٹ میں موجود کسی سخت چیز سے ٹکرایا تھا۔ اس نے پاکٹ میں ہاتھ ڈالا تھا۔ وہ ایک کارڈ تھا۔ وزٹنگ کارڈ......
"ضامن عباس...... سیون سٹار میڈیا کمپنی...... فون نمبر......"
اور آج پہلی بار ریشہ کا دل کیا تھا کہ وہ شکر کے طور پر خدا کو سجدہ کرے۔

☆☆☆

شام کی متواتر بارش نے اسلام آباد کو وقت سے پہلے ہی سلا دیا تھا۔ سماں کچھ خاموش سا ہو گیا تھا۔ ایسے جیسے سارا شہر ہی تھک کر جلدی سو گیا ہو۔ بارش کے بعد کی رات کا مزا لینے کو باہر کوئی موجود نہیں تھا۔ فضا میں ان مینڈکوں کی آواز گونج رہی تھی جو بارش کے پانی میں مستیاں کر رہے تھے۔
رات کا کھانے کے بعد ضامن جلدی سو گیا تھا۔ لیکن خیام کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ ایک انجان چہرہ اس کی نظروں میں سما چکا تھا۔ ایک ڈرا سہا چہرہ...... موت کے خوف سے لرزہ، معصومیت میں لپٹا ہوا۔ اور یہ چہرہ اسے بھول ہی تو نہیں پا رہا تھا۔ وہ جتنا بھولنے کی کوشش کرتا چہرہ مزید توانائی سے اس کے ذہن میں نقش ہوتا چلا جاتا۔ شاید یہ اس کا آرٹسٹک مائنڈ تھا اس لیے...... کسی بھی منظر کو دیکھ لینے کے بعد اس کا ذہن اس منظر کو تب

تک نہیں بھولتا تھا۔ جب تک وہ اسے پوری طرح سے کینوس پر نہیں اتار لیتا تھا۔ تو کیا اب یہ چہرہ جو اسے سونے نہیں دے رہا تھا یہ بھی کینوس پر اترنے کے بعد اس کے ذہن سے محو ہونے والا تھا۔ اور کون جانے کے کینوس پر اترنے کے بعد وہ محو ہوتا تھا یا مزید پختہ ہوتا تھا۔

خیام بیڈ پر سے اترنا چاہتا تھا۔ لیکن ساتھ میں لیٹے ہوئے ضامن کا بازو اس کے سینے پر تھا۔ جو اسے وہاں چپکائے ہوئے تھا۔ چاروناچار اس نے سونے کی کوشش کی تھی لیکن نیند آنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ آج کی رات کیسے گزرے گی۔ نینداور بیداری سے جاری جنگ میں ہار مانتے ہوئے اس نے بہت احتیاط سے اُٹھنے کی کوشش کی تھی۔ ضامن کا بازو اپنے سینے پر سے ہٹا کر سائیڈ پر کیا تھا۔ سورہے ضامن نے نیند سے جاگنے والی جنبش تو کی تھی لیکن وہ جاگا نہیں تھا۔ خیام اسے بچپن سے جانتا تھا۔ ضامن کی نیند کافی گہری ہوتی تھی۔ وہ بے سدھ ہو کر سویا کرتا تھا۔

خیام بیڈ سے نیچے اُتر آیا تھا۔ کمرے کا دروازہ اس نے آہستگی سے کھولا تھا اور پھر باہر نکل کر آہستگی سے ہی بند کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ضامن کے بچپن کا ریکارڈ خراب ہو جائے اور آج وہ بے سدھ نیند سے جاگ جائے۔

گھر کی تاریک راہداری کو پار کر کے وہ اپنے اسٹوڈیو میں گیا تھا۔ جہاں اس کے بہت سے مکمل اور نامکمل پورٹریٹ پڑے ہوئے تھے۔ اس نے ایک نامکمل پوٹریٹ کو اُتار کر سائیڈ پر رکھا تھا اور اسٹینڈ پر نیا کینوس رکھ دیا تھا۔ آج سے پہلے اس نے بس قدرتی مناظر ہی بنائے تھے۔ اس لیے وہ جانتا تھا کہ آج رات اسے مشکل پیش آئے گی۔ آج وہ پہلی بار کسی لڑکی کا چہرہ بنانے جا رہا تھا۔ باریشہ کا چہرہ......

☆☆☆

ملازمہ سے کہہ کر اس نے ضامن کی شرٹ کو ڈرائی کلین ہونے کے لیے بھجوادیا تھا۔ اور ملازمہ کو تاکید کی تھی کہ وہ شرٹ کو شام سے پہلے واپس منگوا لے۔ اور ساتھ میں یہ ہدایت بھی کی تھی کہ وہ اس کے بارے میں کسی کو نہ بتائے۔ ناشتا اس نے جلدی کر لیا تھا۔ اور پھر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ نتاشہ اس سے بات کرنا چاہتی تھی۔ مستقبل کو لے کر کچھ پلان کرنا چاہتی تھی لیکن اس نے یہ کہہ کر "کل بارش میں بھیگنے کی وجہ سے میری طبیعت کچھ خراب ہے۔" نتاشہ کو کمرے سے چلتا کیا تھا۔ آج وہ تنہا رہنا چاہتی تھی اور سوچنا چاہتی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔

اب اپنے کمرے میں بیٹھ کر ضامن کا وزٹنگ کارڈ ہاتھ میں پکڑے وہ سوچ رہی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ یہ تو طے تھا کہ اس نے ضامن کو کال کرنی ہے۔ لیکن کیا کہنا ہے یہ طے نہیں ہو پا رہا تھا۔ اور یہ بھی نہیں کہ اسے کس طرح بات کرنی چاہیے۔ سنجیدگی سے، ہنس کر، شوخی سے، رعب سے، یا بس سرسری انداز میں......اسے کس طرح بات کرنی چاہیے کہ جس سے ضامن کو احساس ہی نہ ہو کہ وہ رات بھر اس کے بارے میں سوچتی رہی ہے۔ اور پھر سے اس سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہے۔ ذہن ہی ذہن میں وہ لفظوں کا جوڑ توڑ کرنے لگی تھی اور پھر اس نے موبائل پکڑا تھا اور ضامن کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ اسے نمبر ڈائل کرنے کے لیے کارڈ کو دیکھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ نمبر اسے رات ہی رات میں ازبر ہو چکا تھا۔

الیف سیون ایریا سے دُور بہت دور...... بہارہ کہو کے ایک عالیشان گھر کے آرٹسٹک کمرے میں ضامن کھڑا کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ باہر دن پوری آب و تاب سے نکل آیا تھا۔ کل کی تیز بارش نے موسم کا سارا گرد و غبار ختم کر دیا تھا۔ وہ نہا کر فریش ہو چکا تھا۔ لیکن اس کا دوست ابھی تک سو رہا تھا۔ کھڑکی کے باہر سے نظر ہٹا کر ضامن نے خیام کو دیکھا تھا۔ جو کروٹ بدلے بے خبر سو رہا تھا۔ ضامن کو کچھ حیرت ہوئی تھی۔ خیام تو صبح اس سے بھی پہلے اُٹھ جانے کا عادی تھا۔ پھر یہ آج کیوں ایسے سو رہا تھا جیسے رات بھر جاگ کر کوئی کام

کرتا رہا ہو۔ اسے ناشتے کی طلب ہو رہی تھی لیکن وہ اپنے دوست کے بنا ناشتا نہیں کرنا چاہتا تھا۔
وہ انہی سوچوں میں تھا جب اس کے موبائل فون کی بیل بجی تھی۔ جلدی سے اپنا موبائل پکڑ کر اس نے سائلنٹ کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ خیام نیند سے جاگے۔ پھر اس نے موبائل اسکرین پر آئے نمبر کو دیکھا تھا۔ نمبر انجان تھا۔ اور وہ جانتا تھا کہ یہ انجان نمبر کس کا ہوگا۔ ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی تھی۔ کمرے سے باہر نکل کر اس نے کال ریسیو کی تھی۔
"ہیلو......"
"ضامن......؟"
"جی...... آپ کون......؟" جبکہ یہ سوال پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ باریشہ کی آواز پہچان چکا تھا۔
"میں باریشہ ہوں۔ کل جس کو تم نے گھر تک چھوڑا تھا۔"
"میرا نمبر کیسے ملا تمہیں......؟" وہ انجان بنتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ جیسے وہ جانتا ہی نہ ہو کہ اپنا وزٹنگ کارڈ اس نے جان بوجھ کر اپنی شرٹ کی جیب میں چھوڑا تھا۔
"تمہاری شرٹ کی پاکٹ میں تمہارا وزٹنگ کارڈ تھا۔"
"اوہ...... اچھا......"
"تمہیں تمہاری شرٹ واپس کرنا تھی۔"
"میں کل بول تو چکا تھا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔" ضامن نے کہا تھا۔ باریشہ کو سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ آگے سے کیا کہے۔
"ویل...... اگر واپس کرنا ہی چاہتی ہو تو پنالٹی کے ساتھ واپس کرنا ہوگی۔" وہ کچھ شوخی سے بولا تھا۔
"کیسی پنالٹی......؟"
"مجھے کافی پلانا ہوگی۔" اس نے کہا تھا۔ اور ایسی خوب صورت پنالٹی پر باریشہ تو نہال ہی ہو گئی۔
"شوق سے......" اس نے فوراً سے رضامندی دے دی تھی۔
"تو پھر کہاں سے پلاؤ گی کافی......؟"
"جہاں تم کہو۔"
"میں اسلام آباد کو زیادہ نہیں جانتا ہوں۔ میں یہاں نیا ہوں۔"
"ویسے میں بھی اس شہر کی نہیں ہوں۔ میں حویلیاں سے ہوں۔" باریشہ نے سرسری انداز میں کہا تھا۔ اور حویلیاں کے نام پر ضامن دانت پیس کر رہ گیا تھا۔
"کیا تم حویلیاں کو جانتے ہو......؟" اس نے بات برائے بات پوچھ لیا تھا۔
"نہیں...... بالکل نہیں...... میں یہ نام پہلی بار سن رہا ہوں۔ یہ کہاں ہے......؟" اس نے روانی سے جھوٹ بولا تھا۔
"اسلام آباد سے ایبٹ آباد کی طرف جائیں تو ایبٹ آباد سے پہلے حویلیاں آتا ہے۔"
"اوہ...... آئی سی......"
"ویل، میں اب اسلام آباد میں رہتی ہوں اور یہاں کی بہت سی جگہوں کو جانتی ہوں۔"
"تو پھر ٹھیک ہے۔ دیکھتے ہیں کہ آپ کتنا جان چکی ہیں اس شہر کو مس باریشہ......" ضامن نے لہجہ نارمل رکھتے ہوئے کہا تھا۔ یہ جملہ الوداعی تھا۔ جبکہ باریشہ کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ضامن سے باتیں کرتی رہے اور بس کرتی ہی رہے۔

☆☆☆

۱۹۷۴ء

تعبیر کی موت کی خبر کے بعد سب ہی کو سنبھلنے میں کافی وقت لگ گیا تھا۔ خاص طور پر زہرہ پھوپھو کو...... وہ بیمار رہنے لگی تھیں۔ ہر وقت ان کا جسم تپتا رہتا تھا اور وہ دیوانوں کی طرح تعبیر کو پکارتی رہتی تھیں۔ ایسے جیسے خواب وخیال میں بول رہی ہوں۔

''وہ جہاں جا چکی ہے اسے یاد کرنے کے بجائے بہتر ہے کہ تم اسے خدا کا کلام پڑھ کر بخشو......'' شکیلہ اور تہمینہ پھوپھو انہیں سمجھایا کرتی تھیں۔ لیکن اس ماں کو کیسے قرار آنے والا تھا جس کی جوان بیٹی شادی کے کچھ ہی عرصے کے بعد مر گئی ہو۔ بیٹی کی شادیوں کے بعد تو مائیں ایک ایک دن گنتی ہیں کہ کب ان کی بیٹی انہیں اپنے ماں بننے کی خوش خبری سنائے اور یہاں انہیں ایسی انہونی خبر سننے کو ملی تھی جس پر انہیں ابھی بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ نجانے کیوں انہیں لگتا تھا کہ تعبیر کسی دن زندگی سلامت ان کے سامنے آ کھڑی ہوگی اور اپنی غم زدہ ماں کو گلے سے لگا لے گی۔ چونکہ زہرہ پھوپھو نے اس کی میت نہیں دیکھی تھی اس لیے انہیں تعبیر کی موت پر یقین بھی نہیں آ رہا تھا۔

ایسی ہی بے یقینی انہیں تب لاحق ہوئی تھی جب بٹوارے کے ہنگامے میں ان کے شوہر کو قتل کیا گیا تھا۔ انہیں یقین ہی تو نہ آتا تھا کہ جن لوگوں کے ساتھ وہ برسوں رہی ہیں انہی کے جھگڑوں میں ان کا شوہر قتل کر دیا گیا ہے۔ اور وہ اب بیوہ ہو چکی ہیں۔ تب بھی وہ دن رات اپنے شوہر کو پکارا کرتی تھیں۔ لیکن شوہر واپس نہیں آیا تھا جیسے اب تعبیر بھی واپس آنے والی نہیں تھی۔ اس حقیقت کو وہ تسلیم نہیں کر پا رہی تھیں اور روز اس سے نبرد آزما ہونے کی کوششیں کرتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی طبیعت دن بدن گرنے لگی تھی۔

باقی لڑکیاں بھی اُداس اُداس تھیں۔ اس حویلی میں ان کی ہوش میں یہ پہلی موت تھی۔ اور کتنی اُدھوری موت تھی۔ نہ تو جنازہ وہاں سے اٹھایا گیا تھا اور نہ ہی میت کو دیکھ کر انہیں قرار آیا تھا۔ وہ مر چکی تعبیر کا سرد چہرہ دیکھ لیتیں تو شاید انہیں کچھ راحت نصیب ہوتی۔ اب تو ایسے لگ رہا تھا جیسے قدرت ان کے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہی ہو۔ تعبیر جو ہر وقت میک اپ سیکھنے میں لگی رہتی تھی۔ ساری کزنوں کا خاص دنوں کا میک اپ وہی کرتی تھی۔ ایسی زندہ دل لڑکی کی جان فرشتہ کیسے قبض کر سکتا ہے۔ دُکھ بھری سوچوں میں گم وہ مجبوری تھلیوں پر تعبیر کے لیے پڑھ پڑھ کر بخشتی رہتی تھیں۔ وہ سب نہیں جانتی تھیں کہ جسے وہ مرا ہوا سمجھ رہی ہیں وہ زندہ ہے۔ اور اپنی قسمت کو رو رہی ہے۔

اُداسی کے ان ہی دنوں میں چاند نے سب کو عجیب خبر سنائی تھی۔ بسام اور کومل کی شادی کی خبر...... جس پر پہلے تو سب حیران ہوئے تھے اور پھر جلد ہی صورت حال کو قبول کر لیا گیا تھا۔ کسی کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اور اعتراض بھی تب کرتے جب ان کے اعتراض کی کوئی اہمیت ہوتی...... سب تو پہلے سے ہی یہ چاہتے تھے کہ بسام اور رحیانی کے گھر بس جائیں۔ بے شک کومل اور ایمن کے ساتھ ہی......

حویلی میں ایک بار پھر سے شادی کی تیاریاں ہونے لگی تھیں۔ یہ تیاری اگرچہ بہت زیادہ پرجوش نہیں تھی۔ لیکن جو حالات حویلی پر ہو گزرے تھے اس کے بعد جیسے سب کو ہنسنے کا بہانہ مل گیا تھا۔ سب ہنسی خوشی شادی کی تیاریاں کرنے لگے تھے۔ چاند اپنی زیرِ نگرانی کومل کا لباس تیار کروانے لگی تھی۔ اس نے خوب صورت رنگ اور چمک دار نگینوں کا انتخاب کیا تھا۔ ڈیزائن بھی انہوں نے خود منتخب کیا تھا۔ اور کاریگروں سے کہا تھا کہ وہ جلد سے جلد اس لباس کو مکمل کریں۔ باقی سب بھی اپنے نئے پرانے جوڑے نکال کر دیکھنے لگے تھے کہ شادی کے دنوں میں کس نے کیا پہننا ہے۔ چاند نے اپنے بہت سے سونے کے زیورات کومل کو دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جس

پر تہمینہ پھوپھو نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ ان زیورات کو اپنے پاس رکھے۔
''وقت کا کچھ پتا نہیں ہوتا چاند...... کب برا وقت آجائے۔''
لیکن چاند پھر بھی ان زیورات کو کومل کو دینے کے فیصلے پر قائم رہی تھی۔
''میں بہت کچھ تو صندل کو دے چکی ہوں۔ اب باقی جو میرے پاس موجود ہیں اس کی مجھے ضرورت نہیں...... میں نے صرف چند ایک چیزیں اپنے پاس رکھی ہیں جو اتمش نے مجھے دی تھیں۔''
''ٹھیک ہے۔ جیسے تمہاری مرضی...... '' تہمینہ پھوپھو نے کہا تھا۔ حویلی کا ماحول کچھ عرصے سے ایسا ہو چکا تھا کہ کوئی کسی کے کام میں مداخلت نہیں کر رہا تھا۔ ایک حویلی میں رہتے ہوئے سب اپنی اپنی ذات کے کمروں میں بند تھے۔
روشن بیگم بھی رسم دنیا نبھانے کو حویلی چلی آئی تھیں۔ چونکہ بستامی کا سگا قریبی رشتے دار صرف چاند ہی تھی اس لیے ان کی بیٹھک اسی کے ساتھ تھی۔ کسی اور نے ان دونوں کی بات چیت میں بیٹھنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ تہمینہ اور زہرہ پھوپھو تو ویسے بھی اب بستامی کو کم کم ہی منہ لگایا کرتی تھیں اور رہی شکیلہ پھوپھو...... وہ اپنی دونوں بہنوں کو دیکھ کر ہی سبق لے چکی تھیں۔ روشن بیگم کی میزبانی کرنے کو صرف چاند ہی کمرے میں موجود تھی۔
''ویسے تو لڑکے والے جاتے ہیں لڑکی والوں کے گھر...... لیکن مجھے احساس تھا کہ تم اس بدنام گلی میں قدم نہیں رکھو گی۔ اس لیے میں خود تمہارے پاس چلی آئی ہوں۔'' اپنی میک اپ زدہ آنکھوں سے چاند کو گھورتے ہوئے روشن بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔
''زندگی اس دوراہے پر لے آئی ہے کہ بھائی کی خوشی کی خاطر میں مینا گلی بھی جا سکتی ہوں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں...... '' چاند نے نرم لہجے میں کہا تھا۔
''اس رشتے کا افسوس تمہارے لہجے سے عیاں ہے چاند...... لگتا ہے کہ اس شادی میں تمہاری مرضی شامل نہیں ہے۔''
''ایسی بات نہیں ہے۔ اور اگر ایسی بات ہے بھی تو بے معنی ہے۔''
''یہ تو بستامی ہے جس نے کومل سے شادی کی ضد پکڑ لی ہے۔ اور بڑھاپے میں میرا سہارا چھین رہا ہے۔ ورنہ میرے نزدیک اس شادی کی ضرورت نہیں تھی۔ تعلق تو ویسے بھی چل رہا تھا۔'' روشن بیگم نے سارا ملبہ بستامی پر ڈال دیا تھا۔
''بہتر ہے تعلق کو کوئی ایسا نام مل جائے جو معاشرے میں قابل قبول ہو۔''
''میں کہنے آئی تھی کہ میرے معاشی حالات بہت نازک جا رہے ہیں۔ میں کومل کو جہیز دینے سے قاصر ہوں۔'' روشن بیگم اصل بات پر آئی تھیں۔ وہ چمڑی جائے دمڑی نہ جائے پر عمل کرنے والی خاتون تھیں۔
''جہیز کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ کا دیا ہمارے پاس بہت کچھ ہے۔ کمرے بھرے ہوئے ہیں۔''
''تم تو جانتی ہو کہ ہم میں شادیاں کرنے کا رواج نہیں ہوتا۔ اس لیے میں نے کومل کے لیے کچھ بھی جوڑا ہوا نہیں تھا۔ میں دو جوڑے میں لڑکی کو رخصت کروں گی۔''
''آپ بتا دیں وہ کیسے کپڑے پہننا پسند کرتی ہے۔ میں تیار کروا دوں گی۔''
''اسے شوخ رنگ پسند ہیں۔ جن پر نفیس کام کیا گیا ہو۔ سونے کے زیورات اسے بہت بھاتے ہیں۔ اور میں چاہتی ہوں کہ تم اس کا کمرا بھی عالیشان تیار کرواؤ۔''
''اپنے طور پر سب بہتر کرنے کی کوشش کروں گی۔ آپ فکر مت کریں۔ کومل کو یہاں کوئی تنگی نہیں ہوگی۔''
''اُمید کرتی ہوں کہ کومل کے آجانے سے حویلی میں دو مالکوں والی کیفیت پیدا نہیں ہوگی۔ تم کومل کے

مالکانہ حقوق تسلیم کرلوگی۔ تم سمجھدار ہو۔ اتنا تو سمجھتی ہی ہوگی کہ مرحوم باپ کا چھوڑا ہوا کاروبار بھائی اور بھابھی کا ہوتا ہے۔ بیٹی کا نہیں......"

روشن بیگم نے سرسری انداز میں جو بات کی تھی وہ چاند کو اندر تک تپا گئی تھی۔ لیکن کی مجبوری تھی کہ انہیں تحمل کا مظاہرہ کرنا تھا۔

"حیرت ہے۔ آپ کبھی خاندان میں نہیں رہیں...... پھر بھی خاندانی روایات جانتی ہیں......" چاند نے چوٹ کی تھی۔ روشن بیگم پہلو بدل کر رہ گئی تھیں۔ "خیر فکر مت کریں۔ بستامی کی بیوی ہونے کی حیثیت سے کومل ہی اس گھر کی مالکن ہوگی۔ میں بہت جلد خود کو محدود کرلوں گی۔"

"تم ایک سمجھدار خاتون ہو چاند...... مجھے اُمید تھی کہ تم سے بات چیت میری اُلجھن کو ختم کردے گی۔"

چاند جیسے زبردستی مسکرائی تھی۔

"ایک اُلجھن اور دور کردو گی تو احسان سمجھوں گی۔"

"جی...... کہیے۔"

"ایمن...... میری بیٹی ہے۔ نام سے تو تم واقف ہی ہوگی۔ وہ رحبانی کے علاوہ کسی اور کو دیکھنا بھی نہیں چاہتی ہے۔ اگر تم رحبانی کو منالو کہ وہ ایمن سے شادی کرلے تو میں سکون سے مرسکوں گی۔"

"میں...... میں کیسے بات کرسکتی ہوں رحبانی سے......"

"سنا ہے وہ تمہاری ہر بات مانتا تھا......" روشن بیگم نے ذومعنی انداز میں کہا تھا۔ "کب تک خود کے ساتھ باندھ کر رکھو گی اسے چاند...... اب تو اسے آزاد کردو۔" روشن بیگم نے چبھن زدہ بات کی تھی۔

"ایسا کچھ نہیں ہے۔ آپ کا اشارہ جس طرف ہے وہ سب ماضی تھا۔"

"کیا تم میری درخواست پر بھی اس سے بات نہیں کرسکتی ہو۔"

"پھر میری بھی ایک التجاء ہے۔" چاند نے کہا تھا تو روشن بیگم نے سوالیہ انداز میں انہیں دیکھا تھا۔

"میرا باپ بہت دین دار آدمی تھا۔ میں نہیں چاہتی کہ قبر میں چلے جانے کے باوجود اس کا محراب داغ دار ہو۔"

"تم کیا کہنا چاہتی ہو چاند......"

"جب جب کومل سے ملنے کو دل کرے آپ اسے اپنے پاس بلوا سکتی ہیں۔ لیکن آپ خود یہاں مت آیئے گا۔ اور نہ ہی مینا گلی سے کوئی اور یہاں آئے۔ یہ میری درخواست ہے آپ سے...... میں دین حویلی کو اس گلی سے جڑتا ہوا نہیں دیکھ سکوں گی۔"

"تم نے پہلی بار کچھ کہا ہے تو ماننا پڑے گا۔" روشن بیگم نے مسکراتے ہوئے رضامندی دے دی تھی۔ ان کا کام دور بیٹھے ہوسکتا تھا تو کیا ضرورت تھی انہیں یہاں آنے کی۔ وہ ویسے بھی ایسی جگہوں پر جانا پسند نہیں کرتی تھیں جہاں کے مالک ان کی اداؤں کے ماتحت نہ ہوں۔ "میں یہاں دوبارہ نہیں آؤں گی۔ اور نہ ہی میری طرف سے کوئی اور آئے گا۔"

"بے حد شکریہ......"

"اب چلتی ہوں۔" روشن بیگم کھڑی ہوئی تھیں۔ چاند بھی اُٹھی تھی۔ روشن بیگم دروازے کی طرف بڑھی تھیں۔ پھر کچھ خیال آنے پر رکی تھیں۔ انہوں نے پلٹ کر چاند کو دیکھا تھا۔

"ویسے...... صندل کیسی ہے۔؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔ اور چاند تو جیسے سانس لینا ہی بھول گئی تھی۔

''م......م......میں......مجھے کیا معلوم......''

''سچ میں......؟ تمہیں نہیں معلوم......؟'' وہ مسکرائی تھیں۔ ''بہت مذاق کرتی ہو تم......'' اور قہقہہ سا لگا کر کمرے سے باہر چلی گئی تھیں۔ چاندامی دم سادھے کھڑے انہیں جاتا ہوا دیکھتی رہی تھی۔

☆☆☆

بستامی کی شادی کسی حد تک سادگی سے ہوئی تھی۔ کیونکہ بستامی کسی بات میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ اسے جیسے شادی کا کوئی شوق ہی نہیں تھا۔ وہ شادی ایسے ہی کر رہا تھا جیسے کوئی کاروباری معاہدہ کر رہا ہو۔ شادی کو لے کر اس کے دل میں کوئی پر جوش نہیں تھا۔ اس نے چاند سے ایک بار بھی کومل کی تیاریوں کے حوالے سے بات نہیں کی تھی۔ اور چاند جس بھی طرح کمر استوار کروا رہی تھی اسے اس سے بھی کوئی غرض نہیں تھی۔ پھر بھی چاند اپنے طور پر ہر کام بہترین کرنے کی کوششوں میں لگی ہوئی تھی۔

لڑکیوں کے اصرار پر گھر پر ہی چھوٹی سی مہندی کی رسم کر لی گئی تھی۔ جس میں حاجی بوا نے دل و جان سے ڈھولکی بجائی تھی۔ آج سے پہلے جو بھی شادیاں ہوئی تھیں وہ سب عجیب ماحول میں ہوئی تھیں۔ حاجی بوا کے اندر کا ہنر بستامی کی شادی پر نکل کر آیا تھا۔ انہوں نے اتنے پرانے پرانے گانے گائے تھے جن کے بول سن کر لڑکیاں لوٹ پوٹ ہو ہو گئی تھیں۔

اگلے دن بارات تھی۔ جو کہ حویلی کے مکینوں کے علاوہ مزید چند ایک افراد پر مشتمل تھی۔ روشن بیگم نے مینا گلی سے کافی فاصلے پر ایک گھر کو عارضی طور پر لے لیا تھا۔ بارات کا انتظام وہاں ہی کیا گیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ چاند بارات کو مینا گلی میں لانے پر دل سے خوش نہیں ہوگی۔ پھر اس شادی پر چاند کو خوش کر دینے کا مطلب تھا ایمن کے لیے دروازے کھولنا۔ اور وہ کومل کے بعد اب چاہتی تھیں کہ ایمن بھی جلد سے جلد رحمانی کے ساتھ بیاہ دی جائے۔

نکاح کے بعد کھانا کھایا گیا تھا اور پھر سجی دھجی کومل کو لے کر سب واپس حویلی پہنچے تھے۔ چاند نے خوش دلی سے کومل کی رسمیں کی تھیں۔ لڑکیاں بھی ہنسی ٹھٹھول کرنے لگی تھیں۔ رات کا پہلا پہر تو اسی میں بیت گیا تھا۔ پھر جب دروازے سے باہر بستامی نے دستک دی تو چاند نے لڑکیوں کو وہاں سے جانے کو کہا تھا اور خود وہ کمرے کے دروازے کے آگے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

''لاؤ......میرا نیگ دو بستامی......'' اس نے اپنا ہاتھ آگے کیا تھا۔

''کس بات کا......؟'' بستامی واقعی ہی میں انجان تھا۔

''رسم ہوتی ہے۔ دیکھ نہیں رہے میں تمہارا راستہ روکے کھڑی ہوں۔''

''اوہ اچھا......'' بستامی نے جیب میں ہاتھ ڈالا تھا اور بہت سے پیسے نکال لیے تھے۔

''پیسے نہیں چاہئیں۔''

''تو پھر کیا چاہیے؟''

''وعدہ چاہیے۔''

''کیسا وعدہ......؟''

''کہ جب جو مانگوں گی دو گے۔''

بستامی چند لمحے چاند کو دیکھتا رہا تھا۔ چاند نے آج عجیب انداز اپنایا ہوا تھا۔ مدتیں ہوئی وہ اس طرح کے لاڈ کرنے کی عادی نہیں رہی تھی۔ بستامی بھی آج الگ موڈ میں تھا۔ پھر چاند نے پہلی بار کچھ مانگا تھا۔ اسے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ وعدہ کرتا ہوں۔ جب جو مانگوں گی دوں گا۔''
''وعدے کی یاد کے طور پر اپنی انگوٹھی اتار کر دو۔''
بستامی نے چپ چاپ انگوٹھی اتار کر دے دی تھی۔
''اب تم اندر جا سکتے ہو۔'' چاند دروازے کے آگے سے پرے ہو گئی تھی۔ بستامی نے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا تھا۔ چاند انگوٹھی پکڑے خوش تھی۔ اس وعدے کے بدلے وہ صندل کو واپس اس حویلی میں لانا چاہتی تھی۔ اگر اس نے آج موقع شناسی کا فائدہ اٹھا لیا تھا کچھ برا نہیں کیا تھا سچے سے سچا انسان بھی اپنے مطلب کے لیے مطلب پرست بن ہی جاتا ہے۔
''اب تم بہت جلد اس حویلی میں واپس آ جاؤ گی میری جان......'' مستقبل کو سوچ کر ہوئے چاند خوش تھی۔

☆☆☆

صندل کو چھٹا مہینہ لگ گیا تو میر زاد نے اس کے لیے ایک ملازمہ کا انتظام کر دیا۔ وہ اس کے معاملے میں بہت محتاط ہو چکا تھا۔ چونکہ گھر میں ایسے وقت میں کوئی بڑا موجود نہیں تھا اس لیے وہ صندل کا خیال ایسے رکھ رہا تھا جیسے اگر چاند یہاں ہوتی تو رکھتی۔
''اب تم گھر کا کوئی کام مت کرنا۔'' اس نے پیار سے کہا تھا۔
''میں پہلے بھی کوئی کام نہیں کرتی تھی۔ بس تھوڑے بہت......''
''وہ تھوڑے بہت بھی نہ کیا کرو۔ ملازمہ سب دیکھ لے گی۔''
''تو پھر میں سارا دن کیا کروں گی۔؟'' وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔
''آرام اور مجھ سے پیار......'' اس نے شوخی سے اس کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ صندل شرما گئی۔
''جو کھانے کو دل کرے۔ مجھے بتا دینا...... ہو سکتا ہے کہ کل یا پرسوں میں شہر جاؤں۔''
''چاند امی نے کچھ چیزیں بنا کر بھیجی ہیں۔ وہ بہت ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ مزید بھی بھیج دیں گی۔''
''کیا تم نے چاند امی سے چیزیں بنا کر بھیجنے کو کہا تھا۔''
''ہاں...... ویسے میں نہ بھی کہتی تو انہوں نے خود سے ہی بھیج دینا تھیں۔''
''کہیں حویلی میں کسی کو شک نہ ہو جائے۔''
''بالکل نہیں ہوگا۔ چاند امی نے صرف حاجی بوا کو بتایا ہوا ہے۔ حاجی بوا ہی ارشادی بابا کے پاس آتی جاتی ہیں۔ اور ارشادی بابا ہم تک خط اور چیزیں بھجوا دیتے ہیں۔ نہ تو حاجی بوا کسی کو کچھ بتائیں گی اور نہ ہی ارشادی بابا......''
''ٹھیک ہے۔ جو تمہیں بہتر لگے۔'' میر زاد کہہ کر چپ ہو گیا تھا۔ صندل نے اس کی خاموشی کو محسوس کیا تھا۔ وہ کافی دنوں سے میر زاد کی چپ کو دیکھ رہی تھی۔ شاید اس کی خاموشی کی وجہ اس کی تنہائی تھی۔ رشتوں سے تنہائی......
''میر...... ایک بات کہوں۔''
''کہو......''
''تم زویا آپی سے بات کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔ میں بھی تو چاند امی سے رابطے میں ہوں۔''
''چاند امی تم سے ناراض نہیں ہیں۔ لیکن زویا آپی مجھ سے سخت ناراض ہوں گی۔''
''تو تم انہیں جا کر منا لو...... معافی مانگ لو ان سے...... وہ تم سے پیار کرتی ہیں۔ تمہیں یاد کرتی ہوں گی۔''
''پتا نہیں یاد کرتی ہوں گی یا بددعائیں دیتی ہوں گی۔''

''ایسے مت کہو...... ایک بہن بھائی کو بد دعا نہیں دے سکتی ہے۔''
''میں نے ان کے ساتھ برا بھی تو بہت کیا ہے۔''
''تم اتنے دنوں سے ان سے دور بھی تو ہو۔ تمہاری جدائی میں وہ تمہاری غلطی فراموش کر چکے ہوں گے۔''
''میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔ جو شاید کارآمد ثابت ہو جائے۔''
''وہ کیا ہے۔''
''ہم بچے کی ولادت کے بعد کراچی جائیں گے۔ ہم تینوں...... مجھے تمہارے ساتھ اور بچے کے ساتھ دیکھ کر زویا آپی یقیناً نرم پڑ جائیں گی اور زوہیب بھائی بھی...... ہمارے بچے کو دیکھ کر زویا آپی اسے گود میں لیے بنا نہیں رہ سکیں گی۔''
''کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو میر...... بچے کو دل کرسب کے دل ہی پگھل جائیں گے۔''
''اسی لیے میں بچے کی ولادت کا انتظار کر رہا ہوں۔''
''پھر یہ انتظار بھی خوشی کا ہو...... میں روز رات میں دعا کروں گی کہ زندگی ہم پر اپنی آسانی کرے۔ ہمارے ناراض رشتے داروں کے دلوں میں ہمارے لیے نرمی پیدا کرے۔''
''آمین......'' اداسی میں مسکراتے ہوئے میرزاد نے کہا تھا۔

☆☆☆

رات میں ربنی بول رہی تھی۔ پہاڑی علاقوں میں تو ویسے بھی ربنی کی آواز بہت واضح اور دور تک سنائی دیتی ہے۔ انسان کو رات میں بھی تنہا ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ اور حویلیاں والوں کو تو ویسے بھی تنہا ہونے کا احساس نہیں ہو سکتا تھا۔ سالوں سے دین حویلی سے سنگھ کی آواز ان کی نیندیں خراب کیا کرتی تھی۔ نجانے رحبانی کو رات میں نیند کیوں نہیں آتی تھی۔ وہ تو دن میں بھی کم ہی سوتا ہوا نظر آتا تھا۔ رات میں جاگنے کی عادت اس نے کیسے اپنائی تھی۔

رحبانی کے کمرے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چاند رک گئی تھی۔ سنگھ کی دکھ بھری آواز نے اس کے قدم روک دیے تھے۔ بہت دنوں کے بعد اسے احساس ہوا تھا کہ رحبانی کی بربادی میں اس کا کتنا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ بہت دنوں سے وہ یہ ہی سوچ رہی تھی کہ اس بربادی کے اثرات کو اب اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد کیسے ختم کیا جا سکتا ہے۔

چاند رحبانی کے کمرے میں آئی تھی۔ پہلے اس نے دستک دی تھی پھر رحبان کا نام پکارتے ہوئے دروازہ کھولا تھا۔ لیکن کمرا خالی تھا۔ رحبان وہاں نہیں تھا۔ وہ یقیناً چھت پر تھا۔ لیکن اس کی گرم چادر کرسی پر ہی پڑی ہوئی تھی۔ چاند نے چادر اٹھائی تھی۔ رات میں اب خنکی بڑھنے لگی تھی۔ رحبانی بنا چادر لیے ہی چھت پر چلا گیا تھا۔ کچھ فکر ہی نہیں رہتی تھی اسے اپنی......

چادر پکڑے چاند چھت پر آئی تھی۔ آگے سے متوقع منظر دیکھنے کو ملا تھا۔ چھت کی چھوٹی دیوار پر وہ ہلکے کپڑے پہنے اندھیرے میں لپٹے دور کے پہاڑوں کو دیکھ رہا تھا۔ چاند نے پیچھے سے جا کر چادر اس کے کندھوں پر رکھی تھی۔ رحبانی چونکا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ پیچھے چاند کھڑی تھی۔

''کیسے ہو رحبان......'' چاند نے پوچھا تھا۔ نجانے یہ سادہ سا سوال بھی ایسے کیوں ادا ہوا تھا کہ جیسے کوئی مجرم اپنے کسی جرم کی معافی مانگ رہا ہو۔

''حیرت ہے۔ آج تم میرے پاس چلی آئی ہو چاند......؟'' رحبانی نے کچھ طنزیہ انداز میں کہا تھا۔ وہ رخ بدل کر چاند کی طرف رخ کر کے بیٹھ گیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ چاند صرف اسے چادر دینے چھت پر نہیں آئی

ہوگی۔

''اس میں حیران ہونے والی کیا بات ہے۔ کیا میں تمہارے پاس نہیں آسکتی۔''

''تم تو میری زندگی میں بھی آسکتی تھیں۔ لیکن جو تمہاری مرضی ...... خیر بولو ...... کس لیے آئی ہو۔'' پہلے دُکھ سے اور پھر سرسری انداز میں رحبانی نے کہا۔ چاند کچھ اور گڑ گئی تھی۔

''ایمن کیسی ہے؟''

''کیا تم سچ میں ایمن کا حال پوچھنے آئی ہو۔؟''

''ہاں ......''

''یہ بات تو تم کومل سے بھی پوچھ سکتی تھیں۔''

''کومل نے اس کی ظاہری حالت بتائی تھی۔ اندرونی حالت تو تم ہی بتا سکتے ہو۔''

''تمہیں اس سے کیا مطلب چاند ......''

''روشن بیگم بہت پریشان ہیں رحبانی ......'' چاند اصل بات پر آئی تھی۔ رحبانی نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔ ''وہ چاہتی ہیں کہ تمہاری اور ایمن کی شادی ہو جائے۔''

''انہوں نے خود تم سے ایسا کہا۔؟''

''ہاں ...... اور یہ کام میرے ذمے لگایا ہے۔''

''اور تم نے مہان بنتے ہوئے انہیں رضامندی دے دی ہوگی ......'' رحبانی نے طنز کیا تھا۔ چاند اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔ ''اتنا مہان بننے کا شوق کیوں ہے تمہیں چاند ...... کیا کوئی دیوی بننا چاہتی ہو تم ......؟''

''ایسے کیوں بات کر رہے ہو۔ ناراض ہو مجھ سے ......؟''

''میں کیوں ناراض ہوں گا تم سے ...... ناراض ہونے کے لیے بھی کسی تعلق کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور میری زندگی میں تم کوئی حیثیت نہیں رکھتیں چاند ...... ایک ذرے کے برابر بھی نہیں ......'' چاند کو بے حیثیت کرنے کے لیے وہ اس کی حیثیت مزید بڑھا رہا تھا۔ بتا تو رہا تھا کہ وہ اس سے ناراض نہیں ہے۔ لیکن درحقیقت دل میں بے پناہ نفرت پالے ہوئے تھا۔

''تم ایمن سے شادی کرو گے یا نہیں ......؟''

''ہرگز نہیں ......''

''پھر ساتھ کیوں ہو اس کے ......''

''تم پوچھنے والی کون ہوتی ہو چاند ...... کیا لگتی ہو تم میری ......؟ کس حیثیت سے میرے پاس چلی آئی ہو۔ کیا اس حویلی میں تم سے پوچھنے والا کوئی موجود ہے۔؟ تم نے خود ساری زندگی شادی نہیں کی ...... دین بابا اور بستامی کی بات نہیں مانی ...... اب تم مجھ سے کیسے باز پرس کر سکتی ہو۔'' رحبانی غصے سے بولتا چلا گیا تھا۔

''میں تو آتش کی بیوہ ہوں۔ اس لیے میں نے دوبارہ شادی نہیں کی ...... میں اس کے جتنا کسی کو چاہ نہیں سکتی تھی۔''

''پھر جان لو کہ میں بھی ایمن سے اس لیے شادی نہیں کر رہا کہ اسے اتنا نہیں چاہ سکتا ...... جتنا ......'' اس نے چاند کو دیکھا تھا۔ ''جتنا ایک وقت میں کسی اور کو چاہا تھا۔''

رحبانی نے کہا تھا۔ کسی حد تک دُکھ سے یا شاید نفرت سے ...... پھر وہ جلدی سے وہاں سے چلا گیا تھا۔ چاند اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑی اسے جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

چودھویں کی رات کا وہ چاند اماوس ہو چکا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجائی دے رہا تھا۔ پھر پہاڑی علاقوں کی رات...... جہاں قدم قدم پر درخت ہوتے ہیں۔ اتنے گھنے درخت کے چاند زمین پر بھی اتر آئے تو راستے دکھائی نہ دیں۔ تعبیر کو بھی کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ بھاگتی جا رہی تھی اور بس بھاگتی جا رہی تھی۔

اس نے گھر سے بھاگنے کے لیے رات کا وقت چنا تھا۔ بہت دنوں سے وہ آج کی رات کی پلاننگ کر رہی تھی۔ کمال اپنے بیوی بچوں کے پاس گیا ہوا تھا۔ وہ دو تین دن سے پہلے واپس آنے والا نہیں تھا۔ گھر کے مرد ملازم عشاء کی نماز کے بعد سو جایا کرتے تھے۔ چوکیدار جاگتا رہتا تھا۔ لیکن آج اتفاق سے وہ بھی کسی کام سے بڑے شہر گیا ہوا تھا۔ تعبیر کو ایسی ہی کسی صورتِ حال کا انتظار تھا۔ اور اس نے موقع کا فوراً سے فائدہ اٹھا لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ان بہت سے دنوں میں ملازمہ سے اس نے باتوں باتوں میں سڑکوں کے بارے میں پوچھ لیا تھا کہ کون سی سڑک کہاں جاتی ہے۔ بڑی سڑک کتنی دور ہے۔ اور چھوٹی والی کہاں کہاں جا کر ملتی ہے۔ ملازمہ اسے سب بتاتی گئی تھی اور تعبیر نے اپنے ہی اندازے سے صفحے پر اس جگہ کا ایک نقشہ بنا لیا تھا۔ نقشے کی اصلیت زیادہ اہمیت نہ رکھتی تھی۔ اہم یہ تھا کہ وہ اس فام ہاؤس سے کیسے نکلتی ہے۔ راستے کہیں نہ کہیں تو جاتے ہی تھے۔ جو یقیناً اسے بھی کہیں پہنچا ہی دیں گے۔

اسے کھانا دے کر ملازمہ بھی اپنے کوارٹر میں سونے کے لیے چلی گئی تھی۔ تعبیر نے دکھاوے کو کھانا کھایا تھا۔ پھر جلدی سے اس نے اپنی دراز میں سے ان چابیوں کو نکال لیا تھا جو اس نے آج دوپہر میں ہی چرائی تھیں۔ موٹی شال اوڑھ کر گریہ پائی سے چلتی ہوئی وہ کمرے سے باہر نکلی تھی اور پھر اس سے بھی زیادہ آہستگی اور احتیاط سے آگے کی کارروائی کی گئی تھی۔ گھر کے دروازے تو کھلے ہوئے ہی تھے۔ باقی جو دروازے لاک تھے تعبیر نے بنا آواز کیے انہیں کھول لیا تھا۔

صدر دروازہ کھول کر جب وہ باہر نکلی تو چند لمحے تک تو اسے یقین ہی نہیں آیا تھا کہ وہ اس دلدل سے باہر آنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ اس نے گہرا سانس لیا تھا اور پھر راستوں کا تعین کیا تھا۔ اسے سڑک پر نہیں بھاگنا تھا۔ سڑک پر کوئی بھی اسے دیکھ سکتا تھا۔ اس لیے وہ سڑک سے فاصلے پر درختوں اور جھاڑیوں کی اوڑ میں ہوتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ شروع میں اس نے اپنی رفتار کم رکھی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے پیروں تلے آتے خشک پتے بھی اپنی آواز پیدا کریں۔ پھر جب اسے اندازہ ہوا کہ وہ کافی دور نکل آئی ہے تو اس نے بھاگنا شروع کر دیا تھا۔ چونکہ زندگی میں وہ کبھی نہیں بھاگی تھی اس لیے جلد ہی اس کا سانس پھول گیا تھا۔ لیکن آج وہ تھکنے والی نہیں تھی۔ اندھیرے میں وہ بمشکل سب کچھ ٹٹولتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

اس رات گیدڑوں نے بہت شور کیا تھا۔ جھینگر حلق پھاڑ چلائے تھے۔ سب جیسے اس قسمت کی ماری ہوئی لڑکی کا ساتھ دے رہے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس کے بھاگنے کی آواز یا اس کی پھولی ہوئی سانسوں کی سرگم کو کوئی سن لے۔ سب نے اسے اس جگہ سے بھاگ جانے میں مدد کی تھی۔ درخت جیسے خود بخود پیچھے ہوتے اس کے لیے راستہ بناتے چلے گئے تھے۔ پگڈنڈیاں اس کے پاؤں میں خود سے چلی آئی تھیں۔ پاؤں تلے کے پتھر نرم گھاس میں بدل گئے تھے۔ پھر بھی وہ جلد تھک گئی تھی۔ اس کے سینے میں درد ہونے لگا تھا۔ ایسے جیسے وہ خشک ہو چکا ہو۔ لیکن اس نے کسی بات کی پروا نہیں کی تھی۔ اسے کسی قیمت پر رکنا نہیں تھا۔ یہ کمال سے نفرت تھی جو اس کی ہمت بندھائے ہوئے تھی۔ اس لیے وہ بس بھاگتی جا رہی تھی۔

اور اسی طرح بھاگتے ہوئے نجانے کیا بات ہوئی تھی کہ تعبیر کو رونا آ گیا تھا۔ اپنی قسمت پر رونا...... وہ اپنی ماں سے ملنے جا رہی تھی۔ کیسا وقت آ گیا تھا کہ اس پر کہ اسے اپنی ماں سے ملنے کے لیے دنوں پلاننگ کرنا پڑی

تھی۔ اور رات کے اس اندھیرے میں بھاگنا پڑ رہا تھا۔ وہ خطرے سے جان چھڑوا کر بھاگ رہی تھی۔ لیکن کیا یہ ایک نیا خطرہ نہیں تھا۔ رات کے اس پہر کوئی بھی اسے دبوچ سکتا تھا اور پھر وہ اس کا کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اسے جان سے مار سکتا تھا یا اس کی عزت سے کھیل سکتا تھا۔

جب اپنے اندازے کے مطابق تعبیر بہت دُور نکل آئی تو وہ رک گئی۔ اور ایک جگہ پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا سانس درست کیا تھا۔ آنسو صاف کیے تھے۔ وہ کافی دُور نکل آئی تھی اور اتنے راستے گھوم چکی تھی کہ اگر ملازموں کو پتا چل بھی جاتا کہ وہ گھر سے بھاگ چکی ہے تو وہ اسے تلاش نہیں کر سکتے تھے۔

وہ رات بہت لمبی تھی۔ جیسے ہفتوں پر چھا گئی ہو۔ ٹیلے پر بیٹھے بیٹھے تعبیر نے اپنی پوری زندگی یاد کر لی تھی۔ اپنا بچپن، جوانی، شادی اور پھر شادی کے بعد کے دن تھی...... وہ نہیں جانتی تھی کہ صندل کہاں تھی لیکن اتنا ضرور جانتی تھی کہ صندل کے حصے کی جہنم کو اس نے سہا تھا۔

فجر کی پہلی اذان اس کے کانوں میں پڑی تھی جب وہ اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔ اس نے ہمت مجتمع کی تھی اور اٹھ کر پھر سے بھاگنا شروع کیا تھا۔ جب سورج کی ہلکی سی روشنی دھرتی پر پھیلنے لگی تو تب وہ سڑک کے سامنے ہوئی تھی۔ اب اسے کوئی دیکھ بھی لیتا تو گھبرانے والی بات نہیں تھی۔ وہ بہت دُور نکل آئی تھی۔ سڑک پر بہت دیر تک کھڑے رہنے کے بعد اسے دُور سے ایک ٹرک اپنی طرف آتا ہوا دکھائی دیا تھا۔ وہ سڑک کے بیچوں بیچ کھڑی ہوگئی تھی۔ ٹرک اس تک پہنچ کر رکا تھا۔ وہ ڈرائیور والی کھڑکی کی طرف گئی تھی۔

"میں بہت مشکل میں ہوں بھائی...... میری مدد کردو۔ خدا تمہارا بھلا کرے گا۔" اس نے منت بھرے انداز میں کہا تھا۔ ڈرائیور نے سر سے پیر تک اس بدحال لڑکی کو دیکھا تھا۔

"کیا ہوا ہے۔؟ کیسی مدد چاہیے۔؟"

"مجھے بس اسٹاپ تک جانا ہے۔ جہاں سے ایبٹ آباد یا حویلیاں کی بس مل جائے۔"

"ٹھیک ہے، بیٹھ جاؤ......"

"بہت بہت شکریہ......" تعبیر فوراً سے گھوم کر دوسری طرف گئی تھی۔ ڈرائیور نے دوسری طرف والا دروازہ کھول دیا تھا۔ تعبیر وہاں بیٹھ گئی تھی۔ ایک انجان مرد کے ساتھ بیٹھنا خطرناک ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ اتنے مہینے ایک خطرناک ماحول میں رہی تھی کہ اب ہر طرح کا خطرہ اسے چھوٹا محسوس ہو رہا تھا۔

کشمیر کی اونچی نیچی سڑکوں پر سفر شروع ہوا تھا۔

"ٹرک میں تازہ سبزیاں ہیں۔ مجھے انہیں لے کر منڈی تک جانا ہے۔ آگے ایک چھوٹا بس اسٹاپ آئے گا۔ وہاں سے آسانی سے ٹیکسی مل جائے گی۔ تم وہاں سے اڈے تک جا سکتی ہو۔ اڈے سے حویلیاں یا ایبٹ آباد کی ویگن مل جائے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں چلی جاؤں گی۔ خدا تمہیں اس کا اجر دے گا۔" تعبیر نے کہا تھا اور پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔ بالآخر وہ اس قید سے آزاد ہوگئی تھی۔ باہر کے سرسبز درختوں کو دیکھتے ہوئے اس نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا تھا۔

☆☆☆

اس صبح کی بادِ صبا عام دنوں کی نسبت زیادہ ٹھنڈی تھی۔ زیادہ خوش گوار...... یا شاید ویسا تعبیر کو محسوس ہو رہا تھا۔ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے وہ مسلسل مسکرا رہی تھی۔

وہ سفر آدھے گھنٹے تک جاری رہا تھا۔ دن پوری طرح سے نکل آیا تھا۔ لیکن ابھی سڑکوں پر آمد و رفت جاری نہ ہوئی تھی۔ لوگ گھروں میں تو جاگ چکے تھے لیکن ابھی باہر نہ نکلے تھے۔ ٹرک ایک ایسی جگہ پر رکا تھا جہاں ایک

بڑا احاطہ تھا اور ایک چھوٹی سی دکان...... اور وہاں تین ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔

"میں باہر جا کر ٹیکسی کا انتظام کرتا ہوں۔" ٹرک ڈرائیور نے تعبیر سے کہا تھا۔ "تب تک تم یہاں ہی رہنا......" اسے تاکید کر کے وہ خود نیچے اُتر گیا تھا۔ پہلے وہ دکان کے اندر گیا تھا۔ اس نے شاید وہاں سے اپنے لیے سگریٹ لیا تھا۔ پھر باہر نکل کر سگریٹ پیتے ہوئے وہ باری باری سب ٹیکسی والوں سے بات کرنے لگا تھا۔ ایک سے دوسرے کے پاس جا رہا تھا۔ لیکن شاید بات نہیں بن رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اس کے پاس واپس آیا تھا۔

"کیا ہوا......؟"

"بڑے اسٹاپ جانے کو کوئی تیار نہیں ہے۔"

"لیکن کیوں......؟"

"وہاں جاؤ تو سو روپے کی پرچی کٹوانی پڑتی ہے۔ اس لیے وہاں جانے کے لیے کوئی تیار نہیں ہو رہا ہے۔"

"میں پرچی کے پیسے دے دوں گی۔" تعبیر نے اپنی سونے کی انگوٹھی اتار کر ڈرائیور کے آگے کی تھی۔ ٹرک ڈرائیور نے چند لمحے انگوٹھی کو دیکھا تھا۔

"یہ تم اپنے پاس رکھو...... کوئی نیا ٹیکسی والا آتا ہے تو میں دیکھتا ہوں۔" وہ کہہ کر پھر سے چلا گیا تھا۔ تعبیر بے چین ہونے لگی تھی۔ دن نکل آیا تھا۔ کہیں کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ اور دیکھ کر پہچان نہ لے۔ کمال کے ملازم یقیناً اب تک اسے تلاش کرنے کے لیے نکل چکے ہوں گے اور بس اسٹاپ تک آنا تو ان کی پہلی ترجیح ہو گا۔

"ایک ٹیکسی والا جانے کے لیے تیار ہو گیا ہے۔ وہ دکان کے اندر ناشتا کر رہا ہے۔ ناشتے کے بعد تمہیں لے جائے گا۔ تم اندر چلی جاؤ...... مجھے منڈی جانا ہے۔ دیر ہو رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ تمہارا بہت بہت شکریہ بھائی......"

"کوئی بات نہیں......"

تعبیر نیچے اُتر آئی تھی۔ ٹرک ڈرائیور واپس اپنی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس نے تعبیر کو ایک نظر دیکھا تھا پھر اپنا ٹرک اسٹارٹ کیا تھا اور آگے بڑھ گیا تھا۔ تعبیر دکان کے اندر گئی تھی۔ جہاں دو ایک ٹیبل لگے ہوئے تھے۔ ایک آدمی ٹیبل پر بیٹھا ہوا تھا۔

"کتنی دیر لگے گی بھائی......" اس نے آدمی کی پشت پر پہنچ کر اس سے کہا تھا۔ آدمی نے اٹھتے ہوئے رخ تعبیر کی طرف کیا تھا اور پورا کشمیر تعبیر کے پیروں تلے سے نکل گیا تھا۔ کاؤنٹر والے آدمی نے جلدی سے آگے بڑھ کر دکان کا دروازہ لاک کر دیا تھا۔ وہ ایسا نہ بھی کرتا تو تعبیر میں کہاں ہمت رہی تھی کہ وہ وہاں سے بھاگ سکتی۔

کمال غضب ناک نظروں سے تعبیر کو دیکھ رہا تھا۔ اور پھر اگلے ہی پل اس نے زوردار تماچا تعبیر کے منہ پر دے مارا تھا۔

☆☆

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ......)



قانتہ رابعہ

دیا جلائے رکھنا ہے

فیصل انور کے منہ سے نکلتی جھاگ کے چھینٹے دور تک گرے اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور مغلظات کا طوفان منہ سے برآمد ہو رہا تھا کونے میں سہمی کھڑی نازیہ جسے اس کی بیوی ہونے کا گزشتہ گیارہ سال سے شرف حاصل تھا، کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں...... تقدیر اس کے ساتھ ہی ایسے مذاق کیوں کرتی ہے؟ جتنا وہ بچوں کی تربیت کرنے میں جان ہلکان کرتی ہے اسے کوئی نہ کوئی نکتہ اعتراض مل جاتا ہے۔ تینوں بچے باپ کے طعنوں کی مار کھا کھا کر ادھ موئے ہو رہے تھے۔

ہونہہ، سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے، تم ذمہ دار ہو بچوں کی نالائقیوں پر پردہ ڈالنے کے ساتھ ساتھ ان کے جرائم میں بھی برابر کی شریک ہو، سمجھیں...... "

فیصل نے اپنی زوجہ نازیہ کے پیچ کسنے کا کام شروع کیا اور کان کھول کر سن لو آئندہ مجھے بچوں کے اسکول، یا محلے والوں کی طرف سے کوئی شکایت ملی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" غصے میں دھپ دھپ کرتا کسی بدمست ہاتھی کی طرح وہ گھر سے باہر نکل گیا۔

باپ کے باہر جانے کے بعد بہت دیر تک بچے اپنی جگہ سے نہیں ہلے، نازیہ کی آنکھیں صدمہ کی شدت میں آنسو بہانا بھول گئی تھیں، اور کب تک اور کیوں بہاتیں آنسو یہ تو آئے روز کا قصہ تھا اب تو اس کی آنکھوں میں جھانکو تو کسی بیوہ کی آنکھوں کی طرح بنجر اور ویران تھیں۔

اس نے کسی بچے کو برا بھلا نہیں کہا کسی کو موردالزام نہیں ٹھہرایا، کسی کے سر پر ہونے ان ہونے گناہوں کا ملبہ نہیں ڈالا اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس کے احساسات اور جذبات نامی چیز پر سیر من مٹی ڈالی جا چکی تھی۔

کیا کبھی اس روئے زمین پر کسی کے بچے نے شرارت نہیں کی؟ کیا کسی کے بچے سے کبھی نقصان نہیں ہوا؟ کیا بچوں کی شرارتوں کو غلط تربیت کہہ کر بس ان کی ماں کی پیٹھ پر ہی چابک برساتے ہیں؟ کیا شرارتوں پر ماں اکسایا کرتی ہے؟ کیا بچوں کے ہاتھوں ہونے والے ہر نقصان کی ذمہ دار بس ماں ہی ہوتی ہے؟

تربیت تو پہلے دن سے ماں باپ دونوں کی پہلی ذمہ داری ہوتی ہے۔ باپ پردیس میں کمائی کے لیے چلا جائے گھر کی اور گھر سے باہر کی ساری ذمہ داری کا

بوجھ بس عورت کے کندھوں پر ڈال دیا جاتا ہے۔اور بوجھ بھی صرف اپنی ذات کا نہیں بچوں کی پیدائش ان کی بیماریاں، بوڑھی ساس کی ہزار خاطر مدارات کے بعد بھی گھر کی مکدر رہنے والی فضا، ہر دوسرے دن ہونے والی جنگ کا اختتام اس فقرے پر ہوتا۔"جس عورت کو گھر بیٹھے پردیس میں کولھو کے بنے بیل شوہر کی کمائی میسر ہو وہ دونوں ہاتھوں سے اس دولت کو لٹائے جا رہی اسے بوڑھی ساس کی کیا فکر؟"

سسرالی رشتے دار قریبی گاؤں میں رہتے تھے جن کے لیے فیصل کا گھر ایک ہوٹل کی سی حیثیت رکھتا تھا۔ اور ہوٹل بھی رات گئے دروازے بند کر لیتے ہیں ان کے ہاں تو رات گئے گھر کے دروازے پر لگی اطلاع گھنٹی بجنا شروع کر دیتی۔ کسی ساتویں پشت سے جڑے رشتے داروں کی بچی دردزہ میں مبتلا ہوئی، اسے گاؤں کی اکلوتی ڈاکٹرنی نے جواب دے دیا ہوتا یا کسی کو کراچی جانے والی ٹرین پکڑنا ہوتی تو اس گھر میں سستا کر جانا لازم ہوتا۔

کسی کے بیٹے کی بری کے لیے بھی بہتر مقام دکھائی دیتا جہاں رک کر بری کی خریداری جمع ہوتی رہے۔ مزید خریداری کے لیے تو ناتائی کے طور پر اسی گھر سے چائے پانی کھانا پینا دانہ دنکا بھی لینا پڑ جاتا......

☆☆☆

جب شادی کے چار سال کے بعد فیصل کے تین دوروں میں تین بچوں کی آمد ہوئی اور پہلوٹھی کے بیٹے کو آئے روز کھانسی نزلہ بخار کبھی الٹیاں کبھی موشن لگے رہتے، میاں سات سمندر پار سے سب بیماریوں کا ذمہ دار نازیہ کو قرار دیتا۔

شروع میں تو نازیہ آنسوؤں سے روتی، صفائیاں پیش کرتی، وضاحتیں کرتی۔ پھر ہر آئے گئے کے سامنے اپنی فضول قسم کی مصروفیات کا لمبا نقشہ کھینچتی لوگوں کو اس سے کیا غرض کل کی آئی بہو کس حد تک بچی ہے۔ لوگوں کا واسطہ فیصل اور اس کی ماں سے تھا سو ان کی حمایت پر مجبور تھے، سو کر رہے تھے۔

بڑے بیٹے شاہ زیب کو اسکول میں داخل کروایا اللہ معاف کرے ستر بچوں کو اسکول کے لیے تیار کرنا اور اس ڈھیٹ ہڈی کو تیار کرنا ایک برابر تھا۔ پھر اس کا



روزانہ ہوم ورک کروانا، اس کے کپڑے جوتے ٹائی بیلٹ کو سونے سے پہلے تیار کر کے رکھنا آئے روز اسکول سے اس کی شرارتوں کے بارے میں پتا چلتا رہتا کبھی کبھی مسئلہ زیادہ سنگین ہو جاتا والدین کی طلبی ہوتی تو نازیہ کو ہی والد اور والدہ دونوں کا رول ادا کرنا ہوتا۔

مزید دو سال یہی کچھ ہوتا رہا۔ کبھی کسی کے سر پر کتاب ماردی، کسی کی چیز چرالی، کسی کے بکوٹا بھر دیا۔ ان سب کا سامنا نازیہ کو کرنا پڑتا۔ وہ اکیلے میں بھی اور سب میں بیٹھ کر بھی شاہ زیب کو سمجھاتی دھمکاتی۔ چھوٹے جہاں زیب اور سدرہ پھر کنٹرول میں تھے لیکن شاہ زیب خدا جانے کس ڈھیٹ مٹی سے پیدا ہوا تھا پیار سے سمجھانا مار اثر کرتی، جب جہاں زیب بھی اسکول جانے کی عمر کو پہنچا تو بیٹھے بٹھائے سیاہی بھرا دن اس کے مقدر پر سیاہی پھیر گیا۔ محلے کے بچوں کے ساتھ شرارت کرتے کرتے بات لڑائی جھگڑے تک جا پہنچی شاہ زیب نے زمین پر پڑا نوکیلا پتھر اٹھایا اور کلاس فیلو کے سر پر دے مارا، پتھر کی نوک آنکھ کے نیچے لگی یا اوپر یہ تو فوری پتا نہ چل سکا البتہ خون کے فوارے ابلتے اور آنکھ کی پتلی باہر نکلی سب نے دیکھی۔

پورے محلے میں ہاہا کار مچ گئی۔ بچہ تو ٹریٹمنٹ کے لیے قریبی اسپتال منتقل کر دیا گیا، اللہ نے معاملہ

خراب ہونے سے بھی بچالیا دو تین ٹانکے کان اور آنکھ کی درمیانی جگہ پر لگے آنکھ بھی اندر چلی گئی۔

مگر گھرانے کا نازیہ کے بچوں سے بیر پڑ گیا۔ جہاں نظر آتے شیر کی طرح غراتے مارنے کو دوڑتے۔ معاملہ قابو سے باہر ہوا تو فیصل کو واپس آنا پڑا۔ فوری حل یہی تھا کہ مکان کہیں اور لے لیا جائے۔ بچوں کا اسکول بدل لیا جائے۔ یوں بچوں کے معاملات تو کسی حد تک سدھر گئے البتہ نازیہ کی بگڑی ہوئی تقدیر نہ سدھر سکی۔

☆☆☆

سترہ اٹھارہ سالوں سے پردیس میں مقیم فیصل کو پاکستان اور پاکستان کا ہر سطح پر گندہ نظام پسند نہیں تھا۔ ٹریفک پولیس نے جرمانہ کر دیا تو قصور نازیہ کا، سبزی والے نے تازہ سبزی دکھا کر باسی سبزی کا شاپر دھوکے میں بدل کر دے دیا تو نزلہ نازیہ پر گرتا، بچوں کی صحیح دیکھ بھال کی ہوتی نانہجار نے تو فیصل کو کیوں واپس آنا پڑتا، جوتوں کی دکان پر جوتا پہن کر دیکھا جاتا۔ گھر آکر وہ جوتا چھوٹا نکلتا اور پاؤں کاٹتا تو اس کی ذمہ داری نازیہ پر عائد ہوتی۔

شروع شروع میں نازیہ لب کشائی کر لیتی تھی مگر پھر فتنہ فساد کے انگارے سارے گھر کو لپیٹ میں لے لیتے تو اس نے کچھ بھی کہنا چھوڑ دیا۔ یہی سب برداشت کرتے کرتے شادی کو گیارہ سال مکمل ہو گئے۔

آج کے دنگے فساد کی وجہ بھی بس اتنی تھی کہ شاہ زیب اور جہاں زیب کی گیند کھیلتے ہوئے اقبال صاحب کے ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے شیشے کو توڑ بیٹھی۔ اقبال صاحب شکایت لگانے کے لیے بنفس نفیس خود ان کے قریب خانے پر تشریف لائے اور جس طرح گالیوں اور مغلظات سے مالا مال ہو کر آئے تھے اسی طرح احساس فتح و نصرت کے ساتھ شیشے کی رقم بطور جرمانہ وصول کر کے واپس چلے گئے۔

فیصل جس کی زبان دیار غیر کی اخلاقی اقدار ان کے طور طریقوں کی مالا جپتے ہوئے نہیں تھکتی تھی یکسر بھول گئی کہ جہاں کی روشن مثالیں دے دے کر اس نے گھر والوں کا جینا حرام کیا ہوا ہے وہاں باپ بچے کو انگلی تک نہیں لگا سکتا۔

اقبال صاحب کے جاتے ہی پہلے اس نے لاتوں سے پھر گھونسوں سے دونوں صاحبزادوں کی خاطر تواضع کی پھر طعنوں کے لیے نازیہ کا رخ کیا۔

اس نے پہلی مرتبہ غلطی کی کہ پلٹ کر اتنا کہہ دیا "تربیت صرف ماں کی تو ذمہ داری نہیں ہے۔"

بس پھر جو کچھ ہوا وہ بتایا جا سکتا ہے نہ لکھا جا سکتا ہے۔ نازیہ کا سانس بند ہو رہا تھا اور اس کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکلنا شروع ہو گئی تھی ہاتھ پاؤں بھی شاید مڑ گئے تھے۔

یہ حالت ساس کو نظر آئی نہ ساس کے بیٹے کو۔ دونوں قہر آلود نظروں سے ڈرامے باز عورت کو دیکھتے اپنے قریبی رشتے داروں کی کسی تقریب میں چلے گئے۔ بچوں نے پڑوسیوں کو بلایا اسپتال لے جایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے شدید ڈپریشن اور دماغ پر بوجھ قرار دیا۔

اس واقعے کے بعد دونوں بیٹوں کی زندگی سے بچپنا رخصت ہو گیا، دونوں کی آنکھ میں خوف و دہشت کی تحریر رقم رہتی۔ دونوں ماں کے فرماں بردار ہو گئے۔ دونوں بچے نہیں رہے تھے۔ روبوٹ بن چکے تھے۔ نازیہ کے دائیں بائیں اس کے مضبوط ترین سہارے اس کے پیارے بیٹے بن چکے تھے۔ رہا فیصل...... تو پوتڑوں کے بگڑے بھی بھی سدھرتے ہیں!!

☆☆☆

بچے جوان ہوئے تعلیمی میدان میں جھنڈے تو نہیں گاڑ سکے لیکن کسی سے کم بھی نہیں تھے باپ کے آگے ہاتھ پھیلانے کے بجائے دوران تعلیم ہی اپنی تعلیم کے اخراجات اپنے کندھوں پر اٹھالیے۔ تعلیم مکمل ہوئی تو دوران تعلیم پریکٹیکل لائف اور قسمت نے ان کو شاندار ملازمت پلیٹ میں رکھ کر پیش کی۔ ملازمت کے آغاز ہی میں پرکشش تنخواہوں کے ساتھ رہائش اور گاڑی بھی ملی۔ نازیہ کے دن واقعی بدل گئے تھے لیکن عجیب بات تھی کہ اندر کنڈلی مار کر بیٹھا ڈر بچوں کے سینوں سے باہر نکل سکا نہ نازیہ کے دل سے۔

زمانے کا دستور ہے اقتدار، عہدہ یا اچھا پیشہ ہاتھ

لگ جائے تو ہر عورت کو وہ لڑکا اپنا داماد نظر آتا ہے۔ ان دونوں بھائیوں کے ساتھ بھی ایسے ہی ہوا درجنوں رشتے دار صف میں شامل تھے۔ اور جو رشتے دار نہیں تھے وہ رشتے دار بننے کے خواہش مند تھے یوں بہت چھان پھٹک کے بعد دونوں کے رشتے طے کر دیے گئے۔

اولاد کے رشتے ناتے طے کرنے سے فراغت کے بعد نازیہ کے شب و روز میں خاص فرق نہ پڑا بیٹوں کی کمائی سے مالی حالات کافی بدل چکے تھے۔ ساس اللہ کے پاس پہنچ چکی تھیں۔ فیصل کا وہ دم خم تو نہیں رہا تھا لیکن چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے طعن تشنیع کا بہانا مل ہی جاتا تھا اور نازیہ روز اول کی طرح آج بھی ویسے ہی ڈرتی تھی، ویسے ہی میاں کی آواز پر سہم جاتی تھی۔

منگنی کے تین ماہ بعد دونوں بیٹوں کی شادی ہوگئی۔ بیٹی ڈاکٹر بن چکی تھی اسے ہاؤس جاب کے لیے دوسرے شہر میں رہنا پڑا تو نازیہ کو بہتر یہی محسوس ہوا کہ بہوئیں گھر میں لا کر تنہائی دور کرے۔ بہوئیں آئیں، اچھی سیرت کی بچیاں تھیں، نازیہ نے اپنے آپ کو اپنی ذات میں بند کر لیا تھا۔ دن اچھے گزر رہے تھے انہی دنوں کے الٹ پھیر میں اللہ نے شاہ زیب کو بیٹی کا باپ بنا دیا۔ شاہ زیب کی بیوی مقامی کالج میں لیکچرار تھی۔ ملازمت، بیٹی اور کچھ نہ کچھ گھر کی ذمہ داری نے اسے حد درجہ مصروف کر رکھا تھا۔ پرنسپل کی سختی کی وجہ سے بچیوں کے آئے روز ٹیسٹ لینا اور پھر بروقت چیک کرنے کے بعد رزلٹ کی ایک کاپی پرنسپل کو دینے والے سلسلے نے اسے سب سے بے نیاز کیا ہوا تھا۔ گھر میں آنے کے بعد بھی وہ کالج کے مسائل میں گھری نظر آتی۔ نازیہ نے اس پر ابھی تک گھر کی کوئی ذمہ داری نہیں ڈالی تھی۔

یہ بھی عام سا دن تھا جب شاہ زیب کی بیوی سو سے زائد پیپرز ہاتھ میں لیے انہیں چیک کرنے کا سوچ رہی تھی کہ کسی چیز کے دھاڑ سے گرنے کی آواز سنائی دی گھر کے سب افراد اس طرف بھاگے جہاں سے آواز سنائی دی تھی۔

"شاہ زیب کی چار سوا چار ماہ کی بچی کروٹ لیتے ہوئے بیڈ سے نیچے گر پڑی تھی۔ بچی کے چوٹ تو شاید اتنی زیادہ نہیں لگی تھی مگر وہ سہم گئی تھی ماتھے پر خوب بڑا سا گومڑ پڑا ہوا تھا...... بچی کسی طرح بھی چپ ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ شاہ زیب نے خوں خوار نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا۔"

"تم کہاں تھیں یہ سب تمہاری وجہ سے......"

شاہ زیب......" نازیہ نے غراتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔ یہ لہجہ شاہ زیب کا سارے گھر والے پہلی مرتبہ دیکھ رہے تھے۔

"اوہ میرے خدایا......" شاہ زیب ہوش وحواس کی دنیا میں واپس آیا اور لمحے بھر کو چپ رہنے کے بعد بولا۔ "یہ سب تمہاری وجہ سے نہیں ہوا، میں بھی برابر کا ذمہ دار ہوں۔ بچی جاگ رہی تھی تو مجھے کیوں نہیں پکڑا دیا، آئندہ دھیان رکھنا مصروفیت زیادہ ہو تو مجھے یا امی کو پکڑا دیا کرو۔ اکیلی جان سے سارے کام کرنا کہاں کی شرافت ہے۔ مجھے اچھا نہیں لگا یہ سب۔"

ایک لمبی ٹھنڈی سانس لے کر شاہ زیب نے کہا......اس کے لہجے میں ندامت اور خوف تھا۔ اس نے اپنے باپ کی تمام خوبیوں پر ایک خامی کو حاوی ہو کر پانی پھیرتے دیکھا تھا جو بھی تھا اسے باپ سے بہت پیار تھا۔ وہ لاشعوری طور پر باپ کی عادت اپنانے والا تھا۔ پل بھر کے لیے ماحول سنگین ہونے کے بعد اب ہلکا پھلکا ہو چکا تھا۔

نازیہ کے سینے میں برسوں سے کنڈلی مار کر بیٹھا ڈر خوف رخصت ہو کر نیا شکار ڈھونڈنے چلا گیا تھا۔ شاہ زیب کے ہونٹوں پر خوب صورت سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں ستارے جگمگا رہے تھے۔ اسے بہر حال مثالی باپ ہی بننا تھا۔ پوتی بھی رو کر اب چپ ہو چکی تھی۔ ہاں بہو کو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہوا ہے یہ ایک دم شاہ زیب کا دھاڑتا ہوا انداز اور نازیہ کا ٹوکنا، گھورنا، شاہ زیب کا فوراً بیان اور لہجہ بدلنا، یہ سب اسے سمجھ میں تو نہیں آرہا تھا لیکن جو بھی ہوا تھا بہت خوش گوار ہوا تھا۔

☆☆



سالگرہ نمبر

نگہت سیما

مُجھے تاوان کیا دو گے


مکمل ناول

"بہت خوب صورت تحریر کی مالک ساجدہ حبیب کے نام"

"اللہ ان کے درجات بلند کرے۔ آمین"

اس رات بارش ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ صاحبزادہ شکیل الزماں سینے تک کمبل تانے نیم دراز۔ سید سلیمان ندوی کی سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تیسری جلد کا مطالعہ کر رہے تھے۔ پچھلے دنوں ابا جان کی کتابوں کے "ذخیرے" میں سے یہ تینوں جلدیں نکلوائی تھیں جو آج کل ان کے زیر مطالعہ تھیں۔ پاس ہی بلقیس بیگم بیٹھے ہوئے اپنے پوتے کے لیے سوئیٹر بن رہی تھیں۔ یکایک کھڑکی کے شیشوں پر روشنی پڑی، ساتھ ہی بجلی کی کڑک اور پھر بادل کی گرج سنائی دی تو انہوں نے بے اختیار شکیل الزماں کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"بہت طوفانی بارش ہے صاحب۔ آپ نے شاہ دل کو منع کر دیا تھا نا کہ اس موسم میں وہاں سے نہ آئے بلکہ شہر ہی میں آپا بیگم کے ہاں ٹھہر جائے۔"

"ہاں میں نے کہہ تو دیا تھا لیکن تب وہ کہہ رہا تھا کہ وہاں موسم ٹھیک ہو گیا ہے ہلکی بارش کے بعد۔" صاحبزادہ شکیل الزماں نے کتاب سے نظریں اٹھائیں۔

"لیکن یہاں تو موسم بہت خراب ہے صاحب۔" بلقیس بیگم کے چہرے پر پریشانی تھی۔

"میں نے یہاں کا بتا دیا تھا۔ امید ہے وہ آپا بیگم کی طرف چلا گیا ہوگا۔"

شاہ دل صاحبزادہ شکیل الزماں اور بلقیس بیگم کا چھوٹا بیٹا تھا۔ اللہ نے انہیں تین بیٹوں سے نوازا تھا۔ بڑے شاویز پھر شہروز اور سب سے چھوٹے شاہ دل تھے۔ شاویز کی شادی ہو چکی تھی ایک دو سال کا بیٹا تھا جبکہ شہروز اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک سے باہر گئے ہوئے تھے۔ شاہ دل ہاؤس جاب کر رہے تھے۔ انہوں نے راولپنڈی میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کیا تھا اور وہاں ہی ہاؤس جاب کر رہے تھے۔ آج صبح ہی وہ راولپنڈی سے نکلے تھے، انہیں ایک دوست کے نکاح میں شرکت کرنی تھی اور وہاں سے گھر آنا تھا کہ دو تین چھٹیاں ایک ساتھ آ گئی تھیں۔

"آپ فون تو کریں اسے کہیں نکل نہ پڑا ہو۔"

بلقیس بیگم نے اون اور سلائیاں تکیے کے پاس رکھ دیں کہ شاہ دل کی پریشانی میں کچھ کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

"کیا تھا، سگنل نہیں مل رہے۔ ویسے بھی مشکل سے ہی ملتے ہیں لیکن آج تو موسم بھی خراب ہے۔ خیر ایک بار پھر ٹرائی کرتا ہوں۔" انہوں نے پاس پڑا فون اٹھایا۔ کچھ دیر نمبر ملاتے رہے پھر رکھ دیا۔

"لینڈ لائن سے آپا بیگم کے نمبر پر فون کریں۔ تسلی ہو جائے گی کہ شاہ دل ادھر ہی ہے۔" آپا بیگم بلقیس بیگم کی بڑی بہن تھیں۔

"وہ تو صبح سے خراب پڑا ہے۔ بشارت نے کمپلین کروا دی تھی۔ لیکن اس برستی بارش میں کوئی کیسے آ سکتا ہے۔"

انہوں نے پھر سے کتاب کھول لی لیکن توجہ اور دھیان سے نہیں پڑھ پا رہے تھے۔ مرد تھے اپنی پریشانی ظاہر نہیں کر رہے تھے لیکن دل ان کا بھی اندر سے بہت پریشان تھا کہ رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ یا تو شاہ دل راستے میں تھے یا پھر وہی سگنل کا پرابلم تھا۔ باہر رہ رہ کر بجلی کڑکتی تھی اور بادل کی گرج دل دہلاتی تھی۔

☆☆☆

وہ بھی ایسی ہی طوفانی رات تھی جب رفیق الزماں اپنے بیڈ روم میں کچھ بے چین سے بیٹھے تھے۔ کمرے میں کچھ دیر پہلے ہی بشارت گیس لیمپ جلا کر رکھ گیا تھا۔ شاہ منزل کی کھڑکیاں اور دروازے

تیز ہوا سے بجتے تھے۔ انہوں نے بشارت سے کہا تھا کہ وہ دوسری منزل کی کھڑکیاں اور دروازے چیک کرلے جا کر شاید کوئی کھلے ہوں اور تیز ہوا سے کھل اور بند ہو رہے ہوں کہ کبھی کبھار بچے دن میں کھیلتے کھیلتے سیکنڈ فلور پر چلے جاتے تھے تو شاید کوئی دروازہ کھلا رہ گیا ہو۔

سیکنڈ فلور امین الزماں کے جانے کے بعد سے خالی تھا۔ بدرالنساء اپنی نگرانی میں ہر ہفتے صفائی کرواتی تھیں امین الزماں کی اسٹڈی اور بیڈ روم تو لاک ہی رہتا تھا البتہ لاؤنج کا دروازہ لاک نہیں ہوتا تھا۔ دن میں شفیق الزماں کے بچے بھی کبھار سیکنڈ فلور کے لاؤنج میں چلے جاتے تھے جب انہیں سب سے الگ جا کر کھیلنا ہوتا تھا تو۔

اس طوفانی رات میں جب بشارت اور ممتاز برآمدے میں آنکڑوں میں لٹکے جرمن ساختہ لالٹینوں کو جلاتے تھے تو تیز بارش اور ہوا کے شور میں یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کوئی گیٹ پر زور زور سے دستک دیتا ہو۔ گو امین آباد میں بجلی چند ماہ پہلے آچکی تھی۔ لیکن آج کی اس طوفانی بارش میں شاید کوئی کھمبا گر گیا تھا یا ٹرانسفارمر جل گیا تھا کہ سرشام ہی بجلی کی سپلائی بند ہو گئی تھی اور بدرالنساء نے بشارت سے کہہ کر اسٹور میں رکھے لالٹین اور گیس لیمپ نکلوا لیے تھے اور بشارت نے ان کے شیشے اچھی طرح صاف کر کے تیل ڈال کر برآمدے میں لٹکا دیے تھے۔ کہ کیا خبر بجلی آتی بھی ہے یا نہیں۔ اور ایسا ہی ہوا تھا، بجلی نہیں آئی تھی اور مغرب سے پہلے ہی کالی سیاہ رات ہو گئی تھی۔

''آپ نے بشارت سے کہا تھا کھڑکیاں اور دروازے چیک کرنے کے لیے۔'' بدرالنساء نے کمبل اچھی طرح اپنے گرد لپیٹتے ہوئے رفیق الزماں کی طرف دیکھا۔

''ہاں کہا تو تھا۔''

وہ جو بے آرام سے آرام کرسی پر بیٹھے تھے اٹھے اور کمرے سے باہر نکلے۔ بشارت ہاتھ میں لالٹین لیے سیڑھیوں سے اتر رہا تھا۔

''بشارت! تم نے کھڑکیاں دروازے سب چیک کر لیے۔''

''جی بڑے صاحب بس ایک لاؤنج کی بڑی کھڑکی کھلی تھی باقی سب تو بند ہی تھے۔''

بشارت ان کے پرانے خاندانی ملازم اشرف کا بارہ تیرہ سالہ بیٹا تھا اور اشرف کی وفات کے بعد انہوں نے اس کی ذمہ داری لے لی تھی۔ والدہ اس کی اشرف کی وفات سے چند دن پہلے ہی فوت ہو گئی تھی۔ وہ اسکول سے آکر گھر کے چھوٹے چھوٹے کام کر دیتا تھا۔ حالانکہ رفیق الزمان نے منع کر رکھا تھا کہ اس سے گھر کا کوئی کام نہ لیا جائے۔ اشرف کی خواہش تھی کہ اس کا بیٹا تھوڑا بہت پڑھ جائے اور انہوں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ جتنا پڑھنا چاہے گا اسے پڑھائیں گے۔

''ہوں ٹھیک ہے، تم اپنے کوارٹر میں چلے جاؤ۔ ممتاز اور ماسی رحمت کو بھی کہہ دو کہ وہ کچن وغیرہ کا کام جلدی ختم کر کے سونے کے لیے چلے جائیں۔ یہ بارش تو آج رکنے والی نہیں۔ اور بچوں کو دودھ وغیرہ دے دیا تھا اور......'' وہ بات نامکمل چھوڑ کر غور سے سننے لگے۔

''بشارت! ایسا لگتا ہے جیسے کوئی گیٹ پر دستک دے رہا ہو۔''

''ہاں شاید کوئی گیٹ پر ہے۔''

بارش کے شور میں وقفے وقفے سے گیٹ پر ہوتی دستک کی آواز کو بشارت بھی سن رہا تھا لیکن سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کوئی دستک دے رہا ہے یا گیٹ کی کھڑکی (چھوٹا گیٹ) کھلی رہ گئی ہے۔

تب ہی دستک مسلسل اور زور سے ہونے لگی تھی۔ بارش کا زور بھی ذرا کم ہوا تھا اور آواز صاف آ رہی تھی۔

''میں دیکھتا ہوں صاحب۔''

''آخر اس برستی بارش میں کون آ گیا ہے؟'' وہ بڑبڑائے شاید کوئی مصیبت زدہ ہو۔ اللہ خیر کرے۔''

انہوں نے کھونٹی پر لٹکی چھتری اتاری اور بشارت کے پیچھے ہی وسیع صحن عبور کر کے گیٹ تک آئے تھے۔ بشارت چھوٹا گیٹ کھول چکا تھا۔ اور باہر کھڑے شخص سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ اچانک ہی بجلی چمکی تو اس کی روشنی میں انہوں نے دیکھا وہ کوئی خاتون تھی۔ بڑی سی سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ چادر جو بری طرح بھیگ چکی تھی چادر کے اندر اس نے کسی بچے کو بھی اٹھا رکھا تھا۔

''اوہ...... خاتون آپ اس طوفانی بارش میں ......!'' وہ حیران ہوئے تھے۔ ''اندر آجائیے۔ بشارت! انہیں اندر لے کر آؤ۔''

بشارت سے کہتے ہوئے وہ واپس مڑے۔ بارش ایک بار پھر پہلے کی سی تیز ہو گئی تھی۔ خاتون بچے کو اپنے ساتھ لپٹائے بشارت کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی برآمدے تک آئی تھی۔ لیکن برآمدے میں قدم رکھتے ہی یکدم لہرا کر گر گئی۔

''اوہ! میرے خدا۔'' ان کے لبوں سے نکلا تھا۔

خاتون نے گرتے ہوئے بچے کو بچانے کی کوشش کی تھی اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہو گئی تھی۔ بشارت نے فوراً ہی بچے کو اٹھا لیا تھا۔ انہوں نے دیکھا وہ بہت پیاری بچی تھی۔ اور رو رہی تھی اس کی آواز زیادہ بلند نہ تھی۔ وہ ہولے ہولے سسک رہی تھی اور سردی سے کانپ رہی تھی۔ عورت برآمدے کے فرش پر بے حس و حرکت پڑی تھی شاید بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کے ہونٹ نیلے ہو رہے تھے۔

''بشارت! ماسی رحمت اور رانو کو بلاؤ فوراً۔ ممتاز کو بھی بھیجو۔'' اور رانو سے کہو اپنا کوئی جوڑا اور گرم شال بھی لے کر آئے ساتھ۔''

''جی۔'' بشارت نے بچی کو قریب پڑی پلاسٹک کی کرسی پر بٹھایا اور خود تقریباً بھاگتا ہوا چلا گیا۔

کچھ ہی دیر بعد ممتاز اور رحمت ماسی آگے پیچھے برآمدے میں آگئے تھے۔

''ممتاز! گیسٹ روم کھول کر آتش دان میں آگ جلاؤ اور ماسی رحمت آپ رانو کی مدد سے ان خاتون کو پہلے اندر گیسٹ روم میں پہنچائیں اور فوراً ان کے کپڑے تبدیل کریں۔ اور بشارت تم خان چاچا سے کہو فوراً انڈے بوائل کر کے اور دودھ گرم کر کے لے آئے۔'' انہوں نے خانساماں کا نام لیا۔

''اور ہاں۔'' انہوں نے اسے روکا۔ ''اوپر جا کر نورے بابا کی وارڈ روب سے اس کا کوئی گرم سوٹ سویٹر ٹوپی وغیرہ بھی لے آؤ۔''

وہ اب کرسی پر بیٹھی بچی کو دیکھ رہے تھے۔ جو بے حد سہمی ہوئی سی بیٹھی ہولے ہولے سسک رہی تھی۔ گو اس نے ٹوپی اور سویٹر وغیرہ پہنا ہوا تھا لیکن سب بھیگ چکے تھے اور وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ غیر ارادی طور پر انہوں نے اس کے قریب جا کر اس کا سر تھپتھپایا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائے۔ کچھ ہی دیر بعد رحمت ماسی نے آ کر بتایا کہ خاتون کے کپڑے تبدیل کروا کے اوپر رضائی ڈال دی گئی ہے لیکن اسے صحیح سانس نہیں آ رہا۔ اس اثنا میں رانو بچی کو بھی اٹھا کر لے گئی تھی۔

''پتا نہیں کون ہے۔ کہاں سے آئی ہے۔ اور یہاں اس طوفانی بارش میں کیسے پہنچی ہے۔'' وہ کچھ دیر تشویش سے برآمدے میں ہی کھڑے سوچتے رہے۔

رحمت ماسی نے بتایا تھا کہ وہ یہاں کی نہیں ہے۔ وہ یہاں کی کم و بیش سب ہی خواتین کو جانتی تھی۔ بچی شکل و صورت اور لباس سے کسی اچھے خاندان کی لگ رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں جانے کے لیے مڑے تا کہ بدر النساء کو اس صورت حال کے متعلق بتا سکیں کہ وہ خود ہی باہر آگئیں۔

''خیریت ہے شاہ جی! آپ نے اتنی دیر لگا دی۔ میں پریشان ہو گئی تھی۔''

تب انہوں نے ساری بات بتائی اور بدر النساء کے ساتھ گیسٹ روم میں آئے تو بدر النساء نے

تشویش سے بے ہوش عورت کو دیکھا جو بمشکل سانس لیتی تھی تھوڑی دیر بعد پورا وجود کانپ اٹھتا تھا۔

"رانو! دیکھو دودھ گرم ہو گیا ہے تو بچی کے لیے فوراً لے کر آؤ۔"

رفیق الزماں نے رانو کی طرف دیکھا تو اس نے بچی کو خاتون کے پاس ہی لٹا دیا۔ وہ فوراً ماں سے لپٹ گئی اور آہستہ آہستہ بلانے لگی۔ "ماما...... ماما۔" جب جواب نہ ملا تو اس کے رخسار کو چوما۔ اس کے چہرے پر اپنے ننھے ننھے ہاتھ رکھے۔ اس کی بے چینی نے بدر النساء کے دل کو گداز کیا تو انہوں نے بے اختیار آگے بڑھ کر بچی کے رخساروں پر بوسہ دیا۔

"شہد گرم پانی میں ڈال کر لے آئیں ماسی رحمت۔ بچی اور اس کی ماں کو دیں۔ دونوں کو ٹھنڈ لگ چکی ہے۔ بچی کو دودھ پلا کر اس کے سینے پر وکس کی مالش کر کے اچھی طرح کمبل میں لپیٹ کر سلا دیں۔" رفیق الزماں نے ماسی رحمت سے کہا۔ "اور آپ اپنا بستر یہاں ہی بچھا لیں اور ان کا دھیان رکھیں۔ کمرا گرم رکھیں۔"

بارش پھر تیز ہو گئی تھی۔ بجلیاں پہلے کی طرح کڑکنے لگی تھیں۔

"اس وقت تو ڈاکٹر فیاض کا آنا بھی ممکن نہیں ہے۔" بدر النساء نے کسی کو مخاطب کیے بغیر کہا۔

"ہاں انہیں تو صبح ہی بلایا جا سکے گا بس رات خیریت سے گزر جائے۔"

رفیق الزماں اپنے بیڈ روم میں چلے گئے لیکن بدر النساء وہاں ہی رک گئی تھیں۔ رفیق الزماں کمرے میں آ کر کچھ دیر تو سوچتے رہے کہ کون ہے۔ کہاں سے آئی ہے اور کہاں جا رہی تھی۔

پھر سو گئے تھے۔ انہیں خبر نہیں ہوئی تھی کہ کب بدر النساء کمرے میں آئیں۔

فجر کی اذان کے وقت ان کی آنکھ کھلی تو انہوں نے دیکھا بدر النساء وضو کرنے جا رہی تھیں۔

"آپ رات کب آئیں میں تو سو گیا تھا۔ خاتون کی حالت کیسی ہے۔"

"حالت ٹھیک نہیں ہے اس کی۔ جو حیلہ کر سکتے تھے کیا، اب ڈاکٹر فیاض کو بلوانا پڑے گا۔ بچی البتہ کچھ بہتر ہے۔ دودھ پی کر سو گئی تھی۔ کچھ سکون میں تھی۔ البتہ ٹھنڈ تو اسے بھی لگ چکی ہے۔"

"ٹھیک ہے روشنی ہوتی ہے تو بشارت یا ممتاز کو بھیجتا ہوں ڈاکٹر صاحب کی طرف۔" انہوں نے کھڑکی کا پردہ ہٹایا۔ بارش رک چکی تھی۔

"شکر ہے اس وقت بارش نہیں ہو رہی۔" دل ہی دل میں شکر ادا کرتے ہوئے وہ آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔

ذہن ایک بار پھر رات برستی بارش میں آنے والی خاتون کی طرف چلا گیا ضرور کسی پریشانی میں ہی گھر سے نکلی ہو گی اور اب نہ جانے گھر والے کس قدر پریشان ہو رہے ہوں گے۔ ماسی رحمت آتی ہیں تو ان سے پوچھتا ہوں کہ رات کسی لمحے ہوش آیا ہو تو شاید اس نے کچھ اپنے متعلق بتایا ہو تو۔ اس کے گھر اطلاع بھجوا دیں۔

لیکن وہ رات بھر تقریباً بے ہوش ہی رہی تھی۔ ماسی رحمت ان کے اور بدر النساء کے لیے چائے لے کر آئیں تو بتایا۔ فجر کی نماز کے بعد وہ اور بدر النساء ایک کپ چائے ضرور پیتے تھے۔

"خاتون کی حالت ٹھیک نہیں ہے بڑے صاحب۔ بخار بہت تیز ہے۔ سانس بھی بمشکل آ رہا تھا۔ البتہ بچی کو ہلکا بخار ہے۔"

"ٹھیک ہے، آپ ادھر ہی رہیں اور بشارت جاگ جائے تو اسے ڈاکٹر چیمہ کی طرف بھیج دیں۔" بدر النساء نے ماسی رحمت سے کہا اور خود بھی چائے پی کر تسبیح اٹھائے باہر چلی گئیں۔

رفیق الزماں کچھ دیر تو معمول کی تسبیحات پڑھتے رہے۔ پھر باہر نکلے۔ سورج سامنے پہاڑوں کے پیچھے سے بلند ہو رہا تھا۔ پھول درخت، پتے، سب بارش میں نہا کر نکھر گئے تھے۔ کچھ دیر تو وہ یوں ہی برآمدے میں کھڑے سامنے سورج نکلنے کا منظر

دیکھتے رہے پھر مضطرب سے ہو کر کمرے میں چلے گئے اور اس وقت تک مضطرب اور بے چین ہی رہے جب تک ڈاکٹر فیاض چیمہ آنہیں گئے۔ لیکن ان کے آنے کے بعد بھی اضطراب اور بے چینی کم نہیں ہوئی تھی بلکہ بڑھ گئی تھی کہ ڈاکٹر چیمہ نے بتایا۔

"خاتون کو نمونیہ کا شدید اٹیک ہوا ہے بارش میں بھیگنے سے پہلے بھی شاید وہ بیمار تھیں۔ انہیں شہر ہاسپٹل میں لے جانا پڑے گا...... بچی کو البتہ گھر میں ہی دوائیں وغیرہ دے دی جائیں۔ میں نے نسخہ لکھ دیا ہے۔ آپ وہ منگوالیں۔"

"آپ ماسی رحمت، خاتون کے ساتھ ہی جائیں گی۔ انور سے کہیں گاڑی نکالے۔" انہوں نے اپنے ڈرائیور کا نام لیا۔ "اور ہاں بڑی گاڑی جائے گی ہاسپٹل۔ ڈاکٹر چیمہ آپ بھی پلیز، ساتھ جائیں۔ آپ کی وجہ سے اچھی دیکھ بھال ہو جائے گی۔"

ڈاکٹر فیاض چیمہ شہر کے سول اسپتال میں ہی کام کرتے تھے۔ امین آباد کے نزدیک یہ چھوٹا سا قصباتی شہر تھا۔ ڈاکٹر فیاض چیمہ کو جوان کے فیملی ڈاکٹر تھے، انہوں نے خاتون اور بچی کے رات یہاں طوفانی بارش میں پہنچنے کی تفصیل بتادی تھی۔

نو دس سالہ شکیل الزماں نے ٹیرس پر سے ڈاکٹر فیاض چیمہ کی گاڑی اپنے گھر کے پورچ میں کھڑے اور اپنی گاڑی کو باہر جاتے دیکھا تو فوراً اپنے بابا جان کے دروازے پر دستک دی اور اجازت ملنے پر اندر جا کر بتایا کہ نیچے ڈاکٹر انکل کی گاڑی کھڑی ہے۔ شاید دادا جان یا دادی جان میں سے کسی کی طبیعت خراب ہے۔ ڈاکٹر انکل کی گاڑی تو کھڑی ہے لیکن ہماری گاڑی باہر نکلی ہے۔

اپنے گرم کمروں میں کمبلوں میں گھسے فرسٹ فلور کے باسیوں کو خبر نہیں ہو سکی تھی کہ رات نیچے کیا ہوا تھا۔ صاحبزادہ شفیق الزماں جو کھڑکی سے پردہ ہٹا رہے تھے۔ فوراً کمرے سے باہر نکلے تھے اور فاخرہ شاہین جو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھے ہوئے بالوں میں برش کر رہی تھیں۔ وہ بھی کھڑی ہو گئی تھیں اور انہوں نے پاجامے اور شرٹ میں ملبوس صاحبزادہ شکیل الزماں پر ایک نظر ڈالی۔

"یہ آپ نائٹ سوٹ میں ملبوس نیچے کیا کرنے گئے تھے۔ کتنی بار آپ سے کہا ہے کہ جب آپ کمرے سے نکلیں تو چینج کر کے نکلا کریں۔" فاخرہ ایسی باتوں کا بہت خیال رکھتی تھیں۔

سوری اماں جان! میں تو بس ٹیرس سے دیکھ رہا تھا۔ رات بارش ہوئی تھی نا تو دیکھنے کے لیے نکلا تھا کہ ابھی ہو رہی ہے یا بند ہو گئی۔ یہ وضاحت کر کے وہ باہر جانے لگے تو فاخرہ نے ٹوکا۔

"چینج کر کے نیچے ناشتے کے لیے آجائیں اور سلیم سے بھی کہیں کہ وہ تیار ہو کر آجائیں۔"

گو آج چھٹی تھی لیکن شاہ منزل میں چھٹی والے دن بھی دیر تک سونے کا رواج نہیں تھا۔ ناشتا فجر کی نماز کے گھنٹہ بھر بعد لگ جاتا۔

فاخرہ نے نیچے جانے سے پہلے اپنے چھوٹے بیٹے نور الزماں کے کمرے میں جھانک کر اس کی آیا ظہوراں کو اس کے متعلق ہدایات دی تھیں۔

اللہ نے انہیں تین بیٹوں سے نوازا تھا۔ سب سے بڑے شکیل الزماں تھے، پھر سلیم الزماں تھے ان سے دو سال چھوٹے۔ اور سلیم سے چھوٹی ایک بیٹی تھی نور فاطمہ جو ڈیڑھ سال کی عمر میں وفات پا گئی تھی۔ نور الزماں سلیم سے تقریباً چھ سال چھوٹے تھے۔ تین ساڑھے تین سال کے تھے۔ سلیم اور شکیل کا مشترکہ روم تھا جبکہ نور الزماں اپنی آیا ظہوراں کے ساتھ الگ کمرے میں ہوتے تھے۔ نور فاطمہ کے بعد جب اللہ نے انہیں پھر بیٹے سے نوازا تو انہوں نے ان کا نام نور الزماں رکھا تھا اور انہیں اپنے دونوں بیٹوں سے زیادہ پیارا تھا۔ اور وہ اسے نور فاطمہ کی طرح ہی نورے کہہ کر بلاتی تھیں۔

ظہوراں کو ہدایات دے کر وہ بہت آرام وسکون سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئیں۔ اور صاحبزادہ شکیل انہیں جاتے دیکھ کر کتنی ہی دیر سوچتے

رہے تھے کہ کیا اماں جان کو دادا جان اور دادی جان سے ذرا بھی محبت نہیں ہے جو وہ پریشان ہو کر بابا جان کی طرح نیچے چلی جاتیں حالانکہ دادی جان ان کی سگی پھپھو بھی ہیں۔

شکیل الزماں بڑے پوتے تھے اس لیے دادا دادی سے بہت محبت کرتے تھے۔ اور ظاہر ہے پہلا پوتا ہونے کی وجہ سے انہیں بھی دادا دادی سے بہت محبت اور پیار ملا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ سلیم اور نور سے انہیں محبت نہ تھی۔ بس پہلا پوتا ہونے کی وجہ سے ان کے زیادہ قریب تھے۔ کچھ وہ حساس بھی بہت تھے، اس لیے اماں جان کے رویے کو محسوس بھی بہت کرتے تھے۔ حالانکہ فاخرہ شاہین کا رویہ نارمل ہی ہوتا تھا۔ ان کا مزاج ایسا ہی تھا۔ سارے رشتوں کو وہ ذرا فاصلے پر رکھنے کی قائل تھیں۔ رشتوں کے حوالے سے وہ بھی جذباتی نہیں ہوتی تھیں۔ سو ڈاکٹر چیمہ کی آمد کا سن کر وہ شفیق الزماں کی طرح بے چین نہیں ہوئی تھیں۔ ساٹھ سال سے تو اوپر ہی ہوں گے پھوپھا جان اور پھپھو ان سے چند ہی برس چھوٹی ہوں گی تو اس عمر میں کوئی نہ کوئی بیماری تو لگ ہی جاتی ہے۔ ہو گئی ہو گی طبیعت اوپر نیچے۔

لاپروائی سے سیڑھیاں اترتے وہ لاؤنج میں آئیں تو سامنے ہی صوفے پر بیٹھیں بدر النساء کی گود میں چھوٹی بچی کو دیکھ کر وہ حیران ہوئیں اور سلام کرنا بھی بھول کر بے اختیار پوچھ بیٹھیں۔

''یہ بچی کون ہے پھپھو جان؟''

''رات آنے والی بیمار خاتون کی بچی ہے۔''

شفیق الزماں نے بدر النسا کے بجائے انہیں تفصیل بتاتے ہوئے کہا تو شفیق الزماں والے صوفے پر ہی بیٹھتے ہوئے انہوں نے غور سے بچی کی طرف دیکھا۔

سرخ و سپید رنگت والی بچی بے حد خوب صورت تھی۔ آنکھیں اور آنکھوں سے نیچے جگہ سرخ ہو رہی تھی۔ یقیناً وہ روتی رہی ہو گی۔ اپنا چھوٹا سا ہاتھ بار بار بدر النسا کے رخسار پر رکھ کر وہ انہیں اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی جو فاخرہ کے آنے کے بعد ان کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

''بچے نہیں جاگے کیا۔''

''آ رہے ہیں تیار ہو کر۔''

وہ پھر بچی کو دیکھنے لگی تھیں۔ وہ بلا کی حسین بچی تھی۔ اس کی بے حد خوش نما آنکھوں کا رنگ نہ براؤن تھا نہ وہ سیاہ تھیں۔ عجیب سا سنہرا پن جھلکتا تھا ان آنکھوں سے جو ان کی دلکشی میں اضافہ کرتا تھا۔ اس کا جائزہ لیتے لیتے فاخرہ کی آنکھیں اس کے ریڈ ہائی نیک سوئیٹر پر ٹک گئیں۔ جو اسے کھلا تھا کچھ۔

''نور کے کپڑے پہنائے ہیں اس بچی کو رات بارش میں اس کے کپڑے بھیگ گئے تھے۔'' بدر النسا سمجھ گئی تھیں کہ ان کی نظریں کیوں بچی پر ٹکی ہیں۔

فاخرہ نے صرف سر ہلایا تھا لیکن دل ہی دل میں بے حد ناگواری محسوس کی تھی۔ بھلا ان کے نور کے کپڑے اسے پہنانے کی کیا ضرورت تھی۔ ماسی رحمت کی پوتی بھی تو اتنی ہی عمر کی ہو گی اس کے کپڑے منگوا لیتیں۔

تب ہی رانو نے لاؤنج میں آ کر بتایا۔ ''ٹیبل سیٹ کر دیا ہے۔''

''ٹھیک ہے، بچے آ جائیں تو ناشتا لگا دینا۔''

بدر النسا نے بچی کا ننھا سا ہاتھ جو ایک بار پھر ان کے رخسار پر آ ٹکا تھا ہاتھ میں لے کر چوما۔

''سنو رانو۔'' فاخرہ نے رانو کو جاتے جاتے روکا۔ ''پروین کچن میں ہے تو اسے بھیجو کچھ دیر اس بچی کو سنبھال لے تاکہ پھپھو جان سکون سے ناشتا کر سکیں۔''

''جی بھیج دیتی ہوں۔''

پروین اس کی بیٹی تھی تیرہ چودہ سال کی تھی اگر ضرورت پڑتی تو رانو کی مدد کروا دیا کرتی تھی۔ ورنہ اس پر کام کی کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ یہ سب جدی پشتی ملازم اور ان کی اولادیں تھیں۔ شاہ منزل کی پچھلی طرف ایک بڑے احاطے میں سب کے کوارٹر

تھے۔ شاہ منزل کے اندر یہ پچھلے دروازے سے آتے جاتے تھے۔

پروین فوراً ہی آ گئی تھی اور اس نے بچی کو گود میں لینا چاہا تو وہ بدر النساء سے لپٹ گئی۔

"نہیں، میں ماما پاس داؤں (جاؤں) گی۔" وہ بدر النساء سے لپٹی مچل مچل کر رونے لگی۔

میلے (میرے) بابا کو باؤ (بلاؤ)۔ ماما پاس دانا (جانا) ہے۔"

بدر النساء نے پریشان سا ہو کر اس کے گرد اپنے بازو کی گرفت مضبوط کی۔ بہت مشکل سے بہلایا تھا انہوں نے اسے ورنہ جب سے اٹھی تھی ماں کو نہ پا کر رو رہی تھی، اس کے پاس جانے کی ضد کر رہی تھی۔ وہ دیکھنے میں تین ساڑھے تین سال کی لگتی تھی اتنی چھوٹی بھی نہ تھی کہ ماں کی غیر موجودگی کو محسوس نہ کرتی اور نہ ہی اتنی بڑی تھی کہ اسے سمجھایا جا سکتا۔

"ابھی چلتے ہیں آپ کی ماما کے پاس لیکن پہلے رونا بند کریں پھر۔" بدر النساء کبھی اس کے رخساروں پر بوسہ دیتیں کبھی سر پر پیار کرتیں۔

"اُفوہ! پھپھو جان، آپ کیا ایک پرائی بچی کے لیے ہلکان ہو رہی ہیں۔ رانو یا ماسی رحمت کے حوالے کریں جب تک اس کی ماں اسپتال سے آنہیں جاتی سنبھالے رکھیں اسے۔ سارا دن کام ہی کیا ہوتا ہے انہیں۔" وہ اپنی ناگواری چھپا نہیں سکی تھیں۔

"اور یہ تم کیا منہ اٹھائے کھڑی ہو۔ بچی کو اٹھاؤ۔" وہ اب پروین کو دیکھ رہی تھیں۔

شفیق الزماں نے ایک ناراض سی نظر فاخرہ شاہین پر ڈالی۔ انہیں فاخرہ شاہین کا ملازموں کے ساتھ تحقیر آمیز رویہ اور مزاج کی سختی پسند نہ تھی۔

پروین اسے اٹھانے کے لیے اس کی طرف بڑھی تو بچی اور زیادہ ان سے چمٹ گئی۔ اب وہ سسکیاں لے رہی تھی اس کے پیارے پیارے ہونٹوں سے گھٹی گھٹی آواز نکل رہی تھی۔ "ماما، بابا" اور اپنے کمرے سے نکل کر ڈائننگ کی طرف جاتے جاتے رفیق الزماں نے فاخرہ کی پوری بات سنی تھی اور ایک ناگوار سی نظر ان پر ڈال کر بدر النساء کے پاس رکے اور بچی کا رخسار تھپتھپایا۔

بچی نے اپنی بھیگی پلکیں اٹھائیں اور آس بھری نظروں سے انہیں دیکھا۔

"ماما پاش (پاس) جانا ہے۔"

اپنی طرف دیکھتیں ان بھیگی پلکوں والی آس بھری آنکھوں میں ایسا کیا تھا کہ انہوں نے بے اختیار جھک کر اسے اٹھا لیا۔

"ابھی چلتے ہیں ماما پاس۔"

"اور بابا پاش بھی۔"

سنہری آنکھوں میں ذرا سی دیر کو جگمگاہٹ سی اتری تھی۔

"ہاں، بابا پاس بھی چلیں گے۔" انہوں نے بے اختیار بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اس کے بھیگے رخسار پونچھے۔

"لیکن پہلے ہم ناشتا کرلیں بھوک لگی ہے ہمیں۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا کر گویا انہیں ناشتا کرنے کی اجازت دی تھی۔ بدر النساء نے کھڑے ہوتے ہوئے رفیق الزماں کی طرف دیکھا۔

"یہ پروین کھڑی ہے بچی اسے دے دیں اور آپ ناشتے کے لیے چلیں۔"

"نہیں۔" انہوں نے ذرا سا بایاں ہاتھ اوپر اٹھایا تھا۔ "ہماری بیٹی ہمارے ساتھ ناشتا کرے گی۔ کیوں آپ ہمارے ساتھ ناشتا کریں گی نا۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

"اور اب تم یہ کیا ہمارے سر پر کھڑی ہو......! ناشتا لگانے میں اپنی ماں کی مدد کرو۔" فاخرہ نے دبی زبان میں پروین سے کہا تا کہ رفیق الزماں اس کی بات نہ سن سکیں۔

ٹیبل اس نے سیٹ کر دیا تھا ناشتا بھی تقریباً تیار ہی تھا لیکن شاہ منزل کے ملازمین کو سوال و جواب کی عادت نہ تھی۔ وہ سر جھکا کر لاؤنج سے نکل گئی۔ تب ہی شکیل اور سلیم اندر داخل ہوئے اور سب

کو مشترکہ سلام کیا۔ سلام کا جواب دے کر بدر النساء نے دونوں کے ماتھے کو باری باری چوما۔
"جیتے رہیں۔"
"دادا جان کہاں ہیں؟" شکیل الزماں کو لگا کہ شاید وہ ہی ہاسپٹل گئے ہیں۔
"ڈائننگ روم میں ہیں۔" بدر النساء نے ڈائننگ روم کی طرف اشارہ کیا۔
ان کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا، بی پی تو ہائی نہیں ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر انکل کیوں آئے تھے۔" شکیل الزماں نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے تھے۔
بدر النساء نے بہت محبت سے شکیل الزماں کی طرف دیکھا۔ ان کا یہ پوتا دس سال کی عمر میں ہی بہت لونگ اور کیئرنگ تھا۔
"اللہ شکر ہے بیٹا، آپ کے دادا جان بالکل ٹھیک ہیں اور ڈاکٹر چیمہ کسی اور کو دیکھنے آئے تھے۔"
"کسے؟"
ان کی سوالیہ نظریں بدر النسا کی طرف اٹھیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ بتاتیں فاخرہ بول پڑیں۔
"ناشتے پر آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ چل کر ناشتا کریں۔"
وہ دونوں ایک ساتھ ہی ڈائننگ روم کی طرف بڑھ گئے تھے اور ان کے پیچھے ہی فاخرہ شاہین اور بدر النسا بھی ڈائننگ روم میں داخل ہوئیں۔ شکیل الزماں رفیق الزماں کے بائیں طرف کھڑے تھوڑا سا جھکے ان کے دائیں طرف والی کرسی پر بیٹھی بچی کو دیکھ رہے تھے۔
"یہ بے بی کون ہے دادا جان۔ اور کہاں سے آئی ہے؟"
"یہ مہمان ہے بیٹا۔" رفیق الزماں نے نرمی سے جواب دیا۔
"یہ رات کو آسمان سے بارش کے ساتھ گری ہے۔" سلیم کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ "کیا یہ کوئی پری ہے دادا جان، اونو......" اس نے چٹکی بجائی۔
"لگتا ہے اللہ میاں نے ہماری "نورے" کو واپس بھیج دیا ہے۔ ان کو پتا چل گیا ہوگا کہ ہم سب اسے بہت یاد کرتے ہیں۔"
اس کی آنکھیں اب بھی شرارت سے چمک رہی تھیں گو اسے نور فاطمہ کی شکل ٹھیک سے یاد نہیں تھی کہ جب وہ چند دن بیمار رہ کر چل بسی تھی تو اس کی عمر تقریباً چار سال تھی۔ تاہم وہ یہ جانتا تھا کہ جو لوگ اللہ میاں کے پاس چلے جاتے ہیں وہ واپس نہیں آتے۔ لیکن اپنے سے دو سال بڑے بھائی کو چھیڑنے اور ستانے میں اسے لطف آتا تھا۔
"یہ سوال و جواب بعد میں بھی ہو سکتے ہیں۔ پہلے سکون سے ناشتا کریں۔" فاخرہ کو اپنے بچوں کا دادا اور دادی سے التفات ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔
دونوں خاموشی سے فاخرہ کے دائیں بائیں بیٹھ گئے تھے۔ فاخرہ نے ان کے سامنے رکھے گلاسوں میں مالٹوں کا فریش جوس ڈالا۔ سردیوں میں ناشتے سے پہلے فریش جوس ضرور پیا جاتا تھا۔
"یہ بے بی جوس نہیں پیتی کیا؟" سلیم کی زبان کو پھر کھجلی ہوئی تھی۔
"میں دوس (جوس) پیتی ہوں۔ میلے (میرے) بابا لے کے آتے ہیں میلے لیے۔" بچی کے بے اختیار بولنے پر شفیق الزماں اور رفیق الزماں کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔
"نہیں، آج آپ کو بخار ہے نا، ٹھنڈ لگ گئی تھی نا۔ جوس پینے سے طبیعت خراب ہو جائے گی۔ جب آپ ٹھیک ہو جائیں گی پھر آپ کا جتنا جی چاہے گا جوس پینا۔" بدر النساء نے فوراً کہا تھا۔ بچی نے سر ہلایا تھا۔ اس نے جوس پینے کی ضد نہیں کی تھی۔
"کیا یہ تھوڑا سا بھی جوس نہیں پی سکتی دادی جان۔" شکیل کو اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ وہ سب جوس پی رہے ہوں اور وہ نہ پی سکے۔
فاخرہ نے گھور کر انہیں دیکھا تو شکیل نے فوراً ہی سر جھکا کر گلاس منہ سے لگا لیا تھا۔

پروین نے آ کر خالی گلاس اٹھائے اور رانو نے پھرتی سے ناشتا لگا دیا۔ بھنا ہوا قیمہ، آملیٹ، فرائی انڈے، آلو کی بھجیا، اور ساتھ ہی گرم گرم پراٹھے لا کر سب کی پلیٹوں میں رکھے۔ رفیق الزماں نے اپنی پلیٹ میں تھوڑا سا آملیٹ اور آلو کی بھجیا ڈالی تھی اور خود کھاتے ہوئے چھوٹے چھوٹے لقمے بنا کر اس کے منہ میں بھی ڈالتے جاتے تھے۔ اور ان کے بالکل سامنے والی کرسی پر بیٹھی بدرالنساء نے اچار کا مرتبان لینے کے لیے سر اٹھایا تو ایک بہت پرانا منظر ان کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ جب اس کرسی پر امین الزماں بیٹھے ہوتے تھے اور بائیں طرف نجلہ مریم اور وہ باری باری دونوں کے منہ میں لقمے ڈالتے جاتے تھے۔ دونوں بڑے بچوں شفیق الزماں اور نجوبی کے انہوں نے اتنے لاڈ نہیں اٹھائے تھے جتنے امین اور نجلہ کے اٹھاتے تھے۔ شاید اس لیے کہ ان کی شادی دوران تعلیم ہی ہو گئی تھی اور ابھی یونی ورسٹی میں ہی تھے کہ دو بچوں کے باپ بن گئے تھے۔ چھٹیوں میں ہی گھر آنا ہوتا تھا تو بچوں کے ساتھ زیادہ وقت نہ گزار پاتے تھے سو نجوبی اور شفیق دادا دادی کے زیادہ لاڈلے تھے اور امین اور نجلہ ان کے لاڈلے تھے۔ نجلہ میں تو جیسے ان کی جان تھی۔ نجلہ اب منوں مٹی تلے سو رہی تھی اور امین...... دل سے اٹھنے والی آہ کو انہوں نے اندر ہی دبا لیا تھا۔ لیکن اچار کی طرف بڑھتا ہاتھ انہوں نے پیچھے کر لیا تھا۔ بھوک یکدم مر گئی تھی۔ انہوں نے رانو کو آواز دی۔

"اگر چائے دم ہو گئی ہو تو میرے لیے بنا لاؤ۔"

رفیق الزماں اور شفیق الزماں نے یکدم ہاتھ روک کر ان کی طرف دیکھا تھا۔

"کیا بات ہے بدرالنساء، آپ ناشتا نہیں کریں گی کیا؟" رفیق الزماں نے پوچھا۔

"جی دل نہیں چاہ رہا۔"

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا اماں جان۔" شفیق الزماں تشویش سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

"ہاں اللہ کا شکر ہے طبیعت ٹھیک ہے شاید رات کی بے آرامی کی وجہ سے بھاری ہو رہا ہے۔ آپ لوگ ناشتا کریں۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ چائے پی کر آرام کریں بلکہ بہتر ہے تھوڑی سی نیند لے لیں۔ اکثر نیند کی کمی کی وجہ سے بھی سر میں درد ہو جاتا ہے۔"

بچی جو بہت دھیان سے ان کی باتیں سن رہی تھی، کرسی سے نیچے اترنے کی کوشش کرنے لگی تو رفیق الزماں نے اسے کرسی سے اتار دیا۔ اب وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی بدرالنساء کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"آپ کے چھل (سر) میں دلد (درد) ہے تو میں آپ کا سر باؤں (دباؤں!)"

"ارے نہیں میری جان۔" بدرالنساء نے بے اختیار اسے اٹھا کر اپنی گود میں بٹھا لیا تھا۔ ابھی چائے پیوں گی تو درد ٹھیک ہو جائے گا۔"

اچھا...... پھل (پھر) میں بھی چائے پیوں گی۔" شاید اسے بھی کہیں درد ہو رہا تھا۔ انہوں نے اس کا ماتھا چھوا جو گرم تھا۔

"اسے ابھی بھی بخار ہے شاہ جی۔"

"ہوں ڈاکٹر چیمہ کہہ رہے تھے کہ اللہ نے بچت کی ہے۔ ایک دو روز میں بخار اتر جائے گا۔"

رانو نے چائے لا کر رکھی تو انہوں نے اسے یوں ہی گود میں بٹھائے چائے کا سپ لیا۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے پھپھو جان، اسے گود سے اتار دیں۔" فاخرہ کو پرائی بچی پر ان کا اتنا توجہ دینا ذرا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"نہیں خیر، اب ایسی بھی خراب نہیں ہے طبیعت۔"

انہیں گود میں بیٹھی بچی سے انجانی سی اپنائیت محسوس ہو رہی تھی۔ جب وہ اپنا ننھا سا ہاتھ ان کے رخسار پر رکھ کر انہیں اپنی طرف متوجہ کرتی تو اندر جانے کتنی یادوں کے در کھل جاتے تھے۔

اللہ نے انہیں دو بیٹیوں اور دو بیٹوں سے نوازا تھا۔ سب سے بڑے شفیق پھر نجوئی اور نجوئی سے چھوٹی نجلہ اور پھر سب سے چھوٹے امین تھے۔ نجلہ پیدائشی کچھ کمزور تھی اس لیے وہ ہر لمحہ اسے قریب رکھتی تھیں جبکہ نجوئی اور شفیق کی پیدائش کے وقت وہ خود بھی کم عمر تھیں اس لیے دونوں بچوں کو زیادہ تر ان کی آیا اور دادی سنبھالتی تھیں۔ لیکن نجلہ جب پیدا ہوئی تو سب ہی کہتے تھے کہ یہ نہیں بچے گی۔ اور وہ اس خوف سے کہ کہیں کوئی بے احتیاطی نہ ہو جائے۔ الٹا سیدھا کھا کر بیمار نہ ہو جائے۔ ہر وقت اسے ساتھ ساتھ لیے پھرتی تھیں کہ کہیں اسے کچھ ہو نہ جائے اور جب وہ بظاہر بالکل صحت مند نظر آتی تھی۔ گندمی رنگت، تیکھے نقوش اور سیاہ گھنیری پلکوں والی خوب صورت آنکھوں کی مالک نجلہ نے ایک دن اچانک آنکھیں موند لی تھیں۔ مہینوں انہیں یقین نہیں آیا تھا کہ یوں ان کی تیرہ سالہ نجلہ معمولی سے بخار میں زندگی ہار جائے گی جب وہ اس کو کچھ ہو جانے کے سارے خدشے دل سے نکال چکی تھیں۔ بہت وقت لگا تھا انہیں سنبھلنے میں پھر جب شفیق الزماں بیٹی کے باپ بنے تو نور فاطمہ ان کی آنکھوں کا تارا بن گئی تھی لیکن وہ بہت مختصر عمر لکھوا کر لائی تھی۔

نجوئی شادی کے دو سال بعد ہی اپنے شوہر کے ساتھ جرمنی چلی گئی تھی۔ اور وہاں جانے کے بعد صرف ایک بار ہی پاکستان آئی تھی اس کی ساری سسرال وہاں ہی تھی۔ اس کی ایک بیٹی اور دو بیٹے تھے۔ تصاویر بھیجتی رہتی تھی لیکن تصویروں سے کبھی تشنگی مٹی ہے۔

یہ اجنبی بچی جو اس وقت ان کی گود میں بیٹھی تھی جانے انہیں کیوں بار بار ماضی کی طرف لے جاتی تھی۔ انہیں امین الزماں یاد آرہے تھے انہیں اپنی نجلہ یاد آرہی تھی حالانکہ سرخ وسپید سنہری آنکھوں والی اس بچی کی ذرا بھی تو ان کی نجلہ سے مشابہت نہیں تھی۔ لیکن شاید نہیں کہیں تو کچھ مشابہت تھی۔ اس کا دیکھنے کا انداز، مسکراہٹ، حرکتیں کچھ تو تھا ایسا کہ بار بار ان کی اپنی نجلہ مریم ان کی آنکھوں کے سامنے آجاتی تھی۔

وہ چائے پی کر اپنے کمرے میں جانے کے بجائے نجلہ مریم کو لے کر لیونگ میں ہی آگئی تھیں۔ باقی لوگ بھی معمول کے مطابق ناشتا کر کے ادھر ہی آگئے تھے کہ ناشتے کے بعد کچھ دیر یہاں بیٹھا جاتا تھا۔ رفیق الزماں شفیق سے ضروری امور پر بات چیت کرتے اخبار دیکھتے۔ اور پھر اپنے اپنے کام سے لگ جاتے تھے۔ رانو نے کھڑکیوں کے پردے ہٹا دیے تھے اور شیشوں سے ہلکی دھوپ اندر آرہی تھی۔ رفیق الزماں اور شفیق الزماں ایک ہی صوفے پر بیٹھے کسی کاروباری مسئلے پر بات چیت کر رہے تھے۔ رانو مزید چائے کا پوچھنے آئی تو رفیق الزماں نے نے اسے ممتاز کو بجلی کمپنی کے آفس کمپلین کروانے کے لیے بھیجنے کا کہا اور پھر شفیق الزماں کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

"تو ٹھیک ہے بابا جان! میں پھر راجا صاحب کو آفس بلا کر اس ڈیل کے متعلق ایک بار پھر بات کر لیتا ہوں۔" شفیق الزماں نے چھوڑی ہوئی بات مکمل کی۔ تب ہی ظہوراں نور الزماں کی انگلی پکڑے اندر داخل ہوئیں اور سب کو سلام کر کے فاخرہ کو بتایا کہ نورے بابا کو دودھ پلا دیا تھا۔ لیکن آج بہت ضد کر رہے تھے کہ نہیں پیوں گا۔"

"اگر آپ دودھ نہیں پئیں گے تو آپ بڑے نہیں ہوں گے چھوٹے ہی رہ جائیں گے۔"

سلیم نے جو ایک طرف بیٹھے دلچسپی سے اجنبی بچی کو دیکھ رہے تھے نصیحت کرنا ضروری سمجھا۔ لیکن نور الزماں ان کی طرف توجہ دیے بغیر ظہوراں کی انگلی چھڑا کر بدر النسا کی طرف بھاگے تھے۔

"السلام علیکم! دادی جان۔"

"وعلیکم السلام! دادی کی جان۔" بدر النساء نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا اور پیشانی پر پیار کیا تھا۔

"یہ کون ہے؟" وہ ان کے پاس بیٹھی بچی کو دیکھ رہے تھے۔

"یہ بہنا ہے۔" بدرالنساء مسکرائیں۔
"تو۔" بچی نے نفی میں ادھر ادھر سر ہلایا تھا۔
"میں بہنا نہیں ہوں، میں ندلہ ملیم ہوں۔"
"ندلہ ملیم" (نجلہ مریم)
رفیق الزماں اور شفیق الزماں نے ایک ساتھ اس کی طرف دیکھا۔
"میلا (میرا) نام ندلہ ملیم ہے (نجلہ مریم) بہنا نہیں ہے۔" وہ جیسے ناراض ہوگئی تھی۔
"آپ کا نام نجلہ مریم ہے؟"
"رفیق الزماں کے لبوں سے بے اختیار نکلا اور ان کی نظریں بدرالنساء سے ملی تھیں۔ دونوں کے ذہن میں شاید ایک ہی خیال آیا تھا۔ رفیق الزماں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آئے تھے۔
"آپ کے بابا کا نام؟"
"بابا" وہ مسکرائی تھی اور آنکھوں میں بھی جیسے مسکراہٹ کا کوندا سا لپکا تھا "اور ماما کا نام!" وہ جانے کس امید پر پوچھ رہے تھے۔
"ماما!" اس نے فوراً ہی جواب دیا تھا اور ساتھ ہی ماما پاس چلنے کی فرمائش بھی کردی تھی۔ رفیق الزماں غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔
"آپ کے بابا کا کوئی اور نام بھی تو ہوگا نا جس سے آپ کی ماما انہیں بلاتی ہوں گی۔" بدرالنساء نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر چوما تھا۔ اس نے لمحہ بھر سوچا پلکیں جھپکائیں اور مسکرائی۔
ماما بابا کو کہتی ہیں۔ "چینیں" (سنیں)
رفیق الزماں اور شفیق الزماں کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ شفیق الزماں نے پوچھا۔
"تو ان کا ایک نام "سنیں" بھی ہے۔"
"اور ماما کا ہنی، بابا کہتے ہیں ماما کو ہنی۔" اس نے خود ہی بتادیا تھا۔
تینوں بچے دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ جب نورالزماں کی نظر اس کے کپڑوں پر پڑی اور پھر اس کی چھوٹی چھوٹی دو پونیوں پر اور وہ بے اختیار ہنس دیا۔
"یہ لڑکی ہے دادی جان۔ لیکن اس نے لڑکوں والے کپڑے کیوں پہنے ہوئے ہیں۔ لڑکیاں تو فراک پہنتی ہیں اور اس نے پینٹ شرٹ پہنی ہوئی ہے۔" وہ پھر ہنسا تھا۔ اور وہ شرمندہ سی ہو کر نگاہیں جھکا کر اپنے کپڑوں کی طرف دیکھنے لگی تھی۔
"بری بات ہے نورے، کسی پر ہنستے نہیں ہیں۔" شکیل الزماں نے بردباری سے کہا تو شفیق الزماں نے سر ہلا کر ان کی تائید کی۔
"ظہوراں......" فاخرہ کی پیشانی پر شکنیں تھیں۔ "نورے کو لے جائیں ناشتا کروائیں اور انڈا ہاف بوائل ہو، خان چاچا سے کہنا کل بھی فل کردیا تھا۔ اور اگر نورے کو پسند ہو تو دودھ میں کارن فلیکس ڈال دیں۔
"جی۔"
ظہوراں نورالزماں کا ہاتھ پکڑ کر لے گئی لیکن وہ جاتے ہوئے بھی مڑ مڑ کر دادی کے پاس بیٹھی بچی کو دیکھتا رہا۔ رفیق الزماں ابھی تک وہاں ہی بچی کے سامنے کھڑے تھے۔ ذہن بار بار پیچھے چلا جاتا تھا۔ ابھی کوئی اتنی زیادہ پرانی بات تو نہ تھی جب شکیل الزماں پیدا ہوئے تھے تو امین الزماں نے پہلے اعلان کردیا تھا کہ بس اگر ہماری بھتیجی صاحبہ تشریف لائیں تو ان کا نام نجلہ مریم ہوگا۔ اور سلیم کی پیدائش پر بھی امین نے پہلے سے ہی کہہ دیا تھا کہ نام تو بس نجلہ ہی رکھا جائے گا۔ اگرچہ فاخرہ نے ناگواری کا اظہار کیا تھا لیکن شفیق نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر یقین دہانی کروائی تھی کہ جب بھی ان کے ہاں اللہ کی رحمت ہوئی تو نام وہ ہی رکھیں گے۔ لیکن جب نور فاطمہ پیدا ہوئی تو وہ گھر سے جاچکے تھے۔ البتہ سلیم کی پیدائش کے بعد انہوں نے بدرالنساء سے کہا تھا۔
"اگر میری بیٹی ہوئی تو میں اس کا نام نجلہ مریم رکھوں گا۔" اور یہ بات سب کو ہی پتا تھی۔
رفیق الزماں کی نظریں بار بار بچی کی طرف اٹھتیں اور پھر کوئی مشابہت نہ پا کر لوٹ آتیں۔
"آپ نے بابا پاس جانا ہے تو آپ کے بابا

کہاں ہیں؟"

"میلے بابا سپتل (ہاسپٹل) میں ہیں۔ وہ بیمار (بیمار) ہیں۔ ماما کہتی ہیں وہ جلدی ٹھیک (ٹھیک) ہوجائیں گے تو پھر گھر آجائیں گے۔" اس نے بات کر کے باری باری سب کو دیکھا اور پھر یکدم رونے لگی تھی۔ بدرالنساء نے بے اختیار اسے ساتھ لگا لیا۔

"نہ......روتے نہیں۔"

"مجھے ماما پاش جانا ہے۔ میلی ماما کہاں ہیں۔ ا ن کو باؤ (بلاؤ)۔"

"رونا نہیں گڑیا، ہم ابھی آپ کی ماما کے پاس چل رہے ہیں۔"

رفیق الزماں نے اس کے رخسار تھپتھپائے۔

"پرامس۔" روتے روتے اس نے رفیق الزماں کی طرف دیکھا۔

"ہاں پرامس۔" وہ مسکرائے اور ساتھ ہی رانو کو آواز دی۔

"رانو! اس بچی کے کپڑے خشک ہو گئے ہوں تو استری کر کے اس کا لباس تبدیل کروائیں۔"

"کپڑے تو رات آتش دان کے آگے ڈالے تھے خشک ہو گئے تھے لیکن سوئیٹر اور ٹوپی وغیرہ ابھی گیلے ہیں۔ پینا کو کلے سا لگا رہی ہے۔ ابھی استری کر دے گی۔" اس نے اپنی بیٹی پروین کا نام لیا۔

"ٹھیک ہے، سوئیٹر وغیرہ یہ ہی پہنا دینا۔"

"میں تلوں (چلوں)" وہ صوفے سے اترنے لگی۔

"نہیں، ابھی ہم کام سے جا رہے ہیں۔ بس ابھی تھوڑی دیر میں آجائیں گے۔ اتنی دیر میں آپ تیار ہو جائیں تو پھر آپ کی ماما کے پاس چلیں گے۔" رفیق الزماں کے لہجے میں معمول سے زیادہ نرمی تھی۔

"آپ کے بابا ہاسپٹل میں تھے تو آپ اپنی ماما کے ساتھ کہاں جا رہی تھیں۔" بدرالنسا کو یوں ہی خیال آیا تھا کہ کیا خبر کچھ نہ کچھ بتا دے۔

اس نے بدرالنسا کی طرف دیکھا۔ پلکیں ابھی تک بھیگی ہوئی تھیں۔ رخساروں پر آنسوؤں کے نشان تھے۔

"ہم ادھل (ادھر) آرہے تھے پیچھے (پیسے) لینے، بابا کی دائی (دوائی) کے لیے ماما پاش (پاس) پیچھے (پیسے) نہیں تھے نا اور بابا کی دائی لینی تھی۔"

تین ساڑھے تین سالہ بچی کے بولنے اور دیکھنے کے انداز سے لگا تھا جیسے وہ یہ سب کہتے ہوئے کسی گہرے دکھ کی زد میں ہو۔ اگرچہ خود اسے اس کا احساس نہ تھا لیکن کہیں گہرائی میں اسے احساس تھا کہ اس کی ماما کے پاس بابا کی دوائی کے لیے پیسے نہیں ہیں۔

بدرالنساء کا دل گداز ہوا تھا انہوں نے ایک بار پھر اسے اٹھا کر گود میں بٹھا لیا تھا۔ رفیق الزماں نے ایک گہری سانس۔ آس پاس کے علاقوں سے لوگ مدد کے لیے آتے رہتے تھے اور وہ کسی کو مایوس نہیں لوٹاتے تھے۔ شاید یہ بھی کوئی ایسی ہی خاتون تھیں۔ شوہر کے علاج کے لیے مدد کی ضرورت ہو گی تو۔

انہوں نے شفیق الزماں کی طرف دیکھا۔

"انور تو گاڑی لے کر ہاسپٹل گیا ہوا ہے۔ آپ اپنی گاڑی نکالیں پہلے ذرا دیکھ آئیں کہ رات ہونے والی بارش سے کسی کا کوئی نقصان تو نہیں ہوا۔ کیا خبر کسی کو مدد کی ضرورت ہو۔ پچھلی بارشوں میں نذیر حسین کے باڑے کی چھت گر گئی تھی۔ کافی نقصان ہو گیا تھا اس کا۔ وہاں سے واپس آکر پھر آپ میرے ساتھ ہاسپٹل چلیں۔"

"جی بابا جان۔" شفیق الزماں کھڑے ہو گئے تھے۔

امین آباد کا یہ علاقہ دو سو سے زیادہ گھروں پر مشتمل تھا۔ رفیق الزماں صاحب کے پردادا نواب زادہ امین الزماں شاہ کو یہ زمین انڈیا میں چھوڑ آنے والی اپنی کئی مربع زمین کے عوض کلیم میں ملی تھی۔ لوکاٹ، انجیر اور شہتوت کے درختوں سے گھرا یہ علاقہ سطح مرتفع پوٹھوار میں آتا تھا یہاں موسم سخت تھا گرمیوں میں

شدید گرمی اور سردیوں میں شدید سردی پڑتی تھی۔ رہائش کے لیے انہیں قریبی شہر میں ایک بہت اچھی حویلی مل گئی تھی جو اتنی بڑی تو نہ تھی جتنی بڑی محل نما حویلی وہ چھوڑ کر آئے تھے لیکن ان کے خاندان کے لیے کافی تھی۔ خاندان میں بچا ہی کون تھا۔ ایک بیٹا ایک کم عمر بیٹی اور بیوی کے علاوہ ملازمین تھے۔ باقی کا خانوادہ تو وہاں ہی لاشوں کی صورت اپنی حویلی کے دالانوں اور کمروں میں رہ گیا تھا۔

اپنی زمین سے دوسری زمین کی طرف ہجرت بذات خود ایک بڑا المیہ ہوتی ہے لیکن ایسی خونی ہجرت شاید تاریخ نے اس سے پہلے نہ دیکھی ہو۔ اس ہجرت نے انہیں بے نیاز اور صابر کر دیا تھا۔ وہ پہلے بھی کوئی سخت دل اور متکبر نہ تھے۔ اب شاکر بھی ہو گئے تھے اللہ کی رضا پر راضی اور ہر لمحہ اس کی خوشنودی کے تمنائی تھے۔

دیہات کی کھلی فضا میں پلنے بڑھنے والے سید امین الزماں شاہ کا دل شہر میں نہ لگا تو اس علاقے میں اٹھ آئے۔ بہت سے غریب ہاریوں میں زمین تقسیم کی۔ ان میں کچھ وہ تھے جو ہجرت کے دکھ اٹھا کر آئے تھے۔ خالی ہاتھ، خالی دامن اور کچھ آس پاس کے علاقوں کے غریب ہاری تھے۔ یوں امین آباد کے نام سے یہ علاقہ آباد ہوا۔ اپنی ضرورت کے لیے زرعی زمین رکھ کر باقی کی ساری زمین نہ صرف تقسیم کی تھی بلکہ زمین کا مالک بنا دیا تھا۔

ابتدا میں صرف چالیس پچاس گھرانے تھے۔ جب زمین کی ملکیت ملی تو انہوں نے بھی دل کھول کر اپنی زمینوں پر محنت کی۔ جب رونق ہو گئی تو وہ بھی شہر والی حویلی فروخت کر کے یہاں ہی آ گئے اور شاہ منزل کی بنیاد رکھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ آس پاس کی خالی زمینیں بھی خرید لی گئیں۔ ان کے دادا کے زمانے تک یہاں تقریباً ڈیڑھ سو کے قریب گھرانے آباد ہو چکے تھے۔ کہیں کچے گھر تھے تو کہیں پکی اینٹوں اور سیمنٹ کے بعد میں ان میں مزید اضافہ بھی ہوتا رہا۔ امین آباد کے باسی شاہ منزل والوں کی صرف عزت ہی نہیں کرتے تھے بلکہ محبت بھی کرتے تھے۔ اور شاہ منزل والے بھی ان کے ہر دکھ سکھ، غمی، خوشی کے شریک تھے۔ شفیق الزماں بچپن سے ہی پہلے اپنے دادا کے ساتھ اور پھر اپنے والد کے ساتھ امین آباد کے باسیوں کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے آ رہے تھے۔ سو اب بھی وہ رفیق الزماں شاہ کے ساتھ امین آباد کا چکر لگانے چلے گئے تھے۔ شکر تھا کہ بارش سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔

وہ امین آباد کا چکر لگا کر واپس گھر آئے تو رانو نے بچی کو تیار کر دیا تھا اور وہ بدر النسا کے پاس صوفے پر خاموش بیٹھی امین الزماں کو بلاکس سے کھیلتے دیکھ رہی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی وہ صوفے سے اتر کر ان کی طرف تیزی سے آ گئی تھی اور ان کی انگلی پکڑ لی تھی اور اب آس بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی یاسیت اور اداسی تھی۔ رخسار لال ٹماٹر ہو رہے تھے۔ شاید رونے سے یا پھر بخار تیز ہو گیا تھا۔ ہاتھ بھی کافی گرم لگ رہے تھے۔ کل رات سے ماں سے ایک طرح سے یہ بچی جدا ہی تھی۔ اتنی معصوم بچی اجنبی لوگوں میں اندر سے یقیناً پریشان اور ڈری ہوئی ہو گی۔

"یا اللہ! اس بچی کی والدہ کو صحت و زندگی دینا۔" اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے اپنے ہاتھ کی گرفت میں لیتے ہوئے انہوں نے بے اختیار دعا کی تھی۔

لیکن کچھ دعائیں در قبولیت تک نہیں پہنچ پاتیں۔ انہیں بھی تاخیر ہو گئی تھی وہ تو ان کے دعا کرنے سے پہلے ہی اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئی تھی۔ ابھی وہ بچی کا ہاتھ پکڑے دروازے کی طرف بڑھے ہی تھے کہ باہر گاڑی کے ہارن کی آواز آئی اور ساتھ ہی گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔

"کیا انور خاتون کو لے کر واپس آ گیا ہے۔"

وہ ایک اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے وہاں ہی رک گئے اور مسکرا کر بچی کی طرف دیکھا۔

"مریم بے بی لگتا ہے آپ کی ماما آ گئی ہیں۔"

"وہ بابا کی دائی (دوائی) لینے گئی تھیں۔" بچی ان سے ہاتھ چھڑا کر شاید باہر جانا چاہتی تھی لیکن انہوں نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔ بدرالنساء گھبرا کر کھڑی ہو گئی تھیں۔

"یہ انور کیوں واپس آ گیا ہے شاہ جی، اس بچی کی حالت ایسی تو نہ تھی کہ اتنی جلدی ٹھیک ہو جاتی۔"

"ابھی پتا چل جاتا ہے......" انہوں نے نظروں ہی نظروں میں انہیں تسلی دی۔ "بشارت باہر ہی تھا۔ ہماری گاڑی صاف کر رہا تھا۔" اور تب ہی بشارت سر جھکائے آیا۔

"صاحب جی، انور چاچا کہہ رہے ہیں کہ خاتون کا انتقال ہو گیا ہے۔ فجر کے وقت۔ ڈاکٹر صاحب پیچھے ایمبولینس میں لا رہے ہیں انہیں۔"

اور ان کی نظریں بے اختیار بچی کی طرف اٹھی تھیں۔ بدرالنساء نے یکدم دل پر ہاتھ رکھا تھا اور بچی کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا تھا۔ "یا اللہ اتنی چھوٹی بچی اور ماں سے محروم ہو گئی، آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

"اوہ!" فاخرہ شاہین جو کوئی میگزین پڑھ رہی تھیں یکدم میگزین ٹیبل پر رکھ کر کھڑی ہو گئیں۔ "لیکن پھوپھا جان ڈاکٹر چیمہ اسے یہاں کیوں لا رہے ہیں، شاہ منزل والوں سے اس کا بھلا کیا رشتہ، وہاں ہی ہاسپٹل والوں سے کہہ دیتے دفن کروا دیں۔ کسی ادارے کے ذمے لگا دیں جو لاوارثوں کے کفن دفن کا انتظام کرتے ہیں۔"

رفیق الزماں نے تاسف بھری نظر فاخرہ پر ڈالی۔ اور سر جھکائے کھڑے بشارت سے کہا۔

"یہ خاتون جب بے ہوش ہو کر گری تھیں تو ان کے پاس ایک شولڈر بیگ تھا۔ وہ پوچھو رانو سے کہ کہاں ہے اور لے کر آؤ ادھر۔"

اچانک ہی ان کے ذہن میں آیا تھا کہ شاید اس بیگ میں سے کچھ سراغ مل سکے۔ لیکن بیگ میں چند بھیگے ہوئے کچھ روپے تھے چورا چورا ہوئے بسکٹ کا پیکٹ ایک خالی چھوٹا سا فیڈر اور کچھ کاغذ جو بارش میں بھیگ کر بیکار ہو چکے تھے۔"

مایوس ہو کر انہوں نے بیگ واپس بشارت کو دے دیا اور ملازموں کو ہدایات دینے لگے۔

"پھپھو جان۔"

فاخرہ اب بدرالنساء کے پاس جا کر اپنی بات دہرا رہی تھیں۔ جو بڑی دل گرفتگی سے بچی کو دیکھ رہی تھیں، جو کچھ خوف زدہ سی ہو کر ان کی گود میں سمٹی بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ابھی تو دادا جان (اس نے خود ہی انہیں دادا جان کا نام دے دیا تھا کہ چھوٹے بچے انہیں دادا جان کہہ رہے تھے) اسے ساتھ لے کر اس کی ماما کے پاس جا رہے تھے پھر یکایک وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر اب باہر کیوں جا رہے تھے۔

"یعنی اب شاہ منزل میں اس غیر عورت کی میت لائی جائے گی اور یہاں سے ہی اسے کی تدفین ہو گی۔ آپ کو پھوپھا جان کو روکنا چاہیے۔ آج تو ہمیں یوں بھی خالہ جان کی طرف جانا تھا شمر۔"

"فاخرہ!" بدرالنساء نے خفگی سے اسے دیکھا۔ "کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ، ایک مسافر لاچار عورت ہمارے گھر پناہ کی غرض سے آئی اور اتفاق سے اس کی موت ہو گئی۔ تو کیا اب ہم اسے سڑک پر پھینکوا دیں۔"

"میرا یہ مطلب نہیں ہے پھپھو جان، میں تو......"

"بس...... آپ کا جو بھی مطلب ہے اب اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہو گی۔"

انہوں نے وہ ساری بات سنی تھی جو فاخرہ نے رفیق الزماں سے کی تھی۔ وہ بھی کبھی فاخرہ کے اس طرح کے مزاج سے نالاں ہو جاتی تھیں۔ شقی القلبی کی حد ہو گئی ہے۔ ایک عورت اپنے عزیز و اقارب سے دور اجنبی جگہ پر آ کر مر گئی۔ معصوم بچی ماں کی مامتا سے محروم ہو گئی اور انہیں سیر سپاٹوں کی سوجھ رہی ہے۔

"اور آپ کو اگر جانا ہے اپنی خالہ کے ہاں تو

چلی جائیں، شفی سے بات کریں۔ آپ نے میت کے نہانے دفنانے کا انتظام نہیں کرنا۔"

"بدرالنساء نے ہمیشہ فاخرہ شاہین کی باتوں کو نظرانداز کیا تھا لیکن آج انہیں اس بے حسی پر دکھ ہوا تھا۔ اس لیے اتنا بول گئی تھیں۔ جواب میں فاخرہ کچھ کہتے کہتے رک گئیں اور تیوری چڑھائے تیز تیز چلتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئیں اور پھر رات گئے تک نیچے نہیں اتریں۔ لنچ اور ڈنر انہوں نے اوپر ہی کیا تھا۔

نیچے میت آتے ہی ایمن آباد کی عورتیں حویلی میں جمع ہو گئی تھیں۔ وہ کسی کی کچھ نہ لگتی تھی لیکن ہر آنکھ ہی اشکبار تھی۔ ایسی جوان موت پھر ننھی سی بچی جب "ماما، ماما" کہہ کر اسے لپٹتی، اسے اٹھانے کی کوشش کرتی کبھی ہاتھ اور کبھی چہرہ چومتی تو سب کی سسکیاں نکل جاتی تھیں۔

عصر کے بعد اسے سپرد خاک کردیا گیا تھا لیکن شاہ منزل کے در و دیوار سے اداسی یوں لپٹی تھی جیسے انہوں نے کسی اپنے کو رخصت کیا ہو۔ ملازم دبے پاؤں چلتے تھے اور آہستہ آواز میں بات کرتے تھے۔ سب ہی اس معصوم اور پیاری بچی کے لیے دکھی تھے جو اتنی کم عمری میں ماں کی ممتا سے محروم ہو گئی تھی۔ بس ایک فاخرہ شاہین ہی ایسی پتھر دل تھیں کہ اس رات سونے کے لیے بیڈ پر لیٹیں تو شفیق الزماں سے بھی شکوہ کر بیٹھی تھیں۔

"آخر پھوپھا جان کو کیا سوجھی کہ اس کا جنازہ شاہ منزل سے اٹھایا۔"

"انسانیت کا یہی تقاضا تھا فاخرہ۔"

شفیق الزماں بہت نرم مزاج تھے اور انہیں یہ بات کوئی ایسی غلط بھی نہیں لگی تھی کہ ایک لاوارث عورت کا جنازہ شاہ منزل سے اٹھایا تھا۔

"اب اس انسانیت کے چکر میں پھوپھا جان کہیں اس بچی کو گھر میں ہی نہ رکھ لیں۔ آپ مشورہ دیجیے گا انہیں کہ بچی کو کسی یتیم خانے میں چھوڑ آئیں۔" فاخرہ نہیں چاہتی تھیں یہ بچی ان کے بچوں کے ساتھ پلے بڑھے نہ جانے کس خاندان کی ہے۔

شفیق الزماں نے فاخرہ کی بات کا جواب نہیں دیا تھا لیکن فاخرہ نے دل میں فیصلہ کرلیا تھا کہ اگر پھپھو جان نے اس بچی کو شاہ منزل میں رکھنے کا فیصلہ کرلیا تو وہ کھل کر مخالفت کریں گی اور فاخرہ نے ایسا ہی کیا تھا۔

رفیق الزماں نے آس پاس کے علاقوں سے بھی پتا کروایا کہیں کوئی بیمار شخص کسی ہاسپٹل میں تو داخل نہیں ہے چھوٹے سے شہر میں گنتی کے دو تین ہاسپٹل ہی تھے۔ ایک سرکاری اور دو پرائیویٹ بچی کو ساتھ لے کر گئے کہ شاید بچی کے والد کسی ہاسپٹل میں ہوں تو بچی پہچان لے۔ سرکاری اسپتال کے عام وارڈ کے سارے مریضوں کو چیک کیا لیکن کچھ پتا نہ چل سکا تب شاہ منزل آکر انہوں نے بدرالنساء سے کہا۔

"ہم نے ہر ممکن کوشش کی کہ بچی کے کسی عزیز کا پتا چل جائے لیکن کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ شاید اللہ بھی چاہتا ہے کہ یہ بچی ہمارے زیرسایہ پلے تو آج سے یہ ہماری بیٹی ہے۔ یوں سمجھیں اللہ نے ہماری نجلہ مریم ہمیں پھر سے دے دی ہے۔"

اور بدرالنسا نے متشکر نظروں سے انہیں دیکھا کہ چند دنوں میں نجلہ انہیں بہت عزیز ہو گئی تھی۔

اور فاخرہ کا گمان جب سچ ہوا تو انہوں نے کھل کر احتجاج کیا۔ رفیق الزماں حیران ہوئے۔

"اس بچی کی کوئی ذمہ داری آپ پر نہیں ہوگی۔ پھر آپ اتنا واویلا کیوں کررہی ہیں۔ آپ کی پھپھو جان کی نگرانی میں ماسی رحمت کی بھانجی اس کی دیکھ بھال کرے گی۔ ماسی رحمت کے کہنے پر ہم نے آج اسے بلوایا ہے۔ بیوہ ہے سسرال والوں نے گھر سے نکال دیا۔ یوں بھی ماسی رحمت اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہ رہی تھیں تو یہ سب بتانے کا مقصد یہ ہے کہ آپ کو اب اس معصوم بچی سے کوئی ایشو نہیں ہونا چاہیے۔"

فاخرہ اب مزید کچھ نہیں کہہ سکتی تھیں لیکن اس

معصوم بچی کے لیے نفرت کا جو بیج ان کے دل کی زمین پر آ گرا تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ یہ بیج ایک تناور درخت بنتا چلا گیا۔ اور اس بلاوجہ کی نفرت نے شاہ منزل کے مکینوں کے دل نالاں کر دیے تھے۔ کچھ وقت کے ساتھ زخمی دل لیے دنیا سے رخصت ہو گئے اور جو تھے آج بھی ان کے دل خالی تھے ویران تھے اور اداسی شاہ منزل کے در و دیوار سے لپٹی آج بھی سب کو سوگوار کرتی تھی۔ جو آنسو اس نفرت نے سب کو بخشے تھے وہ آنسو کبھی خشک نہیں ہوئے تھے۔

☆☆☆

اور آج کی اس طوفانی بارش والی رات میں صاحبزادہ شکیل الزماں بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے سینے پر کتاب، اوندھی کیے آنکھیں موندے ماضی کی گلیوں میں چکراتے پھرتے تھے اور ان کے آنسو اندر گرتے تھے۔ ان کے ہجر میں جنہوں نے شاہ منزل کو خیر باد کہا تو پھر مڑ کر نہیں دیکھا تھا کہ پیچھے رہ جانے والے کتنا تڑپتے ہیں ان کے لیے۔ ایک طوفان باہر تھا اور ایک ان کے اندر بپا تھا۔ یادیں تھیں کہ ایک دوسرے کے پیچھے چلی آتی تھی۔ جب بلقیس بیگم نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"شاویز کا نمبر ملا کر دیکھیں صاحب؟ کیا خبر ادھر سگنل مل جائیں۔"

شاویز نے اپنے لیے آرمی پسند کی تھی اور ان دنوں کھاریاں میں تھے۔ انہوں نے سر ہلا کر پاس پڑا سیل فون اٹھایا ہی تھا کہ اسکرین ہلکی بپ کے ساتھ روشن ہوئی انہوں نے دیکھا شاویز کا میسج تھا۔

"شاہ اپنے دوست کے گھر ہے۔ فکر نہ کریں۔ کل موسم ٹھیک ہوتے پر آئے گا۔" اور اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے انہوں نے بلقیس بیگم کو بتایا تو وہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

کہاں چلیں آپ، اب آرام کریں آدھی رات ہو گئی ہے۔" انہوں نے کتاب بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھی۔

"میں ذرا شکرانے کے نفل ادا کر لوں آپ سو جائیں۔"

"ہاں تھیں، کسی پل چین نہیں آ رہا تھا تو اب خیریت کی خبر ملی تو نفل ادا کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"کافی رات ہو گئی ہے صاحب، آپ بھی آرام کریں۔ میں بھی نفل پڑھ کر لیٹ جاؤں گی۔"

"لیکن آج اس طوفانی بارش نے اندر نہ جانے یادوں کے کتنے در کھول دیے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ اس طوفانی بارش کے بعد پھر کبھی ایسی بارش نہیں ہوئی تھی۔ بارشیں تو اس علاقے میں ہوتی ہی رہتی تھیں لیکن وہ اس طوفانی بارش والی رات کو کبھی اپنے ذہن سے نکال نہیں سکے تھے۔

اس رات بھیگی بھری صبح میں اللہ نے ان کے گھر ایک شہزادی یا پری بھیجی تھی اور شہزادی کی ماما کو اللہ نے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ شہزادی اداس رہتی تھی۔ روتی تھی اور کبھی کبھی تو دادی جان کے بہلانے پر بھی نہ بہلتی تھی۔ اسے اپنے بابا اور اپنی ماما پاس جانا تھا۔ وہ نرمی اور پیار سے اسے سمجھاتے تھے۔

"جو اللہ میاں کے پاس چلے جائیں۔ وہ واپس نہیں آتے۔ جیسے ہماری نور فاطمہ۔"

انہیں اپنی چھوٹی سی گڑیا سی بہن نور فاطمہ بہت اچھی لگتی تھی اور جب وہ چلی گئی تو وہ ہر روز ہی اللہ سے دعا کرتے تھے کہ اللہ انہیں ایک پیاری سی بہن دے دے۔ اللہ نے تب نورالزماں کو بھیج دیا تھا۔ تب شاید اللہ نے ان کی دعا نہیں سنی تھی لیکن انہیں لگتا تھا جیسے اللہ نے اب ان کی دعا سن لی ہے اور اس شہزادی کو ان کے گھر بھیج دیا ہے۔

"آپ نہ رویا کریں تجلہ مریم، اللہ نے آپ کو دادا جان اور دادی جان بھی تو دیے ہیں۔ اور دوسرے اتنے رشتے آپ روئیں گی تو اللہ میاں کو اچھا نہیں لگے گا نجلہ۔"

وہ اپنے انداز میں اسے بہلانے کوشش کرتے تھے اور وہ بہل بھی جاتی تھی۔ کئی مہینوں بعد وہ سنبھلی

تھی۔ اب وہ ہنستی بھی تھی چیتی بھی تھی۔ اور دادی جان کے گرد چکور کی طرح چکراتی تھی۔ ذرا وہ نظروں سے اوجھل ہوتیں تو رونے لگتی تھی۔ بہت جلد وہ سب کی آنکھوں کا تارا بن گئی تھی۔ وہ کون تھی، کہاں سے آئی تھی جیسے کسی کو یاد نہیں رہا۔ سب کے لیے وہ رفیق الزماں اور بدرالنسا کی لاڈلی پوتی تھی۔ بس ایک فاخرہ شاہین تھیں جو جانے اس سے کیوں بیر ڈال کر بیٹھی ہوتی تھیں۔ اور جب بھی موقع ملتا وہ اسے ڈانٹنے سے باز نہ آتیں۔ لیکن اگر وہ تینوں بھائی آس پاس کہیں ہوتے تو جیسے اس کے گرد حصار بنا لیتے بچے محبت اور نفرت کے رنگ پہچانتے ہیں۔ بہت جلد انہیں بھی محسوس ہو گیا تھا کہ ان کی اماں جان نجلہ کو اچھا نہیں سمجھتیں اور وہ اس سے پیار بھی نہیں کرتیں۔ اور نجلہ خود بھی ان سے دور دور رہتی تھی۔ وہ کم گو تھے اکثر جو محسوس کرتے تھے کہہ نہیں پاتے لیکن سلیم کوئی بات دل میں نہیں رکھتے تھے ایک روز سلیم نے فاخرہ سے پوچھ ہی لیا تھا۔

"اماں جان! آپ کو نجلہ سے کوئی مسئلہ ہے کیا۔ وہ ہمیں اپنی نور فاطمہ کی طرح لگتی ہے۔ ہماری کوئی بہن نہیں تھی نا تو اللہ نے ہمیں اتنی پیاری بہن دے دی ہے۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے لیکن آپ کو تو وہ بالکل اچھی نہیں لگتی۔"

فاخرہ شاہین کا موڈ خراب ہو گیا تھا اور شفیق الزماں نے بے حد تاسف سے انہیں دیکھا تھا۔

"آپ کو اس معصوم بچی سے کیا مسئلہ ہے۔ میں یہ نہیں چاہوں گا کہ اماں جان یا ابا جان کو آپ سے بھی اس کے سلسلے میں شکایت ہو۔ بہت پیار کرنے لگے ہیں اس سے۔ اور وہ تو ایسی ہے کہ خود بخود اس پر پیار آتا ہے۔"

فاخرہ نے شفیق الزماں کو تو کوئی جواب نہیں دیا تھا لیکن بعد میں سلیم کے خوب کان کھینچے تھے۔ اور سلیم جو سمجھتے تھے کہ اب اماں جان بابا جان کے سمجھانے پر نجلہ مریم سے پیار کرنے لگیں گی اور انہوں نے شفیق الزماں کے سامنے بات بھی اسی لیے کی تھی کہ وہ انہیں سمجھائیں گے۔ نہیں جانتے تھے کہ وہ اس سے اور زیادہ چڑنے لگی تھیں۔ ان کی نفرت میں اضافہ ہوا تھا۔ وہ اگر کبھی نور کے ساتھ اوپر آجاتی تو ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ اسے اٹھا کر ٹیرس سے نیچے پھینک دیں۔ کتنے مہینوں تک تو ان کا موڈ اس لیے آف رہا تھا کہ رفیق الزماں نے نجلہ مریم اور نورالزماں ایک ہی اسکول میں کیوں کروایا تھا۔ انہوں نے بدرالنسا سے بھی بحث کی تھی اور شفیق الزماں سے بھی کہ آخر اس مہنگے اسکول میں نجلہ مریم کو کیوں داخل کروایا گیا ہے ہم نام ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ ان کی اپنی نجلہ مریم ہے۔ نہ جانے کس گھٹیا کمی خاندان کی ہے اب ہمارے بچوں کے ساتھ پڑھے گی۔"

اور جب رفیق الزماں کو پتا چلا تھا تو وہ بہت ناراض ہوئے تھے "ہماری بیٹی اسی اسکول میں پڑھے گی۔ آپ اگر اپنے بیٹے کو یہاں نہیں پڑھانا چاہتیں تو کسی اور اسکول میں کروالیں۔"

اور وہ جزبز ہو کر رہ گئی تھیں کہ اس قریبی شہر میں یہ سب اچھا پرائیویٹ اسکول تھا۔ اتنی کم عمری میں وہ نور کو مری یا ایبٹ آباد بھیجنے کی قائل نہ تھیں ورنہ دل تو یہ ہی چاہتا تھا کہ وہ اسے اس اسکول میں نہ بھیجیں جہاں نجلہ جاتی ہے۔ نور ان کا بے حد لاڈلا تھا، وہ خود اس سے دور نہیں رہ سکتی تھیں۔ سو دل پر صبر کر لیا تھا لیکن نجلہ کے لیے بھی ان کا دل نرم نہیں ہوا تھا۔ شکیل الزماں حیران ہوتے تھے کہ نجلہ مریم تو ایسی تھی جس سے ہر کوئی پیار کرتا تھا۔ اور وہ بھی تو سب سے پیار کرتی تھی۔ ذرا کسی کو تکلیف ہوتی تو پریشان ہو جاتی تھی۔ پھر اماں جان کو وہ کیوں اچھی نہ لگتی تھی۔ شاید یہ راز وہ کبھی نہ جان پاتے اگر جو انہوں نے دادا جان اور دادی جان کی گفتگو نہ سن لی ہوتی۔

اس روز وہ کسی کتاب کی تلاش میں دادا جان کی اسٹڈی میں گئے تھے جو ان کے بیڈ روم سے ملحق تھی اور بیڈ روم کی دائیں دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا جو اسٹڈی میں کھلتا تھا۔ انہوں نے اسٹڈی میں

قدم رکھا ہی تھا کہ نیم وا دروازے سے بدرالنساء کی آواز سنائی دی تھی۔ بھیگی بھیگی آواز جیسے رو تی رہی ہوں۔ وہ وہاں ہی ٹھٹک کر رک گئے تھے۔
"امین بہت یاد آتا ہے شاہ جی، خواب میں آتا ہے تو ناراض اور خفا سا......" وہ کہہ رہی تھیں۔
"آج بھی خواب میں دیکھا تو ناراض سا منہ موڑ کر چل دیا۔ کتنی آوازیں دیں، دیکھا ہی نہیں......" ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ شاید وہ رونے لگی تھیں۔ چند لمحوں بعد انہوں نے روتی آواز میں التجا کی تھی۔"شاہ جی، آپ سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ آج مانگ رہی ہوں۔ مرنے سے پہلے ایک بار اس سے ملنا چاہتی ہوں۔ کہیں سے اسے ڈھونڈ کر لے آئیں شاہ جی۔ آج تک نہیں کہا لیکن آج کہہ رہی ہوں میرے امین کو لے آئیں ڈھونڈ کر۔ اتنے سال گزر گئے اس کی جدائی میں اب برداشت نہیں ہوتا، دل پھٹنے لگا ہے۔ ہاتھ جوڑتی ہوں آپ کے آگے" "یہ کیا کر رہی ہیں۔" رفیق الزماں نے تڑپ کر کہا تھا۔
"کیا وہ ہمیں یاد نہیں آتے ......کیا وہ ہمارے بیٹے نہیں تھے...... کیا ہم نے ان کے لاڈ شفقت سے بھی زیادہ نہیں اٹھائے تھے۔ لیکن وہ تو ایسے کٹھور نکلے کہ کبھی مڑ کر آئے ہی نہیں۔ ماں باپ تھے ہم۔ آکر معافی مانگ لیتے تو کیا ہم انہیں معاف کر کے گلے نہ لگا لیتے۔ بچپن میں بھی تو کوئی غلطی کرتے تھے۔ ہم ناراض ہوتے تو سوری کر لیتے تھے لیکن اب تو شاہ منزل سے ایسے گئے کہ مڑ کر دیکھا ہی نہیں۔ ہم ان کے باپ تھے بدرالنساء کیا ہمارا حق نہیں تھا کہ ان کو کچھ غلط کرنے سے روکتے۔" ان کی آواز بھی بھرا گئی تھی۔

"میرا دل کہتا ہے شاہ جی، وہ کچھ غلط کر رہے ہوتے تو جب بھی احساس ہوتا اپنی غلطی کا آکر معافی مانگ لیتے۔ ہمارے امین ایسے تو نہیں تھے شاہ جی۔ ہمارے ہاتھوں میں پلے بڑھے تھے۔ ہم ان کی تربیت کی تھی، انہیں بھلے برے کا سارا فرق سمجھایا تھا۔ بیس سال تک ہمیں ان سے کبھی شکایت نہیں ہوئی پھر یکدم دو سال کے عرصہ میں کیسے وہ سب کچھ بھلا بیٹھے جو ہم نے انہیں سکھایا تھا۔ آپ تو جانتے ہیں شاہ جی، وہ شفی سے زیادہ دین کا علم رکھتے تھے۔ شفی نماز میں سستی کر جاتے تھے لیکن امین نے تو کبھی نماز میں بھی سستی نہیں کی تھی۔"
آواز میں آنسوؤں کی نمی گھل گئی تھی۔
"ہمیں آپ کی تربیت پر شک نہیں ہے۔ بدرالنساء" "آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں ہمارا امین ایسا ہی تھا لیکن کبھی کبھی محبت ساری تربیت پر پانی پھیر دیتی ہے بدرالنساء وہ تقریباً تین سال سے لاہور میں تھے۔ کیا خبر دوران تعلیم کیسے لوگوں سے واسطہ پڑا ہو۔ برائی میں بہت اٹریکشن ہوتی ہے اور برا دوست اچھے کو بھی تباہ کر دیتا ہے......" وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئے تھے۔ "ہم نے تو کوئی کوتاہی نہیں کی تھی بدرالنساء، انہیں ہوسٹل کے بجائے فلیٹ کرائے پر لے کر دیا۔ بخشی کو ان کے ساتھ بھیجا کہ انہیں وہاں کوئی تکلیف نہ ہو۔ کسی کو پسند کرنا اتنا بڑا جرم نہیں تھا کہ ہم انہیں گھر سے ہی نکال دیتے لیکن وہ تو دلدل میں گر گئے تھے۔"

شکیل الزماں کو اتنا تو پتا تھا کہ امین الزماں نے کسی گھٹیا خاندان کی لڑکی سے شادی کر لی تھی اس لیے رفیق الزماں نے انہیں گھر سے نکال دیا تھا۔ اور یہ بھی کبھی کبھار فاخرہ شاہین تینوں بھائیوں کو بتاتی رہتی تھیں کہ ان کے امین چچا نے اپنی من مانی کی تو انہیں شاہ منزل سے بے دخل کر دیا گیا۔ شاید اس لیے کہ وہ ایسی حرکت نہ کریں۔
"لیکن ہمیں امین کے متعلق جو کچھ بتایا گیا وہ غلط بھی تو ہو سکتا ہے شاہ جی۔" اتنے سالوں بعد بدرالنساء کہہ رہی تھیں۔
"کیا مطلب ہے آپ کا۔ ہمیں کسی اور نے نہیں فاخرہ نے سب کچھ بتایا تھا، پہلے امین فاخرہ کو ملوانے لے کر گئے تھے اس لڑکی کے گھر، ہم سے تو ذکر نہیں کیا تھا انہوں نے۔"
کیا خبر فاخرہ نے غلط بیانی کی ہو، جھوٹ بولا

ہو۔"

بدرالنساء جھجکتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ وہ جو ساکت کھڑے ان کی گفتگو سن رہے تھے یکدم چونکے تھے۔

"لیکن فاخرہ بھلا کیوں جھوٹ بولیں گی بدرالنساء۔" رفیق الزماں حیران سے تھے۔ "اور پھر ہم نے شیرو کو بھیجا تھا لاہور کہ جا کر سب پتا کرلے کہ انہیں کہاں جاتے ہیں، کیسے لوگوں سے ملتے ہیں اور شیرو نے فاخرہ کی ہر بات کی تصدیق کی تھی۔"

"لیکن ہمارا دل گواہی دیتا ہے شاہ جی کہ ہمارے امین ایسے نہیں تھے کہیں نہ کہیں فاخرہ کا ہاتھ ہے اس میں۔ کیوں کا نہیں پتا ہمیں لیکن ہمارا دل نہیں مانتا وہ سب جو فاخرہ نے بتایا۔"

اتنے سالوں بعد وہ آج دل کی بات رفیق الزماں سے کہنے کی ہمت کرسکی تھیں۔ اور وہ کتاب لیے بغیر وہاں سے پلٹ گئے تھے۔ اور کئی دن تک سوچتے رہے تھے کہ اماں جان نے اگر امین چاچا کے متعلق داداجان سے غلط بیانی کی تھی تو کیوں اور اس کیوں کا جواب جب انہیں ملا تو انہیں یقین ہی نہیں آیا اور جب یقین آیا تو شاہ منزل کے سینے پر دو اور اس کے اپنوں کی جدائیاں مرقوم ہوچکی تھیں۔

فاخرہ شاہین بدرالنساء کے بڑے بھائی کی بیٹی تھیں۔ دو ہی بہن بھائی تھے۔ بھائی سے سات برس چھوٹی تھیں۔ ماں باپ کے بے جا لاڈ نے انہیں تنک مزاج بنا دیا تھا۔ چھوٹی سی بات پر موڈ خراب کرلیتی تھیں کسی حد تک منہ پھٹ بھی تھیں۔ فاخرہ کے والدین کی رہائش کراچی میں تھی۔ بدرالنساء کا اتنی دور کم ہی جانا ہوتا تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی جو کافی عرصہ سے پہلے انگلینڈ گئے تھے واپس کراچی آئے تو بدرالنساء ان سے ملنے کراچی گئیں کہ ان کی عدم موجودگی میں والدین کا بھی انتقال ہوگیا تھا۔ ان کی اکلوتی بیٹی بدرالنساء کو بہت اچھی لگی تھیں۔ وہ خوب صورت ہی نہیں خوب سیرت بھی تھیں اور بدرالنساء نے دل ہی دل میں سوچ لیا تھا کہ وہ اپنے شفیق کا رشتہ اپنی اس بھتیجی سے کریں گی۔ لیکن یہ بات ان کے دل میں ہی تھی۔ شفیق الزماں اور رفیق الزماں سے بات کرنے کے بعد تقریباً ایک سال بعد وہ پھر کراچی گئی تھیں اور اس بار ان کا ارادہ شفیق کے لیے رشتہ مانگنے کا تھا اور جب انہوں نے بھائی کے سامنے مدعا ظاہر کیا تو پتا چلا کہ صرف چند دن پہلے ہی انہوں نے بیٹی کا رشتہ طے کردیا ہے کہ وہ اسی غرض سے پاکستان آئے تھے۔

"آپ نے پہلے ذکر کردیا ہوتا تو ہم بھی ایک سال اچھے رشتے کے لیے پریشان نہ ہوتے لیکن شریفوں میں زبان کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ اور ہم زبان دے چکے۔ آپ فاخرہ سے شفیق میاں کا رشتہ طے کردیں۔ وہ بھی تو آپ کی بھتیجی ہیں آپا۔" ساتھ ہی انہوں نے مشورہ بھی دے دیا تھا۔

"لیکن بھابی جان کا خیال اپنے بھانجے کے لیے تھا اس لیے۔" بدرالنساء دل میں بہت افسردہ تھیں۔

"ہاں آپا، لیکن وہ رشتہ اب ختم ہوگیا ہے۔ بھابی جان کی بہن نے بیٹے کا رشتہ اس کی پسند سے کہیں اور کردیا ہے۔"

اور یوں بدرالنساء نے رفیق الزماں سے مشورہ کرکے شفیق کے لیے فاخرہ کا رشتہ مانگ لیا۔ پہلے تو وہ خوب اچھلی کودیں کہ پھوپھی جان کو پہلے میں نظر نہیں آئی تھی وہ سیکنڈ چوائس تھی۔ ان کی یہ بات انہیں قبول نہیں تھی۔ لیکن جب شفیق الزماں کو دیکھا تو وہ انہیں ان سارے کالے پیلے اور تنگے بوتنگے رشتوں کے مقابلے میں جو اب تک ان کے لیے آئے تھے کسی شہزادے سے کم نہیں لگے تھے اور پھر ماں نے بھی سمجھایا۔

"تمہاری اس نازک مزاجی اور اکھڑ مزاجی کی وجہ سے میری سگی بہن نے انکار کردیا اپنے بیٹے کا رشتہ کرنے سے، شکر کرو کہ پھپھو نے پوچھ لیا۔ اب انکار کرکے ساری زندگی اس دہلیز پر نہ بیٹھی رہ جانا۔"

یوں وہ بیاہ کر شاہ منزل آگئی تھیں لیکن یہ بات

وہ کبھی نہیں بھولتی تھیں کہ وہ بدرالنساء کی سیکنڈ چوائس تھیں۔

شکیل الزماں نانا کی وفات پر ان کے ساتھ کراچی گئے تو ان پر انکشاف ہوا تھا کہ وہ تو اپنی بڑی بھابھی اور اپنی اس چچازاد بہن سے بھی اتنی ہی نفرت کرتی ہیں۔ جتنی وہ نجلہ مریم سے کرتی تھیں۔ یہ ہی نہیں بلکہ اپنی بھتیجی کی طرف دیکھتے ہوئے بھی ان کی آنکھوں سے نفرت جھلکنے لگی تھی۔ اور پھر اس کے بعد بھی انہیں دوبار کراچی جانے کا اتفاق ہوا تو اور اپنی اماں جان کو سمجھنے میں بڑی ممانی نے ان کی کافی مدد کی تھی۔

سلیم کا رجحان اپنی ماموں زاد فرحت کی طرف محسوس کر کے بڑی مامی نے انہیں صاف صاف کہہ دیا تھا۔

"فاخرہ کبھی بھی فرحت کو بہو نہیں بنائے گی۔ اس لیے سلیم کو سمجھا دینا کہ اگر اس کے دل میں فرحت کے لیے کوئی خیال ہے تو جڑ پکڑنے سے پہلے اسے دل سے نکال دے۔"

انہوں نے بھی نانا جان کی وفات پر سلیم الزماں کی فرحت کے لیے پسندیدگی محسوس کی تھی۔ فرحت تھی بھی تو بہت خوب صورت لمبے گھنے سیاہ بال، بہت خوب صورت آنکھیں، دلکش سراپا، گریجویشن کر چکی تھی۔ گھریلو امور میں ماہر، دھیمے اور نرم مزاج کی تو بھلا اماں جان کو کیوں اعتراض ہو گا۔" انہوں نے حیران ہو کر پوچھا تھا اور بڑی مامی نے جو کچھ انہیں بتایا تھا وہ ان کے لیے تکلیف دہ بھی تھا اور انہیں اماں جان پر ترس بھی آیا تھا۔

وہ ہر اس لڑکی سے نفرت کرنے لگتی تھیں جو ان سے شکل وصورت، ذہانت، پڑھائی میں بہتر ہوتی۔ خوب صورت لڑکیوں سے تو انہیں چڑ تھی اس لیے نہیں کہ وہ خود بدصورت تھیں۔ وہ اچھی خاصی خوش شکل تھیں۔ اوڑھنے پہننے کا سلیقہ تھا۔ اپنے زمانے کے مطابق دینی و دنیاوی تعلیم حاصل کر چکی تھیں۔ لیکن اگر انہیں خود سے زیادہ کوئی خوب صورت لگتا تو اس کے لیے دل میں بیر پال لیتیں۔ نفرت کرنے لگتی تھیں اس سے۔ کوئی ان کے سامنے کسی کی تعریف کرتا تو جل کر راکھ ہو جاتیں۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دیں۔

"میں نے سات سال فاخرہ کی بلاوجہ کی نفرت سہی ہے۔ حالانکہ میں اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ میں نے کبھی اسے شکایت کا موقع نہیں دیا۔ لیکن اس کا دل نہیں جیت سکی۔ اور سات سال بعد مجھے پتا چلا کہ کیوں فاخرہ مجھ سے نفرت کرتی تھی۔ اس کی دشمنی کی وجہ کیا تھی۔ پتا نہیں وہ فطرتاً ایسی تھی یا بعد میں ہو گئی تھی لیکن یہ ایک ایسی نفسیاتی بیماری تھی جس کا شاید اب علاج ممکن نہ تھا۔"

وہ نجلہ مریم سے ان کی نفرت کی وجہ سمجھ گئے تھے۔ وہ اتنی خوب صورت تھی کہ بقول ماسی رحمت کے انہوں نے آج تک اتنی حسین صورت نہیں دیکھی تھی پھر بدرالنساء کی تربیت نے اس کی شخصیت میں چار چاند لگا دیے تھے۔ وہ گھر بھر کی لاڈلی اور ملازموں کی آنکھوں کا تارا تھی۔ اس کے شاہ منزل میں آنے سے جیسے رنگ بکھر گئے تھے وہ رنگ جو مدت سے پھیکے ہو گئے تھے۔ اب چاند راتیں پہلے جیسی بارونق ہو گئی تھیں۔ چوڑیاں، مہندی نجلہ مریم کی سہیلیوں کے قہقہے۔

نجوئی کی شادی کے بعد شاہ منزل میں عیدیں، رمضان سب بے رنگ ہو گئے تھے بلکہ نجلہ مریم کی موت کے بعد سے ہی اداسی شاہ منزل میں آ ٹھہری تھی۔ نجلہ کے بعد نجوئی نے بھی عید کی اس طرح تیاری نہیں کی تھی جس طرح پہلے کرتی تھی۔ اور اب رونقیں لوٹ آئی تھیں۔ شاہ منزل کے باغیچے میں پھر سے پیپل کے اونچے درخت پر پینگ ڈال دی گئی تھی۔ ماسی رحمت کی پوتی کے علاوہ امین آباد کی نجلہ کی ہم عمر لڑکیاں اکثر باغیچے میں اکٹھی ہو جاتی تھیں۔ اور وہ ٹیرس سے انہیں بھاگتے، دوڑتے، کھیلتے ہنستے اور جھولے لیتے دیکھتے تو بے اختیار سوچتے تھے کہ جن گھروں میں لڑکیاں نہیں ہوتیں وہاں زندگی کتنی

پھیکی اور بے رنگ ہوتی ہو گی۔ اور وہ اللہ کا شکر ادا کرتے کہ دادا جان نے نجلہ کو اماں جان کے اصرار کے باوجود کسی یتیم خانے میں نہیں بھیجا تھا۔ اگر دادا جان انہیں بھیج دیتے تو وہ کیسے جان پاتے کہ بہنیں کیسی ہوتی ہیں ان کی محبتیں کتنی قیمتی ہوتی ہیں۔

وہ انہیں اور سلیم کو بڑے بھائیوں کا سامان دیتی تھی۔ وہ گھر پر ہوتے تو ان کے آگے پیچھے پھرتی رہتی تھی۔ بدرالنساء یا رفیق الزماں کے سر میں درد بھی ہوتا تو رو رو کر برا حال کر لیتی۔ اللہ سے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتی کہ اس کے دادا جان اور دادی جان جلد سے ٹھیک ہو جائیں۔ اور ایسے میں دادا جان اور دادی جان کی آنکھوں میں اس کے لیے جو محبت ہوتی وہ فاخرہ شاہین کو جلا کر راکھ کر دیتی تھی۔

ہر گزرتا دن اس کے حسن میں اضافہ کرتا جا رہا تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ اتنی حسین ہو گئی تھی کہ نگاہیں اس کے چہرے پر ٹھہر سی جاتی تھیں اور اس کا حسن فاخرہ جبیں کو خوف زدہ کر رہا تھا۔ ان کی نظریں جیسے ہر دم اس کی نگران رہنے لگی تھیں۔ بہت بچپن میں ہی نجلہ نے فاخرہ کے رویے کی سرد مہری کو محسوس کر لیا تھا اس لیے وہ ان سے دور دور ہی رہتی تھی۔ اور اوپر تو ان کی طرف جاتی ہی نہ تھی۔ ہاں اگر دادی جان لے جاتیں تو چلی جاتی تھی پر اس روز وہ بہت بے چین سی سیڑھیوں کے پاس کھڑی تھی۔ جب شکیل الزماں جو زرعی یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے۔ ویک اینڈ پر گھر آئے تھے۔ یہ ان کا فائنل ایر تھا۔

"ارے آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں نجلہ؟"

"وہ...... وہ سلیم بھائی کو بخار ہے۔ دو دن سے۔ میں انہیں دیکھنے جانا چاہتی ہوں لیکن بیگم صاحبہ سے ڈر لگتا ہے وہ خفا ہوں گی۔"

فاخرہ کا حکم تھا کہ وہ اسے پھپھو خالہ یا چچی نہ کہے بلکہ بیگم صاحبہ کہے۔

"آپ سلیم بھائی کو بتا دیجیے گا۔ میں ان کے لیے بہت دعا کرتی ہوں۔ کہ ان کا بخار جلدی اتر جائے......" خوش نما آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔ "وہ ٹھیک ہو جائیں گے نا۔"

"ہاں ہاں ٹھیک ہو جائیں گے۔ دادا جان باہر ملے تھے بتا رہے تھے موسمی بخار ہے۔ دو تین دن پورے کر کے اتر جاتا ہے۔ اور پھر آپ نے دعا بھی تو کی تھی اور بہنیں جب بھائیوں کے لیے دعا کرتی ہیں تو اللہ تعالیٰ ضرور سنتا ہے۔ اور آپ چلیں میرے ساتھ خود سلیم کی مزاج پرسی کر آئیں۔" انہوں نے سیڑھیوں پر رکھے اپنے سفری بیگ کو اٹھایا اور اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

"لیکن وہ خفا ہوں گی۔" وہ جھجک رہی تھی۔ جانے کو جی بھی چاہ رہا تھا اور فاخرہ شاہین سے ڈر بھی لگتا تھا پھر دادی جان نے بھی اوپر جانے سے منع کیا تھا۔

"اور سلیم بھی تو خفا ہوں گے کہ کیسی بہن ہیں آپ کہ انہیں بخار ہے اور آپ ان کا حال بھی دریافت کرنے نہیں آئیں۔"

اس وقت انہیں لگا تھا کہ اگر وہ سلیم الزماں کو دیکھنے نہ جا سکی تو اداس رہے گی اس لیے وہ چاہتے تھے کہ وہ خود ان کے ساتھ جا کر سلیم الزماں کا احوال پوچھ لے۔ اب اماں جان اس بات پر بھلا کیوں خفا ہوں گی اسے۔ لیکن نہیں جانتے تھے کہ اس وقت جو زخم اپنی زبان سے اماں جان اسے لگائیں گی وہ بھی بھرنے والے نہیں تھے۔

وہ جھجکتی ہوئی سی ان کے پیچھے چل پڑی تھی۔ بچپن میں وہ امین الزمان کی ضد پر کئی بار کھیلنے کے لیے اوپر آئی تھی۔ تب فاخرہ اسے کچھ کہتی تو نہ تھیں لیکن غصیلی نظروں سے اسے دیکھتی رہتی تھیں لیکن جب سے دادی جان نے منع کیا تھا وہ امین الزماں کے اصرار پر بھی اوپر نہیں گئی تھی۔ امین الزماں تقریباً اس کے ہم عمر تھے ہم جماعت تھے۔ ایک ہی اسکول میں پرائمری تک پڑھا تھا۔ پھر وہ گرلز سیکشن میں چلی گئی تھی لیکن امین الزماں اس کے بیسٹ فرینڈ تھے۔ وہ شکیل الزماں اور سلیم سے اتنی بے تکلف نہیں تھی جتنی امین سے تھی۔

سلیم اسے اور شکیل کو دیکھ کر خوش ہو گئے تھے۔
"ارے ہماری گڑیا بہن آئی ہے۔"
"آپ کی طبیعت کیسی ہے بھائی۔ دادی جان نے جب سے بتایا ہے میں آپ کے لیے دعا کر رہی ہوں۔" آنکھوں میں چمکتے آنسو پلکوں کو بھگو گئے تھے۔
"میری بہنا نے دعا کی اور میں بھلا چنگا ہو گیا۔" سلیم اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔
"میرا نام بہنا نہیں ہے، نجلہ مریم ہے۔"
شکیل الزماں کو اس کے بچپن کی بات یاد آئی تو لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
"آپ کو یاد ہے نجلہ، بچپن میں جب ہم کہتے تھے یہ ہماری بہنا ہے تو آپ فوراً کہتی تھیں۔ نہیں میں نجلہ مریم ہوں۔" انہوں نے اسے یاد دلایا تو سلیم بے اختیار ہنس پڑے اور وہ جھینپ گئی۔ تب ہی فاخرہ اندر آئیں اور اسے وہاں کھڑے دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔
"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" انہوں نے ہاتھ میں پکڑی دوائی کی بوتل جو وہ سلیم کے لیے لائی تھیں بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھی۔
"وہ سلیم بھائی کی طبیعت خراب تھی تو پوچھنے آئی تھی۔" وہ ڈری سی گئی تھی۔
سلیم الزماں نے اس کی آنکھوں سے جھلکتے خوف کو دیکھا تو اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے تھے۔
"کھڑی کیوں ہیں نجلہ، آپ بیٹھ جائیں اور شکیل بھائی آپ بھی بیٹھیں نا۔ السلام علیکم اماں جان۔" انہوں نے سلام کیا تھا۔
"آپ کب آئے۔" فاخرہ نے جو انہیں دیکھ کر بھی نظر انداز کر کے نجلہ کی طرف دیکھنے لگی تھیں ان کے سلام کرنے پر پوچھا۔
"بس ابھی دادا جان نے سلیم کے بخار کا بتایا تو سیدھا ادھر ہی چلا آیا۔ ابھی آپ کی ہی طرف ہی آ رہا تھا ملنے۔ ابا جان گھر پر ہی ہیں۔"
اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ پھر نجلہ کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔

"نادر بی بی! پھپھو جان نے تمہیں منع نہیں کیا کہ یوں منہ اٹھائے اب مت اوپر آیا کرو۔ لگتا ہے عمر کے ساتھ عقل بھی جواب دے گئی ہے ان کی۔"
سلیم الزماں کا اور ان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا جبکہ نجلہ کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔
"وہ میں سلیم بھائی۔" اس نے پھر کچھ کہنے کی کوشش کی تھی۔
"یہ تمہارے بھائی نہیں ہیں۔ نامحرم ہیں تمہارے۔ کوئی رشتہ نہیں ہے تمہارا ان کے ساتھ۔ پھپھو جان نے اگر نہیں سمجھایا تمہیں تو میں سمجھا رہی ہوں کہ میرے بیٹوں کے آگے پیچھے پھرنا چھوڑ دو۔ کل کلاں کو کوئی بات ہو گئی تو ہمارے بچے خواہ مخواہ بدنام ہو جائیں گے۔ تمہاری جیسوں کی تو کوئی عزت نہیں ہوتی۔ نہ جانے کس گھٹیا خاندان......"
"اماں جان......!" سلیم الزماں کی آواز اتنی بلند تھی کہ فاخرہ نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ سلیم الزماں کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اور شکیل الزماں پشیمان سے کھڑے تھے۔ دکھ، افسوس شرمندگی سے وہ نجلہ مریم کی طرف دیکھ بھی نہیں پا رہے تھے۔ جس کی رنگت یکدم سپید پڑ گئی تھی۔ ہونٹ ہولے ہولے لرز رہے تھے۔ فاخرہ نفرت سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ سلیم آج تک ان کے سامنے اتنی اونچی آواز میں نہیں بولے تھے۔ اس وقت ان کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔
بس......اس کے بعد ایک لفظ بھی مت کہیے گا۔ نجلہ مریم کو میں اور بھائی سگی بہنوں کی طرح سمجھتے ہیں۔"
"لیکن وہ آپ کی سگی بہن نہیں ہیں۔" فاخرہ کو آج موقع ملا تھا دل کی بھڑاس نکالنے کا۔
سلیم الزماں ان کی طرح تحمل مزاج نہ تھے اگر انہیں غصہ آتا تو برداشت نہ کر پاتے تھے۔ اور بلا جھجک اپنی بات کہہ دیتے تھے لیکن فاخرہ کی باتوں سے انہیں اتنا صدمہ پہنچا تھا کہ مزید کچھ کہہ نہ سکے تو

زور سے مکا بیڈ سائڈ پر مارا۔

"اور تم اب کھڑی یہاں کیا سب کا منہ دیکھ رہی ہو۔ جاؤ یہاں سے اب۔"

اور ساکت کھڑی نجلہ مریم روتے ہوئے تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی تو اندر آتے شفیق الزماں سے ٹکرا گئی تھی۔ غیر ارادی طور پر شفیق الزماں نے اپنا ایک بازو اس کے گرد حمائل کیا تھا۔

"تایا جان......" اس کی آنکھوں سے جھرنے بہہ نکلے تھے۔

"کیا ہوا میرا بچہ، اس طرح کیوں رو رہی ہیں آپ؟" انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔

"تایا جان......" دادی جان نے ہی اسے بتایا تھا کہ یہ آپ کے تایا جان ہیں۔ اور وہ انہیں تایا جان ہی کہتی تھی۔

"ہاں ہاں بولو بیٹا کیا ہوا؟" انہوں نے باری باری سب کی طرف دیکھا تھا۔

"کچھ نہیں ہوا شفیق صاحب بس محرم نا محرم کا بتا رہی تھی اسے۔ اور یہ آپ کیوں اسے لپٹائے کھڑے ہیں۔ آپ کی بھی محرم نہیں ہے وہ۔ تایا جان کہنے سے آپ کی بھتیجی نہیں ہو جائے گی۔" وہ جیسے پھنکاری تھیں۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" فوراً انہوں نے اپنا بازو ہٹایا تھا۔ "وہ میرے لیے میری نور فاطمہ جیسی ہے۔"

بازو ہٹتے ہی وہ تیزی سے دروازے سے باہر نکل گئی تھی اور وہ کچھ حیران سے فاخرہ کو دیکھ رہے تھے۔

"آپ اور آپ کے بچے اچھی طرح سمجھ لیں کہ وہ اب بچی نہیں ہے۔ اٹھارہ سال کی بالغ لڑکی ہے اور نا محرم ہے۔ کوئی رشتہ نہیں ہے اس کا آپ کے ساتھ اور نور الزماں کو بھی سمجھا لیں اچھی طرح سے ہر وقت مائی بیسٹ فرینڈ کا راگ الاپتے رہتے ہیں۔ وہ بھی اب بچے نہیں ہیں کالج میں پہنچ چکے ہیں۔ کسی روز اس حسین ناگن نے ڈس لیا نا تو ہاتھ ملتے رہ جائیں گے سب۔"

"لاحول ولا آپ ایک معصوم اور پاکیزہ بچی کے لیے اس قدر غلط گمان کر رہی ہیں۔" شفیق الزماں جیسے صدمے کی سی کیفیت میں کھڑے تھے۔

"پھپھو جان سے کہتی ہوں جلد ہی اس کا کوئی رشتہ دیکھ کر رخصت کریں اسے۔ کہیں یہ نیکی ہمارے گلے ہی نہ پڑ جائے۔"

"بس لینف......" (Enough) سلیم الزماں نے ہاتھ مار کر سائیڈ ٹیبل پر پڑی چیزیں نیچے پھینک دی تھیں۔

"دیکھا آپ نے، اب یہ اس کے لیے آج ماں سے بدتمیزی کریں گے۔ تو کل۔"

شکیل الزماں ان کی باقی بات سنے بغیر کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔ بعد میں بھی وہ کچھ بولتی رہی تھیں لیکن وہ مزید کچھ سننا نہیں چاہتے تھے۔ وہ دو تین ماہ بعد آج گھر آئے تھے لیکن ابا جان سے بھی سلام دعا کیے بغیر باہر نکل گئے تھے۔ سارا قصور ان کا تھا وہ نجلہ کو اوپر نہ لے کر آتے تو اسے اس تکلیف سے نہ گزرنا پڑتا۔ وہ اتنے شرمندہ تھے کہ رات تک اپنے کمرے سے باہر ہی نہیں نکلے تھے۔ اس چھوٹے سے دل والی لڑکی پر کیا گزر رہی ہوگی کیا سوچتی ہوگی وہ۔ آنکھوں پر بازو رکھے وہ نجلہ کے متعلق ہی سوچ رہے تھے جب سلیم الزماں کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر انہیں دیکھا تھا اور پھر اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔

"آپ کی طبیعت اب کیسی ہے سلیم۔"

سلیم کچھ کہے بغیر روم چیئر پر بیٹھ گئے تھے۔ ان کی آنکھیں اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ شاید پھر بخار ہو گیا تھا۔

"اماں جان نے آج بہت زیادتی کی ہے بھائی۔ ہمارے ساتھ بھی اور نجلہ کے ساتھ بھی۔ آپ کو یاد ہے جب پہلی بار میں نے اسے دادی جان کے ساتھ بیٹھا دیکھا تھا تو سوچا تھا شاید اللہ میاں نے ہم سے نور فاطمہ لے کر اسے دے دیا ہے۔ اور پھر

اب تک ایسا ہی لگتا ہے مجھے۔ چھوٹی بہنوں جیسی ہے نجلہ مریم۔ اور پھر وہ بھی کتنی محبت کرتی ہے ہم سے۔ بھائی بھائی کہتے اس کی زبان نہیں تھکتی۔ آپ کو یاد ہے ایک بار جب اسکول میں گرنے سے میرا سر پھٹ گیا تھا تو وہ میرے سر پر پٹی بندھی دیکھ کر کتنا روئی تھی۔ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے میرا سر دباتے ہوئے بار بار پوچھتی تھی۔ بھائی زیادہ درد تو نہیں ہو رہا۔ یہ بہنیں کتنی پیاری ہوتی ہیں بھائی اور اماں جان نے لمحوں میں ہم سے یہ رشتہ چھین کر پرایا کر دیا۔"

سلیم الزماں کی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے تھے۔ وہ جو ابھی کچھ دن پہلے ہی بی ایس سی کا امتحان دے کر فارغ ہوئے تھے اور جنہیں شکیل الزماں نے ہمیشہ ہنستے مسکراتے شرارتیں کرتے جملے چست کرتے دیکھا تھا آج اس اونچے لمبے سلیم الزماں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"وہ ہماری بہن ہے سلیم۔ ہم نے اسے بہن کہا ہے اور ساری زندگی اس رشتے کو نبھائیں گے بڑے بھائیوں کا مان دے کر۔ یہ دل و روح سے جڑا رشتہ ہے سلیم، اسے کوئی نہیں چھین سکتا۔"

وہ سلیم کو یوں دل گرفتہ نہیں دیکھ سکتے تھے سو تسلی دی۔ تب ہی نور الزماں اندر داخل ہوئے تو شکیل الزماں اٹھ کر اسے گلے ملے۔

"کیسے ہو میری جان۔"

"بالکل ٹھیک۔" نور الزماں مسکرائے اور سلیم سے ان کی طبیعت کا پوچھنے لگے۔

"میں ٹھیک ہوں آپ سناؤ آپ کا میچ کیسا رہا۔" سلیم نے پوچھا۔

"اے ون ہمارا کالج جیت گیا۔" آج ان کے کالج کی ہاکی ٹیم کا مقامی کالج کی ہاکی ٹیم سے مقابلہ تھا۔

"اور اماں جان کہہ رہی تھیں کہ ڈنر کے لیے آپ نیچے آئیں گے یا خان چاچا نے یخنی بنائی ہے آپ کے لیے وہ اوپر بھجوا دیں۔"

"نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔" سلیم الزماں کھڑے ہو گئے تھے۔

"میں سونے لگا ہوں۔ مجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے پلیز، اماں جان سے کہہ دینا۔"

سلیم باہر نکل گئے تو نور الزماں نے حیران سا ہو کر شکیل سے پوچھا۔

"یہ سلیم بھائی کو کیا ہوا ہے بھائی جان؟"

"ان کی طبیعت ابھی ٹھیک نہیں ہے۔ آپ فریش ہو کر آجائیں تو پھر اکٹھے چلتے ہیں کھانے کے لیے۔"

خود ذرا بھوک نہیں تھی لیکن وہ نور اور دادا جان کے خیال سے نیچے آ گئے تھے۔ شفیق الزماں دادا جان کے پاس ہی خاموش سے صبح کی اخبار دیکھ رہے تھے جو اذیت اماں جان نے آج سب کو پہنچائی تھی وہ ان کی آنکھوں سے جھلکتی تھی۔ سلام کر کے انہوں نے کھوجتی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا تھا۔

"دادی جان کہاں ہیں؟"

"اپنے کمرے میں ہیں۔ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا ان کا۔" دادا جان بھی انہیں سنجیدہ لگے تھے۔

وہ نجلہ کے ساتھ سیدھے اوپر چلے گئے تھے اور دادی جان سے نہیں ملے تھے۔ وہ دستک دے کر دادی جان کے کمرے میں آئے تو دادی جان کی گود میں سر رکھے نجلہ ان کے بیڈ پر ہی لیٹی ہوئی تھی اور دادی جان اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں۔ ان کے اندر آنے پر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ سرخ متورم آنکھیں، بھیگا چہرہ انہیں اپنا دل کٹتا ہوا سا محسوس ہوا۔

"سوری نجلہ......" دادی جان کو سلام کر کے انہوں نے نجلہ سے معذرت کی۔ "مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ اماں جان اس طرح کی کوئی بات کریں گی ورنہ میں بھی آپ سے اوپر جانے کو نہ کہتا۔"

نجلہ نے زخمی نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔ اور پھر بدر النساء کی طرف رخ کیا تھا۔

"میری ماما فوت ہو گئی تھیں۔ میرے بابا اور

خاندان کا آپ کو پتا نہیں تھا تو آپ نے مجھے یہاں کیوں رکھا، کسی یتیم خانے میں کیوں نہیں بھجوا دیا۔ اور اگر تب نہیں بھیجا تھا تو اب بھیج دیں۔" بات مکمل کر کے وہ یہاں ٹھہری نہیں تھی تیزی سے ان کے قریب سے گزرتی باہر چلی گئی تھی۔ بدرالنساء نے تڑپ کر اسے آواز دی تھی لیکن وہ رکی نہیں تھی۔

اس روز کے بعد سے ان کی وہ چہکتی مینا بالکل چپ ہو گئی تھی۔ زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی رہتی تھی یا بدرالنساء کے کمرے میں۔ اس نے اتنی سی عمر میں ہی سنجیدگی اوڑھ لی تھی۔

وہ فائنل پیپر دے کر گھر آئے تو چند دنوں میں ہی بوریت سی ہونے لگی تھی۔ سلیم بھی ایم بی اے کرنے کے لیے لاہور جا چکے تھے۔ نور پریشان سے تھے چونکہ وہ ان سے بہت قریب تھے اس لیے دل کی ہر بات ان سے کہہ دیتے تھے۔

"مجھے لگتا ہے بھائی جان، نجلہ مجھ سے ناراض ہے۔ وہ مجھ سے پہلے کی طرح بات نہیں کرتی ہے۔ گاڑی میں بھی بالکل چپ بیٹھی رہتی ہے۔ پہلے تو مسلسل باتیں کرتی رہتی تھی۔ اور بتاتی بھی نہیں ہے کہ میری کون سی بات اسے بری لگی ہے۔ وہ کیوں ناراض ہے، مجھ سے۔"

وہ دونوں گاڑی میں اکٹھے شہر جاتے تھے۔ انور دونوں کو اپنے اپنے کالج میں ڈراپ کرتا تھا اور پھر ان کو پک بھی کرتا تھا۔

"انور چاچا بھی کہہ رہے تھے کہ نجلہ بیٹی اتنی چپ چپ کیوں رہنے لگی ہیں۔ آپ پوچھیں نا اس سے۔ میں نے دادی جان سے بھی کہا تھا لیکن انہوں نے ٹال دیا۔"

"پوچھوں گا لیکن نورے یار، لڑکیاں جب بڑی ہو جاتی ہیں تو لڑکوں سے بات کرتے ہوئے جھجکتی ہیں۔" انہوں نے سمجھایا تھا۔

"لیکن ہم تو بیسٹ فرینڈ ہیں بھائی جان!" وہ الجھ رہا تھا۔

"اسے میرے سب دوستوں کا اور میری ساری باتوں کا پتا ہے اور وہ بھی مجھے سب بتاتی تھی اپنی سہیلیوں کے اور اپنی ٹیچرز کے متعلق اور وہ سب جو وہ سوچتی تھی۔ ہم تو اپنی سب الٹی سیدھی اوٹ پٹانگ سوچیں بھی ایک دوسرے سے شیئر کرتے تھے۔ کیونکہ ہمیں پتا تھا کہ ہم ایک دوسرے کا مذاق نہیں اڑائیں گے اوٹ پٹانگ باتیں سن کر۔ پھر اب یکدم یہ جھجک! نہیں بھائی جان، وہ مجھ سے ناراض ہے اور میں اس کی ناراضی برداشت نہیں کر سکتا۔"

اور اس روز انہوں نے نور کی آنکھوں میں نجلہ کے لیے وہ محبت دیکھی تھی جس کا ابھی خود اسے بھی ادراک نہیں تھا اور وہ خوف زدہ ہو گئے تھے۔ اور انہوں نے بے اختیار نور اور نجلہ کے لیے دعا کی تھی یا اللہ انہیں اس محبت کے درد سے آشنا نہ کرنا جو عمریں کھا جاتا ہے اور گھروں کو ویران کر دیتا ہے۔ لیکن نہیں جانتے تھے کہ ان کے نوخیز دل تو نہ جانے کب سے اس درد سے آشنا ہو چکے تھے لیکن انہیں خود اس کا ادراک نہ تھا۔ پتا نہیں کیوں اس روز انہیں چچا جان بہت یاد آئے تھے جنہیں دادا جان نے صرف اس لیے گھر سے نکال دیا تھا کہ وہ اپنی پسند کی شادی کرنا چاہتے تھے۔ وہ تب چار پانچ سال کے تھے جب چچا جان نے گھر چھوڑا تھا اور اب انہیں ان کے حوالے سے کچھ خاص یاد نہ تھا۔ ہاں کبھی کبھی دادی جان بتایا کرتی تھیں وہ ان سے بہت پیار کرتے تھے۔ اور اگر نورے نے نجلہ سے شادی کرنا چاہی تو اور اماں جان تو کبھی بھی نہیں مانیں گی تو کیا نورے بھی گھر چھوڑ کر چلا جائے گا۔

وہ گھبرا کر سیکنڈ فلور پر چلے آئے تھے کہ یہاں دو اطراف پر وسیع ٹیرس تھا۔ جب سلیم ادھر تھے تو وہ کبھی کبھی تازہ ہوا کا لطف اٹھانے کے لیے اوپر چلے آتے تھے وہ کچھ دیر ٹیرس پر بیٹھنے کے ارادے سے آئے تھے لیکن اسٹڈی کا دروازہ کھلا دیکھ کر بے اختیار اس طرف بڑھ گئے تھے۔

یہ دروازہ ہمیشہ لاک ہی رہتا تھا۔ بدرالنساء

اپنی نگرانی میں ہفتہ دس دن بعد صفائی کرواتی تھیں لیکن اب گھٹنوں میں درد کی وجہ سے سیڑھیاں نہ چڑھ پاتی تھیں۔ اس لیے پروین یا ملازموں وغیرہ میں سے کوئی خود ہی صفائی کرنے آجاتا تھا۔ شاید پروین دروازہ لاک کرنا بھول گئی تھی کہ وہ تھوڑی لاپرواسی تھی۔

بچپن میں انہیں اور سلیم کو اس بند دروازے سے بڑی دلچسپی ہوتی تھی اور وہ چچا جان کی اسٹڈی کو اندر سے دیکھنے کے پروگرام بناتے رہتے تھے۔ سو آج بے اختیار دروازہ دھکیل کر اندر چلے گئے تھے۔ کھڑکی کھلی تھی، پردے ہٹے ہوئے تھے شاید پروین نے تازہ ہوا کے لیے کھولے تھے۔ یہاں دادا جان کی اسٹڈی کے مقابلے میں بہت کم کتابیں تھیں۔ بائیں دیوار پر دیوار گیر شیلف تھا۔ اوپر کے چند ریکس میں کتابیں تھیں نیچے والے ریکس میں پلاسٹر آف پیرس کا ایک ماڈل تھا شاید کسی گاؤں یا قصبے کا۔ اردگرد باقی ریکس میں کچھ ڈیکوریشن پیس تھے۔ دو شیلفوں میں تو انجینئرنگ اور فن تعمیر کے متعلق کتابیں تھیں۔ دادی جان نے ایک بار بتایا تھا کہ وہ یو ای ٹی میں پڑھتے تھے۔ کچھ شاعری کی کتابیں اور انگلش ناول بھی تھے۔

انہوں نے ایک ناول نکالا اور وہاں ہی کھڑے کھڑے اس کی ورق گردانی کرنے لگے تھے کہ اس میں سے کچھ گرا شاید کوئی کارڈ تھا یا کوئی تصویر۔ انہوں نے جھک کر وہ تصویر اٹھائی۔ یہ کسی لڑکی کی بلیک اینڈ وائیٹ تصویر تھی۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ پیچھے نہایت خوب صورت رائٹنگ میں ایمن گیلانی لکھا ہوا تھا۔

کیا یہ اس لڑکی کی تصویر ہے، جس سے چچا جان شادی کرنا چاہتے تھے۔ یہ جو کوئی بھی تھی اس کی آنکھوں میں حیا تھی۔ پاکیزگی تھی۔ اور اماں جان سے تو انہوں نے ہمیشہ یہ ہی سنا تھا کہ چچا جان جس سے شادی کرنا چاہتے تھے وہ کوئی شریف لڑکی نہ تھی تو پھر یہ کون تھی وہ یوں ہی تصویر اور کتاب لیے لیے دادی جان کے پاس چلے آئے تھے۔

"یہ کس کی تصویر ہے دادی جان۔" سلام کر کے انہوں نے تصویر ان کی طرف بڑھائی تھی۔

"یہ آپ کو کہاں سے ملی۔" وہ تصویر کو بغور دیکھ رہی تھیں۔

"چچا جان کی اسٹڈی کا دروازہ کھلا تھا تو میں اندر چلا گیا یہ کتاب دیکھنے کے لیے نکالی تو اس میں سے یہ تصویر گر پڑی۔ اس کے پیچھے نام لکھا ہے ایمن گیلانی۔ کیا ان سے ہی چچا جان شادی کرنا چاہتے تھے۔"

وہ پہلی بار یہ تصویر دیکھ رہی تھیں لیکن انہیں لگ رہا تھا جیسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہو۔ کب اور کہاں یاد نہیں آرہا تھا۔ شاید وہم ہوا ہے انہیں۔

لبوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں حیا۔ "نہیں یہ لڑکی بھلا وہ کیسے ہو سکتی ہے۔ اور یہ نام ایمن گیلانی بھی پہلے تو کبھی نہیں سنا تھا انہوں نے۔

"نہیں وہ تو۔" انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"کیا چچا جان نے آپ کو ان کے متعلق کبھی تفصیل سے کچھ نہیں بتایا تھا۔ اور کیا آپ بھی ان سے ملی تھیں۔"

"نہیں۔" انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ فاخرہ کو ہی بتایا تھا سب کچھ اور اسے ہی ملوایا تھا۔"

آج کچھ اور راز اور بھید کھلنے والے تھے۔ وہ پوری طرح دادی جان کی طرف متوجہ تھے۔

"امین کی فاخرہ سے بہت دوستی تھی۔ دل کی باتیں ان سے ہی کہتے تھے اور اس لڑکی کے متعلق بھی انہیں ہی بتایا تھا۔ پھر جب فاخرہ ایک بار کچھ بیمار تھیں تو کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے گئیں تو امین کے فلیٹ میں ٹھہرے تھے شفیق اور فاخرہ۔ امین فاخرہ کو شاپنگ کروانے کا کہہ کر اس لڑکی سے ملوانے لے گئے تھے اور فاخرہ نے آکر بتایا تھا کہ امین کسی لڑکی کو پسند کرتے ہیں اور اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ لڑکی ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ شاہ منزل کی بہو بنے۔ پتا نہیں کیسے اس نے ادائیں دکھا دکھا کر ہمارے امین کو اپنے جال میں پھنسالیا

ہے۔ مجھے تو پہلی ہی نظر میں وہ لوگ پسند نہیں آئے ماں تو کسی طوائف کی بیٹی ہے اور باپ گویا ہے شاید۔ امین شاید بات کریں آپ سے۔ آپ کو بھی پسند نہیں آئیں گے چھچھورے سے ہیں سب۔ ماں بیٹی دونوں ہی ادائیں دکھا رہی تھیں۔ مجھے تو خود شرم آ رہی تھی۔ پتا نہیں امین نے کیسے پسند کر لیا اسے مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا۔ آپ اس لڑکی سے ملیں گی تو آپ کو بھی یقین نہیں آئے گا۔"

دادی جان ہولے ہولے بتا رہی تھیں اور انہیں اس روز کی بات یاد آئی تھی جب وہ دادا جان سے کہہ رہی تھیں کہ کیا خبر فاخرہ نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ نہ ہو۔ تب وہ بے اختیار پوچھ بیٹھے تھے۔

"کیا آپ نے اماں جان کی بات کا یقین کر لیا تھا۔ آپ کو یہ گمان نہیں گزرا تھا کہ وہ غلط بیانی بھی کر سکتی ہیں۔"

"یقین نہ کرنے والی کوئی بات ہی نہیں تھی بچے۔ فاخرہ کی کون سی بہن بھانجی تھی جس کا رشتہ انہوں نے امین سے کرنا تھا کہ گمان ہوتا وہ غلط بیانی کر رہی ہیں۔ پھر بھی بندہ بشر ہیں خیال آ جاتا ہے۔ ایسا بھی تھی لیکن فاخرہ بھلا کیوں جھوٹ بولتیں۔"

تصویر پر اب بھی ان کے ہاتھ میں تھی اور وہ گاہے گاہے اس پر نظر ڈال لیتی تھیں۔ لیکن انہیں بڑی ماں کی باتیں یاد آ رہی تھیں وہ ہر اس سے نفرت کرتی ہیں جو ان سے زیادہ خوب صورت ہو۔ اور تصویر اگرچہ بلیک اینڈ وائٹ تھی لیکن ہر نقش بولتا تھا۔ یہ جو کوئی بھی تھی بے انتہا خوب صورت تھی۔

"کیا چچا جان نے خود آپ کو ان کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔"

"انہیں بتانے کا موقع ہی کہاں ملا تھا۔ آپ کے دادا جان نے ان کی کوئی بھی بات سننے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے فاخرہ کو منع بھی کیا تھا کہ ابھی وہ کسی سے بھی اس کے متعلق بات نہ کریں۔ بعض اوقات کوئی وقتی طور پر پسند آ جاتا ہے۔ لیکن فاخرہ نے شفیق کو ہی نہیں آپ کے دادا جان کو بھی بتا دیا اور انہوں نے فوراً ہی امین کو بلوا بھیجا اور کہا کہ وہ فوراً ہی اس کا نکاح پڑھوانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے قریبی عزیزوں میں دو رشتے بتائے تھے انہیں کہ وہ ان میں سے کسی کو اوکے کر دیں تو وہ آج ہی ان سے بات کر کے اگلے ہفتے کو نکاح کی تاریخ رکھ لیتے ہیں۔"

"لیکن مجھے ان میں سے کسی سے شادی نہیں کرنی بابا جان!" پہلے تو وہ ہکا بکا سے رہ گئے تھے لیکن پھر اعتماد سے کہا تھا کہ باپ کے لاڈلے تھے جانتے تھے وہ ان کی بات مان لیں گے۔ "میں نے بھابھی جان کو بتایا تھا کہ میں......"

"انہوں نے ہمیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ اور ہمیں آپ کی پسند پر افسوس ہے۔"

"آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے بابا جان میں......"

"ٹھیک ہے غلط فہمی ہی سہی، آپ اس وقت صرف یہ بتائیں کہ آپ کو ہمارا طے کردہ رشتہ منظور ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو ابھی اسی وقت شاہ منزل سے نکل جائیں۔"

"میں نے ایک لڑکی اور اس کے والد سے کمٹمنٹ کی ہے اور میں کیسے اپنے الفاظ سے پھر سکتا ہوں۔ آپ بابا جان پلیز، سمجھنے کی کوشش کریں کہ......"

آپ کے دادا جان کو بہت کم غصہ آتا تھا۔ لیکن اس روز وہ اتنے غصے میں تھے کہ اس سے پہلے میں نے انہیں اتنے غصے میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"ہاں یا نہیں۔" وہ پوچھ رہے تھے اور امین مزید کچھ کہے بنا۔ شاہ منزل سے نکل گئے اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آئے۔" ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ شکیل الزماں نے تسلی دینے کے انداز میں ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔

"آپ کو خود اپنے طور پر بھی تو پتا کروانا چاہیے تھا کہ وہ لڑکی اور اس کا خاندان کیسا ہے۔"

آپ کے دادا جان نے فاخرہ کے بتانے کے بعد شیر و کو بھیجا تھا۔ ڈیرے پر ہوتا تھا اکثر بیجوں وغیرہ

کی خریداری کے لیے لاہور جاتا رہتا تھا۔ امین کے فلیٹ کا بھی پتا تھا اسے۔ اس نے جو آ کر بتایا تھا۔ اس نے آپ کے دادا جان کو مزید بھڑکا دیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ امین کا آج کل جن لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے وہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔ اور جس لڑکی کے گھر ان کا آنا جانا ہے وہ شریف لوگ نہیں ہیں۔ بدنام گھرانہ ہے پھر شفیق بھی بہت غصے میں تھے انہوں نے تمہارے دادا جان سے کہہ دیا تھا کہ اگر امین اس لڑکی کو شادی کر کے گھر لے آئے تو میں شاہ منزل سے اپنے بیوی بچوں کو لے کر چلا جاؤں گا۔"

ان کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔ "مجھے تو کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ تمہارے دادا جان نے کہ وہ امین کو بلوا رہے ہیں میں تو امین کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اور امین چلے گئے۔ زندگی انہوں نے گزارنی تھی کر لیتے اس سے شادی پر نہ لاتے شاہ منزل میں۔ رابطہ تو رہتا۔ ملنے تو آتے کبھی کبھار۔ ماں ہوں۔ کبھی کبھی دل پھٹنے لگتا ہے۔" آنسو ان کے رخساروں پر پھسل آئے تھے۔

شکیل الزماں کو لگا تھا کہ جیسے دادی جان کا دکھ ان کے دل میں اتر آیا ہو۔ کچھ دیر وہ یوں ہی خاموش بیٹھے رہے۔ رہ رہ کر دل میں خیال آتا تھا کہ کیا اماں جان نے سچ کہا تھا۔

"یہ لیں تصویر۔ امین کی اسٹڈی میں جہاں سے لی تھی وہاں ہی رکھ دیں۔ کیا خبر کبھی امین آئیں اور......" انہوں نے دوپٹے کے پلو سے اپنا چہرہ پونچھا۔ کیا خبر کسی ہم جماعت لڑکی کی ہو۔"

"آپ نے پھر کبھی چچا جان کے متعلق پتا نہیں کروایا کہ وہ کہاں ہیں۔ انہوں نے اس لڑکی سے پھر شادی کی یا نہیں۔" انہوں نے تصویر دادی جان سے لے لی تھی۔

"دو سال بعد۔ امین کے جانے کے تقریباً دو سال بعد میری طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی اور میں نے آپ کے دادا جان کی منت کی تھی کہ ایک بار مجھے ان سے ملوا دیں اور انہوں نے ممتاز کو بھیجا تھا لاہور پیغام دے کر۔ لیکن وہ ممتاز کو نہیں ملے۔ فلیٹ انہوں نے ایک ماہ بعد ہی چھوڑ دیا تھا کہ اس لگژری فلیٹ کا کرایہ کہاں سے ادا کرتے۔ یونیورسٹی بھی چھوڑ دی تھی تیسرے سال میں تھے تب۔ یونیورسٹی میں ممتاز کو ان کا ایک جونیئر یونیورسٹی فیلو مل گیا تھا۔ جب وہ ان کے متعلق کچھ لڑکوں سے معلوم کر رہا تھا تو اس نے بتایا تھا کہ امین الزماں کچھ دن ان کے گھر کے پاس ایک کمرہ کرائے پر لے کر رہے تھے پھر انہیں کسی کنسٹرکشن کمپنی میں کسی دوسرے شہر میں نوکری مل گئی تھی تو وہ چلے گئے تھے۔ کون سی کمپنی اور کون سا شہر تھا اسے علم نہیں تھا۔ بخشی بھی پھر کبھی امین آباد نہیں آیا کہ وہ ہی کچھ بتا دیتا۔ ماں باپ مر چکے تھے۔ بیوی بچے تھے نہیں۔"

"اماں جان کو تو اس لڑکی کے گھر کا پتا تھا نا۔ ادھر سے کیوں نہیں معلوم کروایا آپ نے۔" انہیں یکدم خیال آیا تھا۔

"فاخرہ کو لاہور کے گلی کوچوں کا کیا پتا تھا۔ اتنا بڑا شہر تھا۔ فاخرہ کہتی تھیں انہیں کیا پتا امین انہیں کہاں اور کس محلے میں لے کر گئے تھے۔"

"ان شاء اللہ، دادی! جان چچا جان ایک دن ضرور آ جائیں گے۔"

انہوں نے سوچا تھا کہ اخبار میں کئی بار اشتہار نظر سے گزرتے تھے۔ "کہ تمہاری والدہ سخت بیمار ہے گھر آ جاؤ۔" وغیرہ وہ بھی اس طرح کا کوئی اشتہار اخبار میں دے دیں تو ممکن ہے کہ چچا جان کی نظر سے گزرے اور وہ دادی جان سے ملنے آ جائیں۔

انہوں نے امید کا چھوٹا سا سرا دادی جان کے ہاتھ میں پکڑایا تو ان کی بجھی ہوئی آنکھوں میں چمک سی آ گئی تھی۔

"مجھے کبھی بھی دادا جان اتنے کنزرویٹو نہیں لگے کہ وہ پسند کی شادی کے اتنے مخالف ہوں گے۔" وہ تصویر ہاتھ میں پکڑے کھڑے ہو گئے تھے۔

"بات پسند کی شادی کی نہیں تھی شکیل بیٹا۔ وہ

کسی اچھے خاندان کی لڑکی کو پسند کرتے تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوتا بھلے وہ کتنے ہی غریب کیوں نہ ہوتے۔ لیکن......" ایک آہ بھر کر وہ خاموش ہوگئی تھیں۔

"سوری دادی جان! میں نے یہ تصویر دکھا کر اور پرانی باتیں کرکے آپ کو ڈسٹرب کردیا۔"

"یہ باتیں بھولتی ہی کب ہیں۔ کوئی یاد دلائے یا نہ دلائے۔ جدائیوں کے زخم کب بھرتے ہیں۔ مرنے والوں پر صبر آجاتا ہے۔ جیتے جی بچھڑ جانے والے آخری سانس تک تڑپاتے ہیں۔ کیا خبر ہم نے ہی ان کے ساتھ زیادتی کردی ہو۔ کیا خبر۔"

وہ بے حد بھاری دل کے ساتھ دادی جان کے کمرے سے باہر آئے تھے۔

لاؤنج میں بیٹھی کوئی کتاب پڑھتی نجلہ مریم نے جھکی آنکھوں کے ساتھ انہیں سلام کیا تھا اور اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اس اجنبیت نے دل پر پڑے بوجھ کو بڑھا دیا تھا۔

یہ انکشافات جو آج ہوئے تھے انہوں نے رات دیر تک انہیں جگائے رکھا تھا۔ "کیا خبر ہم نے ہی ان کے ساتھ زیادتی کردی ہو۔" دادی جان کا یہ جملہ ان کے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا۔ لیکن کچھ غلط تھا اس معاملے میں۔ تو کیا اماں جان نے۔ بار بار ذہن میں آتا اور وہ اس خیال کو جھٹک دیتے تھے کہ وہ ماں تھیں۔ اور ماں کے بارے میں وہ ایسا سوچنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ لیکن امین الزماں کیا وہ اتنے بے وقوف تھے کیا ان کا معیار ایک ایسی لڑکی ہوسکتی تھی۔

دادی جان نے ایک بار بتایا تھا وہ بہت ذہین تھے۔ بہت نیک سلجھے ہوئے۔ کہتے تھے۔ ایک بار تعلیم حاصل کرلوں پھر امین آباد کو ایسا مثالی بنادوں گا کہ لوگ دیکھنے آیا کریں گے۔ یہاں لوگوں نے بغیر سوچے سمجھے جہاں دل چاہا گھر بنالیا۔ رولز کے مطابق ہر چیز کا خیال رکھ کر یہ گھر نہیں بنائے گئے۔" انہوں نے ایک ماڈل بھی بنا رکھا تھا امین آباد کا۔

اور ان کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ ان کے اپنے ان سے جدا ہوگئے۔ ان کے خواب بکھر گئے۔ پتا نہیں آج کل کہاں کیسی زندگی گزار رہے ہوں گے۔ کیا صرف اماں جان کے ایک جھوٹ کی وجہ سے؟ کیا اس کے لیے وہ قصوروار ہیں؟ وہ سوچنا نہیں چاہتے تھے لیکن بار بار ذہن میں خیال آتا تھا۔

وہ گھبرا کر سلیم کے پاس لاہور چلے آئے تھے۔ آتے ہوئے نور نے پوچھا تھا۔

"کیا آپ نے نجلہ سے بات کی۔ کیوں ناراض ہے وہ مجھ سے۔ بات کیوں نہیں کرتی؟"

انہوں نے نجلہ سے بات نہیں کی تھی وہ کہاں ان سے پہلے جیسی بے تکلفی سے بات کرتی تھی بس سلام کرتی اور غائب ہوجاتی تھی لیکن وہ جانتے تھے کہ وہ نور سے کیوں بات نہیں کرتی۔ کیوں دور دور رہنے لگی ہے۔ اس روز جو کچھ اماں جان نے کہا تھا اس کے بعد وہ کیسے نور سے پہلے کی سی بے تکلفی سے بات کرسکتی تھی لیکن انہوں نے نور سے کہا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے نور۔ وہ آپ سے ناراض نہیں ہے بس آپ سے جھجکنے لگی ہے۔ آپ بھی تو اتنے بڑے ہوگئے ہیں۔ اونچے لمبے سے۔"

"اس نے آپ سے کہا بھائی جان، کہ وہ مجھ سے ناراض نہیں ہے۔" نورالزماں کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ "اور بھلا مجھ سے جھجکنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں چاہے کتنا بھی بڑا ہوجاؤں رہوں گا تو اس کا وہی بیسٹ فرینڈ نا۔"

نورالزماں کی آنکھوں کی اس چمک نے کئی دن تک انہیں خوف زدہ رکھا تھا اور انہوں نے دونوں کے لیے بے حد دعائیں کی تھیں کہ یا اللہ انہیں اس راستے کا مسافر نہ بنانا جس پر چل کر انہیں منزل نہ مل سکے۔

سلیم کے پاس ایک ماہ رہ کر وہ واپس آئے تو نور اور نجلہ امتحان کی تیاری میں مصروف تھے اور نور نے ان سے نجلہ کی ناراضی کے حوالے سے کوئی بات

نہیں کی تھی بلکہ وہ انہیں پہلے کی طرح ہی لگے تھے مطمئن اور خوش سے۔ پتا نہیں نجلہ نے ان سے بات کرنی شروع کر دی تھی یا اماں جان نے نور کو بھی سمجھایا تھا اور انہیں سمجھ میں آ گیا تھا کہ نجلہ اب بچی نہیں رہی اور اس کے ساتھ بے تکلفی مناسب نہیں ہے۔ وہ گھر میں بور ہوتے تو اپنی زمین کی طرف نکل جاتے۔ ہاریوں سے زمین کی زرخیزی، کھادوں اور بیجوں کے متعلق بات چیت کرتے۔ انہیں مشورے دیتے۔ ان کی رائے سنتے۔ دادا جان اور دادی جان سے گپ شپ لگاتے۔ ان کی آنکھوں میں ٹھہری جدائی کی اذیت محسوس کرتے تھے لیکن پھر بھی دادی جان سے چچا جان کے متعلق بات نہیں کی تھی۔ ہاں لاہور سے آ کر انہوں نے دادی جان کو مختلف اخبارات میں دیے جانے والے اشتہار کے متعلق بتایا تھا لیکن وہ مایوس سی تھیں۔ جیسے انہیں یقین ہو کہ اگر اشتہار امین کی نظر سے گزرا تو وہ تب بھی نہیں آئیں گے پھر بھی وہ انہیں امید دلاتے تھے کہ شاید اشتہار چچا جان کی نظروں سے نہ گزرا ہو ورنہ وہ ضرور آتے۔ اور ایک افسردہ سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر بکھر کر معدوم ہو جاتی۔

"اب کتنی سانسیں بچی ہیں شکیل بچے۔ اتنی سی خواہش تھی کہ مرنے سے پہلے ایک بار اس سے مل لیتی۔ پرندے جب اڑان بھرتے میں اپنا الگ گھونسلہ بناتے ہیں تو پرانے گھونسلوں میں واپس میں آتے انہیں اپنی الگ دنیا میں بسانی ہی ہوتی ہیں۔ ایک عمر میں والدین کو جدائی کا دکھ سہنا ہی ہوتا ہے لیکن ہمارا دکھ تو سوا ہے۔ یہ دکھ کئی کئی راتوں کو جگائے رکھتا ہے کہ ہم نے اس کی بات نہیں سنی۔ عدالت بھی تو مجرم کو صفائی میں کچھ کہنے کا موقع دیتی ہے نا لیکن ہم نے اسے موقع نہیں دیا اور سزا سنا دی۔ ہم نے تو اپنے ہی بچے پر ظلم کر دیا شکیل بچے اس احساس نے ہماری اذیتوں میں اضافہ کر دیا ہے۔"

انہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ انہیں کیا کہہ کر تسلی دیں۔ بیس اکیس سالوں کے انتظار اور اذیت کی تھکن دادا جان اور دادی جان کے جھریوں بھرے چہرے میں جیسے ثبت ہو گئی تھی۔ ان کا جی چاہتا وہ فاخرہ شاہین سے پوچھیں اماں جان کیا یہ ظلم آپ نے کیا لیکن کیوں۔ اور وہ بے دھیانی میں انہیں دیکھے چلے جاتے تھے، وہ اماں جان کے متعلق ایسا کچھ بھی گمان نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے وہ فوراً اس خیال کو جھٹک دیتے تھے۔

نجلہ اپنی پڑھائی میں مصروف تھی۔ اور وہ زیادہ وقت دادی جان کے ساتھ گزارنے لگے۔

اور پھر وہ دل میں بہت سے خدشے اور خوف لے جرمنی آ گئے تھے۔ انہوں نے زرعی یونیورسٹی فیصل آباد سے ماسٹر کیا تھا اور جرمنی کے ایک زراعت میں ریسرچ کے متعلق انسٹیٹیوٹ میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ آتے ہوئے انہوں نے روتی ہوئی نجلہ کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ جو ساری احتیاط بھول کر دادی جان کے ساتھ کھڑی بے تحاشا روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"بھائی جان! آپ کیوں جا رہے ہیں۔ پلیز نہ جائیں، دادی جان آپ کے بغیر بہت اداس ہو جائیں گی۔"

"جلد آ جاؤں گا گڑیا۔ دو سال یوں گزر جائیں گے پتا بھی نہیں چلے گا۔ میرے لیے دعا کرنا اور یاد رکھنا کہ آپ میری بہن ہو۔ اور ہمیشہ یہ رشتہ قائم رہے گا۔"

لیکن یہ دو سال کتنی مشکل سے گزرے تھے یہ وہی ہی جانتے تھے۔ بہت سے وہم اور خوف ان کے دل سے چپٹے رہتے تھے۔ حالانکہ سلیم اور نور کے خطوط میں کوئی بھی پریشانی والی بات نہ ہوتی۔ اور نور کے ہر خط میں نجلہ کی طرف سے ان کے لیے سلام اور بہت ساری دعائیں ہوتی تھیں۔ ایک بار سلیم نے لکھا تھا۔

"اماں جان بہت بدل گئی ہیں بھائی۔ نجلہ کے ساتھ ان کا رویہ بہت بدل گیا ہے بلکہ مجھے لگتا ہے کہ وہ اس سے پیار کرنے لگی ہیں۔ اور اس کے صدقے

میں اماں جان کو میں نے اجازت دے دی ہے کہ وہ جہاں جی چاہے میرا رشتہ طے کر دیں۔ کیونکہ فرحت انہیں پسند نہیں ہے۔"

اور وہ خوش ہونے کے بجائے پریشان ہو گئے تھے۔ اتنے سالوں کی نفرت کیا یوں اتنی جلدی ختم ہو جاتی ہے۔ انہیں یقین نہیں آتا تھا۔ اور پھر سلیم کا وہ سادا سا جملہ فرحت انہیں پسند نہیں ہے۔ انہیں بڑی مامی کی کہی باتیں یاد دلا دیتا۔

"وہ فرحت سے کبھی سلیم کی شادی نہیں کریں گی۔ یہ ایک نفسیاتی مرض ہے۔ جس میں فاخرہ شاہین مبتلا ہیں۔"

اور کیا یہ مرض بغیر کسی علاج کے بغیر کسی کوشش کے خود ہی ٹھیک ہو گیا ہے اور وہ نجلہ سے نفرت کے بجائے پیار کرنے لگی ہیں۔ دل یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔

جب وہ دو سال بعد واپس آئے تو اماں جان کا نجلہ کے ساتھ دوستانہ سا برتاؤ دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ امین اور نجلہ خوش تھے۔ شاہ منزل کے پھیکے ہوتے رنگوں میں پھر چمک آ گئی تھی۔ نجلہ پہلے کی طرح ہی چہکتی پھرتی تھی اب تو وہ بلا روک ٹوک اوپر بھی آ جاتی تھی۔ دادا جان اور دادی جان پہلے سے زیادہ کمزور اور بوڑھے ہو گئے تھے۔ نجلہ بی ایس سی کا امتحان دے چکی تھی اور نور یو ای ٹی میں ایڈمیشن لے کر لاہور جا چکے تھے۔ وہ آرکیٹیکٹ بننا چاہتے تھے۔

ان کے واپس آنے کے چند ماہ بعد ہی گھر میں ان کی اور سلیم کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ نجلہ چونکہ فارغ تھی اس لیے شادی کی تیاریوں میں فاخرہ شاہین کے ساتھ ساتھ مصروف تھی۔ فاخرہ شاہین نے دونوں بھائیوں کا رشتہ اپنے قریبی عزیزوں میں طے کیا تھا۔ جو راولپنڈی میں تھے۔ انہوں نے بلقیس کو دیکھ رکھا تھا انہیں کوئی اعتراض نہ تھا۔ بلکہ بچپن میں جب کبھی وہ اپنے والدین کے ساتھ امین آباد آتیں تو ملازمین کے بچوں کو دیکھ کر انہیں صاحبزادہ صاحب کہنا چاہتیں تو کہہ نہ پاتیں اور صرف صاحب کہہ کر چپ کر جاتیں تو انہیں بہت اچھا لگتا تھا۔ اور شادی کے بعد بھی وہ انہیں صاحب ہی کہتی تھیں۔

شادی میں فاخرہ شاہین نے نجلہ کو بہنوں والے سارے نیگ دیے تھے نجو ٹی پھپھو بھی شادی میں شرکت کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ شاہ منزل میں ہر طرف رنگ ہی رنگ بکھرے ہوئے تھے اور انہوں نے ان خوشیوں کے دائمی ہونے کی سینکڑوں بار دعا کی تھی۔ لیکن نور کی محبتیں لٹاتی نظریں اور نجلہ کے لبوں پر بکھری شرمیلی مسکراہٹ انہیں آج بھی پریشان کرتی تھی وہ ڈر سے جاتے تھے۔ کیا اماں جان نور اور نجلہ کا ساتھ قبول کر لیں گی۔ یہ وہ سوال تھا جس کا جواب انہیں ایک سال بعد ملا تھا۔

نور شاویز کے عقیقے میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ جس صبح انہوں نے واپس لاہور جانا تھا۔ وہ بدر النساء سے ملنے ان کے کمرے میں آئے تھے۔ جب دادی جان انہیں نجلہ کے لیے آنے والے رشتوں کے متعلق بتا رہی تھیں۔

"آپ کی شادی میں بھی کئی لوگوں نے پوچھا تھا لیکن جب نجو ٹی نے منع کر دیا تھا جب سے آئی تھی کہہ رہی تھی۔ بیٹے سے ایک بار بات کر کے وہ نجلہ کو اپنی بہو بنا کر لے جائے گی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ شادی میں شرکت کے لیے آئی تھیں بچے نہیں آ سکے تھے۔ لیکن نجو ٹی کے بیٹے نے تو وہاں ہی کوئی لڑکی پسند کر رکھی ہے۔ تب سے کہہ رکھا تھا میں نے سب سے کہ کوئی اچھا رشتہ ہو تو بتائیں۔ آپ کے دادا جان اور میں ہم اپنی زندگی میں ہی نجلہ کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ہماری بیٹی ہے اور ہم ایک بیٹی کی طرح ہی شان و شوکت سے اسے شاہ منزل سے رخصت کریں گے۔ آپ ذرا ان لڑکوں کے متعلق پتا کروا دیجیے گا۔" انہوں نے تکیے کے پاس پڑا لفافہ انہیں دیا تھا۔

ان کی نظریں بے اختیار نور الزماں کی طرف اٹھی تھیں جو کچھ حیران و پریشان سے کھڑے دادی

جان کو دیکھ رہے تھے۔ ذرا سی دیر کے لیے ان کی آنکھوں اور چہرے کے رنگ ماند پڑے تھے لیکن دوسرے ہی لمحے وہ مسکراتے ہوئے بدرالنساء کے گھٹنے پر ہاتھ رکھے کہہ رہے تھے۔

"کیا آپ کی نزدیک کی نظر کمزور ہے جو میں آپ کو نظر نہیں آیا یا آپ مجھے اپنی بیٹی کے قابل نہیں سمجھتیں۔"

"آپ سے زیادہ کون نجلہ کے قابل ہوگا۔ لیکن آپ کی اماں جان نہیں مانیں گی۔" ان کی آنکھوں میں حسرت تھی۔

"ارے نہیں دادی جان! اماں جان تو نجلہ سے بہت پیار کرتی ہیں۔ مجھے ہمیشہ اس کا خیال رکھنے کو کہتی ہیں۔ اسے ساتھ لے جا کر شاپنگ کروانے کے لیے اصرار کرتی ہیں۔"

اور وہ بے حد حیران سے ہو کر کارپٹ پر بیڈ کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھے نورالزماں کو دیکھ رہے تھے۔

"تو دادا جان سے پوچھ کر آپ اماں جان اور ابا جان سے بات کر لیجیے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دادا جان کسی کو بتائے بغیر اپنی لاڈلی بیٹی کا رشتہ طے کر دیں۔"

وہ ہولے سے ہنستے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور انہوں نے امین الزماں کی آنکھوں میں جلتے یقین کے دیوں کے ہمیشہ روشن رہنے کی دعا کی تھی لیکن پتا نہیں کیوں ان کی دعائیں درِقبولیت تک پہنچ نہ پائی تھیں۔

دادی جان نے فاخرہ کے بجائے شفیق الزماں سے بات کرنا مناسب سمجھا تھا لیکن شاہ منزل میں بھونچال سا آ گیا تھا۔

اماں جان کا ردعمل اس قدر شدید ہوگا انہیں اندازہ نہ تھا۔

"وہ دو ٹکے کی بے نام و نشان لڑکی جو ہمارے ہی ٹکڑوں پر پل رہی ہے۔ کیا میں اس سے اپنے شہزادوں جیسے بیٹے کی شادی کروں گی۔ نہ جانے یہ گند کہاں سے اٹھا کر یہاں پھینک کر خود مر گئی۔ اور اس ناجائز اولاد کو......"

"بس فاخرہ شاہین مزید ایک لفظ اور نہیں......" شفیق الزماں دھاڑے تھے۔ "آپ کو یہ رشتہ منظور نہیں تو ٹھیک ہے مت کریں لیکن ایک معصوم بچی پر الزام مت لگائیں۔"

"ہوں معصوم۔ میرے بیٹے پر اپنے حسن کے جال پھینکنے والی معصوم کدھر سے ہوگئی۔ ابھی اسی وقت اسے گھر سے نکالیں۔ ورنہ میں چلی جاؤں گی۔ نہ جانے باہر کس کس سے دوستیاں لگا رکھی ہیں۔ ابھی اسی وقت گھر سے نکالیں۔" وہ شفیق الزماں کے منع کرنے کے باوجود مسلسل زبان کے تیروں سے سب کو ہی زخمی کرتی جا رہی تھیں۔

اندر کچن میں سعادت (ماسی رحمت کی پوتی) اور پروین کے ساتھ کھڑی ڈنر کے لیے تیاری کرتی نجلہ مریم کا رنگ لحہ بہ لحہ زرد پڑتا جا رہا تھا۔ آنکھوں کی چمک ماند پڑتی جا رہی تھی اور ہونٹ سفید ہو رہے تھے۔ پھر وہ یکدم گر گئی اور اسے سنبھالنے کی کوشش میں پروین بھی تقریباً گر گئی تھی۔ وہ جو ساکت بیٹھے تھے یکدم بھاگ کر کچن میں آئے تھے۔ پروین اور سعادت اسے اٹھا کر لاؤنج میں لے آئی تھیں۔ دادی جان کو تو خود اپنی نبضیں ڈوبتی محسوس ہو رہی تھیں۔

"اور اب یہ اس طرح بے ہوش ہو کر سب کی ہمدردیاں جیت کر بلیک میل کرے گی ہمیں لیکن میری زندگی میں تو یہ ممکن نہیں ہاں مجھے مار کر بے شک پھپھو جان کی خواہش پوری کر دیجیے گا اسے بہو بنا کر۔ شفیق الزماں سے کہہ کر وہ اٹھ کر تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی تھیں۔

صبح سے ہلکی ہلکی ہونے والی بوندا باندی نے یکدم طوفان بارش کی شکل اختیار کر لی تھی اور جب وہ ہر تدبیر کے بعد بھی ہوش میں نہ آئی تو اس طوفانی بارش میں وہ اندھا دھند گاڑی چلاتے اسے شہر لائے تھے۔ پچھلی سیٹ پر اس کا سر گود میں رکھے پروین

مسلسل روتے ہوئے دعا مانگ رہی تھی۔ اور ان کے پیچھے ہی کچھ دیر بعد رفیق الزماں دادی جان کو لا رہے تھے کہ ان کا بی پی نارمل نہیں ہو رہا تھا کبھی زیادہ ہو جاتا کبھی کم۔ اور وہ مسلسل ایک ہی بات سوچ جا رہے تھے کہ ایک ایسی ہی طوفانی رات میں نجلہ ان کے گھر آئی تھی اور کیا ایسی ہی ایک رات میں وہ بچھڑ جائے گی۔ یا اللہ نہیں۔ نجلہ کو زندگی دینا اسے کچھ ہو گیا تو نور برداشت نہیں کر پائیں گے کہ اس رات دادی جان کے کمرے میں ان کی بے چینی دیکھ کر انہوں نے جان لیا تھا کہ وہ اس سے کتنی شدید محبت کرتے ہیں۔

اس بار ان کی دعائیں مستجاب ہو گئی تھیں تیسرے دن نجلہ نے آنکھیں کھول دی تھیں اور یہ تین دن بدر النساء نے بڑھاپے اور کمزوری کے باوجود ہسپتال میں ہی گزارے تھے۔ دادا جان کو بھی رات کو وہ زبردستی گھر بھجواتے تھے۔ لیکن وہ صبح سویرے آ جاتے تھے۔ اب ڈاکٹر نے نجلہ کی طرف سے اطمینان دلایا تو وہ پروین کو اس کے پاس چھوڑ کر دادی جان اور دادا جان کو شاہ منزل واپس لائے تھے۔ دادی جان کو آرام کی بے حد ضرورت تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ کل تک وہ انہیں ڈسچارج کر دیں گے۔ احتیاطاً ایک دن وہ انہیں انڈر آبزرویشن رکھیں گے۔ اسپتال سے گھر تک وہ یہ ہی سوچتے رہے تھے کہ اب نور کو وہ یہ سب کچھ کیسے بتائیں گے، ان کا رد عمل کیا ہوگا۔ کیا وہ بھی چچا جان کی طرح گھر چھوڑ کر چلے جائیں گے، یا اماں جان کے فیصلے پر سر جھکا دیں گے۔ اور نہیں جانتے تھے کہ امین آباد کے اس روشن دن شاہ منزل میں کتنے بھید ان پر ظاہر ہونے والے تھے ایسے بھید جس نے شاہ منزل کے در و دیوار کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ گاڑی سے باہر نکل کر دادی جان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اترنے میں مدد دے رہے تھے جب احاطے کی طرف سے سفید بالوں والا ایک شخص قریب آیا تھا۔

"سلام بڑے صاحب۔"

رفیق الزماں نے عینک کے شیشے صاف کیے اور غور سے اسے دیکھنے لگے۔

"بڑے صاحب میں بخشی۔ اللہ بخش۔ آپ کا خادم۔"

رفیق الزماں تو کچھ دیر کے لیے بالکل خاموش ہو گئے تھے۔ کچھ دیر بعد ان کے لبوں سے نکلا تھا۔

"بخشی! کہاں تھے تم۔ ہم نے تمہیں اپنے امین کی دیکھ بھال اور حفاظت کے لیے بھیجا تھا ان کے ساتھ اور یہ کیسا خیال رکھا آپ نے ان کا کہ عمر بھر کی جدائیاں ہمارا مقدر ہو گئیں۔ آپ نے کیوں نہ روکا انہیں غلط راستے پر چلنے سے۔ کیوں نہ سمجھایا۔ جب پہلی بار ان غلط راستوں پر انہوں نے قدم رکھا تو کیوں نہ بتایا ہمیں۔"

ان کی آواز میں آنسو گھل گئے تھے اور وہ شکوہ بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"ہمارے چھوٹے صاحب تو ایسے تھے کہ جو والدین کا فخر ہوتے ہیں۔ وہ تو۔"

"وہ جیسے بھی ہیں۔ جیسے بھی تھے ہمیں بتاؤ بخشی، ہمارے امین کہاں ہیں؟" بدر النساء نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔ "ہمیں ان کے پاس لے چلو بخشی، ہم تمہیں اللہ کا واسطہ دیتے ہیں۔"

بخشی ہاتھ باندھ کر زار و قطار رونے لگا تھا۔

"جو میرے اختیار میں نہیں ہے اس کے لیے مجھے اللہ کا واسطہ مت دیں بیگم صاحب۔"

اور ان کا دل جیسے ڈوب کر ابھرا تھا۔ لیکن کچھ غلط تو نہیں ہو چکا۔ اور دادی اماں کو سہارا دیتے ہوئے انہوں نے بخشی کی طرف دیکھا تھا۔

"وہ تو بیس سال پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو گئے تھے بیگم صاحب۔ اس رات جب ایمن بی بی امین صاحب کے علاج کے لیے مدد مانگنے آئی تھیں یہاں وہ ہسپتال میں تھے اور اس کے صرف ایک ہفتے بعد وہ بھی چلے گئے۔ لیکن خوش تھے کہ ان کی نجلہ اپنے خاندان میں پہنچ گئی ہے۔" وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا تھا۔

"یہ جھوٹ بول رہا ہے شاہ جی۔" بدر النساء کا دل اس بات کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ "ہمارا امین ایسے کیسے اس دنیا سے جاسکتا ہے۔ یہ ہمارے بیٹے کے ساتھ گیا تھا۔ اب ان کے بغیر کیوں آیا ہے۔ اسے کہیں چلا جائے یہاں سے اور ہمارے بیٹے کو ساتھ لے کر آئے۔"

"چلا جاؤں گا بیگم صاحبہ، بس بیٹا سے ایک بار مل لوں۔ ان کی ایک امانت انہیں دینی ہے۔ ان کا برتھ سرٹیفکیٹ اور کچھ دوسرے کاغذ ہیں اس لفافے میں۔"

رفیق الزماں ضبط کیے کھڑے تھے لیکن بدر النساء ہوش وحواس سے بیگانہ ہوگئی تھیں۔ وہ انہیں بازوؤں میں لیے گھر کے اندر گئے تھے جبکہ رفیق الزماں بخشی سے کچھ سوال کر رہے تھے۔ جب وہ اندر آئے تو ان کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا تھا۔ وہ دادی جان کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارتے شفیق الزماں کو گلے لگاتے ہوئے دھاڑیں مار مار کر رونے لگے تھے۔

"آج ہر امید مرگئی شفی۔ امین اب کبھی نہیں آئے گا۔ وہ ہم سے ناراض ہی اس دنیا سے چلا گیا۔ فاخرہ ہم آپ کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔"

پتا نہیں وہ بخشی سے کیا کیا کچھ جان کر آئے تھے۔ ابھی پوچھنے کا موقع نہ تھا۔ شاہ منزل میں جیسے کہرام مچ گیا تھا۔ بدر النساء ہوش میں آگئی تھیں۔ اور ماہی بے آب کی طرح تڑپتی تھیں۔ سب رو رہے تھے امین کس کو عزیز نہ تھے۔ ممتاز، بشارت خان چاچا اور سب ملازمین سٹنگ میں کھڑے آنسو بہا رہے تھے۔ یہ بڑا مشکل وقت تھا۔ برسوں پہلے شاہ منزل سے جاتے والے لاڈلے امین الزماں خود تو نہ آئے تھے ان کی موت کی خبر آگئی تھی۔

کئی گھنٹوں بعد انہیں بخشی کا خیال آیا تو وہ باہر آئے لیکن چوکیدار سے پتا چلا کہ وہ جاچکا ہے۔ وہ اس سے بہت کچھ جاننا چاہتے تھے ابھی بہت سارے رازوں پر پردہ پڑا تھا جن کا علم انہیں دلوا جان سے دو دن بعد ہوا تھا۔ وہ مایوس سے اندر لیونگ روم میں آئے تو دادی جان روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"ارے کوئی میری بچی کی تو خبر لے۔ کوئی اسے جا کر بتائے وہ غیر نہیں میرے امین کی نشانی ہے۔"

اور انہیں خیال آیا تھا کہ انہیں ہاسپٹل سے آئے کئی گھنٹے ہو چکے تھے۔ پروین وہاں اکیلی پریشان ہو رہی ہوگی۔

امین الزماں کی موت کی خبر کچھ ہی دیر میں امین آباد میں پھیل گئی تھی۔ لوگ شاہ منزل میں اکٹھے ہو رہے تھے۔ نورا اور سلیم کی طرف شہر بندہ بھیج کر فون کروا دیا تھا۔ وہ شفیق الزماں اور دادا جان کو بتا کر ہاسپٹل آئے تھے اور وہاں جو خبر ان کی منتظر تھی اس نے ان کے ہاتھوں پیروں کی جان نکال دی تھی پروین اکیلی خالی بیڈ کے پاس بیٹھی رو رہی تھی۔

"نجلہ بی بی پتا نہیں کہاں چلی گئی ہیں۔ میں تھوڑی دیر کے لیے باہر گئی تھی پانی لینے۔ آئی تو وہ نہیں تھیں۔ سارا اسپتال چھان مارا ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں وہ اب واپس شاہ منزل نہیں جائیں گی، کہیں چلی جائیں گی۔ میں نے کہا تھا کہ دادی جان ان کی جدائی برداشت نہیں کرسکیں گی۔ شاہ منزل میں سب ان سے بہت محبت کرتے ہیں۔ صرف چھوٹی بیگم کی وجہ سے وہ ایسا نہ سوچیں۔ وہ چپ کر گئی تھیں۔ تب۔ لیکن پھر۔ پتا نہیں کیوں چلی گئیں۔ کہاں چلی گئیں۔"

اور کہاں جاسکتی تھی وہ۔ رات گئے تک وہ مارے مارے پھرتے رہے۔ اس کی ان ساری سہیلیوں کے گھر گئے جن کا پتا انور چاچا کو تھا۔ وہ یہاں شہر میں پڑھتی رہی تھی۔ یہاں اس کی کچھ سہیلیاں تھیں۔ کبھی کبھار وہ ان کے گھر بھی چلی جاتی تھی۔ تو انور چاچا کو ان کے گھروں کا علم تھا۔ لیکن وہ تو کسی کی طرف بھی نہیں گئی تھی۔ وہ اور کہاں اسے تلاشتے مایوس ہو کر وہ شاہ منزل واپس آگئے تھے۔

یہ دوسرا بڑا صدمہ تھا جو آج کے دن شاہ منزل

کے مکینوں کو سہنا پڑا تھا۔ انہوں نے باہر سے ہی سمجھا کر پروین کو اس کے کوارٹر میں بھیج دیا تھا کم از کم آج رات وہ دادی جان کو یہ تکلیف نہیں دینا چاہتے تھے۔ لیکن خود ان کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ دادی جان تو جیسے ان کی منتظر تھیں۔ وہ نجلہ کو گلے لگا کر دل کی بھڑاس نکالنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے یہ کہہ کر انہیں بلا لیا تھا کہ ڈاکٹر نے اجازت نہیں دی۔

شاہ منزل پر آج کی رات بہت بھاری تھی۔ شاید کوئی سویا ہو۔ فجر کی اذانوں کے وقت سلیم اور نور الزماں بھی پہنچ گئے تھے اور وہ نور الزماں سے نظریں چراتے پھر رہے تھے۔ لیکن کب تک یہ بات چھپائی جا سکتی تھی۔ سو شام تک سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ نجلہ ہاسپٹل سے چلی گئی ہے۔ اور سب جانتے تھے کہ فاخرہ نے اسے گھر سے نکل جانے کو کہا تھا۔

"تو کیا ہوا جو وہ چلی گئی ہے۔" سب کی ملامتی نظریں اپنی طرف اٹھتی دیکھ کر فاخرہ بول اٹھی تھیں۔ "باپ بھی تو کسی کی خاطر گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ یہ بھی کسی کی خاطر چلی گئی ہے گھر سے۔ سہیلیوں کے گھر جاتی رہتی تھی۔ کیا خبر کس سے یاری لگا رکھی تھی۔ کون سا کسی شریف ماں کا دودھ پیا تھا۔"

"بس۔" شفیق الزماں نے جو ابھی ابھی شاہ منزل کے لاڈلے، بیس سال پہلے دنیا سے رخصت ہو جانے والے امین الزماں کی مغفرت کے لیے دعا کروا کے اور خیرات تقسیم کر کے اندر آئے تھے ہاتھ ذرا سا بلند کیا تھا۔

"بس فاخرہ شاہین، ایک لفظ اور نہیں۔ ہم اگر کل سے خاموش ہیں تو ہمارے ضبط کا امتحان نہ لیں۔ اگر بابا جان ہمیں نہ روکتے اور ہمیں آپ کی عمر اور آپ کے تین جوان بچوں کا خیال نہ دلواتے تو بخدا ہم ایک لمحہ بھی آپ کو یہاں برداشت نہ کرتے۔ آپ نے امین کی بیوی کے حوالے سے جو کچھ کہا ہم نے یقین کر لیا کہ ہم انہیں جانتے نہ تھے لیکن اس بچی کے اٹھارہ سالوں کا ایک ایک لمحہ ہماری نظروں کے سامنے گزرا ہے۔ کوئی الزام لگانے سے پہلے اتنا تو سوچ لیا ہوتا......" ان کی آواز بھرا گئی تھی۔

"آپ اچھی طرح جانتی تھیں کہ امین جس لڑکی کو پسند کرتے تھے وہ کون تھی۔ امین آپ کو لے کر گئے تھے نا اس سے ملوانے۔ پروفیسر مظفر گیلانی کشمیر کاز کے لیے کام کرنے والا ایک بڑا نام۔ اعلیٰ خاندان۔ بابا جان تو ذاتی طور پر ان سے مل چکے تھے۔ آپ جانتی تھیں کہ اتنے بڑے آدمی کی بیٹی کے لیے بابا جان اور اماں جان کبھی انکار نہیں کریں گے تو آپ نے یہ کہانی گڑھی، جھوٹ بول کر اس طرح بابا جان کو بھڑکایا کہ انہوں نے امین کی بات تک نہ سنی۔ کیا دشمنی تھی آپ کو امین سے۔ کیا بگاڑا تھا انہوں نے آپ کا۔ وہ تو بڑی بہنوں جیسا مان اور احترام دیتے تھے آپ کو۔"

ان کی آواز گر گئی تھی اور وہ نڈھال سے صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئے تھے۔ کہ احاطے میں بیٹھے بخشی سے کچھ دیر بعد باہر جا کر ایک ایک بات انہوں نے خود پوچھی تھی۔

آج باقی رازوں سے بھی پردہ اٹھ گیا تھا۔ وہ گمان سچ ہو گیا تھا جسے وہ اپنے دل میں آتے ہی جھٹک دیتے تھے۔ ایک وہ ہی تھے جو جانتے تھے کہ اماں جان کو امین سے کوئی دشمنی نہ تھی یہ تو ان کی وہ نفسیاتی بیماری تھی جس کے ہاتھوں مغلوب ہو کر وہ بلاوجہ کی نفرت پال لیتی تھیں۔ اور اس نفرت نے شاہ منزل کو آنسو اور ویرانیاں دی تھیں۔

امین الزماں نے دیوانوں کی طرح نجلہ کو ڈھونڈا تھا۔ اور پھر واپس چلے گئے تھے۔ انہوں نے فاخرہ سے ایک لفظ بھی نہ کہا تھا۔ بس ان سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ لیکن پھر شاہ منزل واپس نہیں آئے تھے۔ وہ امین چچا کی طرح لاپتا نہیں ہوئے تھے۔ مہینوں بعد اپنی خیریت کی خبر دے دیتے تھے۔ اب فون لگ چکا تھا تو فون کر دیتے تھے۔ ان سے اور شفیق الزماں سے بات کرتے لیکن فاخرہ سے نہیں۔

ان پچیس سالوں میں دو بار وہ امین آباد آئے تھے دادا جان اور دادی جان کی وفات پر لیکن جنازے

کے بعد چلے گئے تھے۔" ایک رات بھی نہیں رکے تھے۔

نجلہ کے جانے کے بعد ایک سال کے اندر اندر دادا جان اور دادی جان آگے پیچھے رخصت ہوگئے تھے۔ امین الزماں کا ہجر تو سہہ لیا تھا انہوں نے لیکن ان کے بوڑھے اور کمزور دل نجلہ کا دکھ برداشت نہیں کرپائے تھے۔ سلیم الزماں نے کراچی میں کاروبار سیٹ کرلیا تھا کبھی سالوں بعد آتے تھے۔ شاہ منزل میں اب خاموشیوں کا راج تھا۔

شفیق الزماں فاخرہ سے صرف ضروری بات کرتے تھے اور فاخرہ سوچتی رہتی تھیں۔ ہاں انہیں تو امین سے کوئی دشمنی نہ تھی۔ وہ تو انہیں اپنے چھوٹے بھائی کی طرح ہی سمجھتی تھیں پھر انہوں نے ایسا کیوں کیا اور جب کچھ سمجھ نہ پاتیں تو بولائی بولائی پھرتیں۔

"انہیں اماں جان پر ترس آتا تھا۔ تکلیف ہوتی تھی لیکن زیادہ دیر تک وہ بھی ان کے پاس نہ بیٹھتے تھے۔ جب وہ نور اور نجلہ کی بات کرتیں تو دل میں درد جاگ اٹھتا تھا۔ وہ نجلہ پر ناراض ہوتی تھیں کہ اس کی وجہ سے نورے انہیں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ وہ نجلہ کے خلاف بولتی رہتی تھیں اور وہ اٹھ کر چلے آتے تھے۔ نجلہ اور نورے اپنے ساتھ شاہ منزل کے سارے رنگ لے گئے تھے۔ کوئی خوشی بھی آتی تو اداسی کے کہرے میں ڈوبی ہوئی ہوتی۔ اس روز کے بعد شاہ منزل میں کوئی پورے طور پر خوش نہیں ہوا تھا۔ کوئی کھل کر نہیں ہنسا تھا۔

سلیم جب بہت عرصہ نہ آتے تو شفیق الزماں اور فاخرہ ان کے پاس کچھ دنوں کے لیے چلے جاتے اور وہ زیادہ وقت باہر اپنی زمینوں پر اور ڈیرے پر گزارتے۔ نت نئے تجربات کرتے رہتے تھے۔ اور زندگی دھیرے دھیرے ختم ہو رہی تھی۔ پچیس سال ہوگئے تھے۔ وہ اب عمر کے پچاسویں سال میں تھے۔ کسی روز عمر کا پیمانہ بھر جائے گا۔ جام الٹ دیا جائے گا اور خاکی وجود کے ساتھ ساری امیدیں بھی دم توڑ جائیں گی۔ امیدیں جو آخری سانس تک زندہ رہتی ہیں۔ ان کے دل میں بھی امید کی لو جلتی تھی کہ ایک روز نجلہ آجائے گی اور وہ نور الزماں کو بلا کر اسے رخصت کریں گے جیسا کہ انہوں نے دادی جان سے ہی نہیں خود سے بھی عہد کیا تھا۔

"صاحب" بلقیس بیگم نے جو بہت دیر سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تو انہوں نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"فجر کی اذانیں ہونے ہی والی ہیں کچھ دیر آرام کرلیں۔" جانتی تھیں کہ ایسی طوفانی راتیں کئی بار انہوں نے جاگ کر گزاری ہیں۔

وہ کچھ دیر خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھتے رہے پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دیگر فکلی سے بولے۔

"بلقیس! آپ کا دل کیا کہتا ہے ہماری زندگی میں کبھی ہماری بہن واپس شاہ منزل آجائیں گی۔ شاہ منزل کی رونقیں پھر سے لوٹ آئیں گی۔"

"اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے صاحب۔ شاید کوئی سبب بنا دے۔ ایسا کہ ہماری نجلہ ہمیں مل جائے آپ دعا کرتے ہیں نا۔ اللہ ضرور سنے گا۔"

"آپ بھی دعا کیا کریں بلقیس۔ اور ہاں اماں جان سے کل بات ہوئی تھی آپ کی۔ کیا کہہ رہی تھیں کب آئیں گی ایک ماہ تو ہوگیا انہیں کراچی گئے۔"

شاہ منزل میں آج کل صرف وہ اور بلقیس تھے۔ ابا جان اور اماں جان سلیم کے پاس کراچی گئے ہوئے تھے۔

"سلیم بھائی سے بات ہوئی تھی کہہ رہے تھے کچھ دن بعد سب اکٹھے آئیں گے۔ لیکن کب یہ نہیں بتایا تھا۔"

"اچھا۔" وہ خوش ہوگئے تھے انہیں بھی سلیم سے ملے دو سال تو ہوگئے تھے۔ "یہ اچھا کیا کہ سلیم نے بھی آنے کا پروگرام بنالیا۔"

انہوں نے بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز کھولی کہ اب نیند کا وقت گزر گیا تھا تو نیند شاید نہ آتی سر بہت بھاری ہو رہا تھا۔ ایسی کیفیت میں وہ کبھی کبھار نیند کی

گولی لے لیتے تھے۔ ورنہ سارا دن طبیعت خراب رہتی تھی۔

دراز کھولی تو نظر تصویر پر پڑی جو چند دن پہلے ہی چچا جان کی اسٹڈی سے لے کر آئے تھے۔ اب اکثر وہ ان کی اسٹڈی میں جا کر بیٹھے رہتے تھے۔ ان کی کتابوں کا ایک ایک ورق کھول کر دیکھتے کہ شاید کہیں ایمن گیلانی کے گھر کا کوئی اتا پتا مل جائے کہ بخشی نے تو ان کے بہن بھائیوں ماں باپ کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ موقع ہی ایسا نہ تھا کہ ان سے مزید کوئی سوال کیا جاتا۔ کیا پتا تھا کہ وہ ڈرائیور سے ہسپتال کا پتا پوچھ کر نجلہ سے ملنے چلا جائے گا۔ کبھی کبھی ایک موہوم سا خیال آتا تھا کہ کیا خبر نجلہ اس کے ساتھ ہی چلی گئی ہو۔ شاید ایمن گیلانی کا کوئی بہن بھائی کوئی عزیز رشتہ دار ہو۔ گو وہاں ہسپتال میں کسی نے نجلہ کو کسی سفید بالوں والے شخص کے ساتھ جاتے نہیں دیکھا تھا لیکن امیدوں کے شجر پر خود رو پودوں کی طرح خود بخود پھول پتے اگ آتے ہیں۔

انہوں نے دوائی کا پتا اٹھاتے ہوئے غیر ارادی طور پر تصویر بھی اٹھالی تھی اور اسے دیکھنے لگے تھے۔ جو قدرے پرانی ہو چکی تھی۔

"یہ نجلہ کی ماما کی تصویر ہے نا۔" بلقیس نے یوں ہی پوچھ لیا تھا حالانکہ پہلے بھی تصویر دیکھ چکی تھیں۔

"ہوں۔" انہوں نے سر ہلایا۔

"نجلہ کی ماں سے بہت مشابہت تھی۔" وہ بھی تصویر کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ "ویسے ہی ہونٹ، ویسی ہی ناک اور یہ تھوڑی کے نیچے چاہ ذقن۔"

دادی جان کو اور خود انہیں بھی لگا تھا کہ اس تصویر والی کو کہیں دیکھا ہے لیکن کہاں سمجھ ہی نہیں پائے تھے کہ بعض اوقات بالکل سامنے کی چیزیں دکھائی نہیں دیتیں اور آدمی دور تک کھوج آتا ہے۔

دادی جان نے بھی تو ہر جاننے اور ملنے والی کے متعلق سوچا تھا لیکن نجلہ کی طرف ان کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔

انہوں نے تصویر واپس دراز میں رکھ کر گولی پانی سے نگلی۔

"اگر نماز کے لیے آنکھ نہ کھلے تو جگا دیجیے گا۔" وہ لیٹ گئے تھے۔

"پتا نہیں چچا جان اور چچی جان نے کتنا مشکل وقت گزارا ہوگا جو چچی جان کو مدد کے لیے یہاں تک آنا پڑا۔"

بلقیس بیگم نے جیسے خود سے ہی کہا تھا لیکن اپنے اوپر کمبل لیتے شکیل الزماں نے سنا تو ایک جلتا ہوا خیال دل کی زمین پر آ کر گرا۔ اگر ایمن گیلانی کا کوئی عزیز رشتہ دار ہوتا تو وہ مدد کے لیے اس طوفانی بارش والی رات میں شاہ منزل کیوں آتیں اور اس خیال نے امیدوں کے شجر پر اگنے والے سب پھول پتے جلا کر راکھ کر دیے۔ انہوں نے آنکھیں موند لیں لیکن خود رو پودے تو خود بخود اگ آتے ہیں۔ پھر اگ آنے تھے۔ ایسا ہی تو ہونا تھا۔ اور ایسا ہی ہوتا رہا تھا پچیس سالوں سے۔ اور بند آنکھوں میں نمی پھیلتی چلی گئی اور وہ سونے کی کوشش کرنے لگے۔

☆☆☆

شاہ دل کی آنکھ کسی آواز سے کھلی تھی اس نے مندی مندی آنکھوں کے ساتھ سامنے وال کلاک پر نظر ڈالی تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"اف اللہ! ساڑھے دس بج رہے ہیں۔"

کھڑکیوں پر پردے پڑے تھے اور کمرے میں نائٹ بلب جل رہا تھا۔ پتا نہیں اس وقت موسم کیسا ہے۔"

شاہ دل نے بیڈ سے اتر کر پردے ہٹائے باہر چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ابا جان اور اماں جان انتظار کرتے ہوں گے انہوں نے شاویز کو پیغام دیا تھا کہ انہیں بتا دے کہ وہ کل صبح اگر موسم ٹھیک ہوا تو جلد ہی نکل آئے گا۔

جب سے ہاؤس جاب شروع ہوا تھا وہ گھر نہیں جا سکا تھا۔ تھکا دینے والی نائٹس بھگتا کر اتنی تھکن ہو جاتی تھی کہ ویک اینڈ پر اٹھنے کو جی ہی نہیں

چاہتا تھا اور کبھی کبھی تو چھٹی والے دن بھی ڈیوٹی لگ جاتی تھی۔ جلدی جلدی فریش ہو کر وہ باہر نکلا تو عنایہ ٹی۔ وی لاؤنج میں بیٹھی اخبار گود میں رکھے ٹی وی پر کوئی ٹاک شو دیکھ رہی تھی جو ریپیٹ میں چل رہا تھا۔

"جاگ گئے جناب!" اس نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی بند کیا۔

"ہاں لیکن عینی کی بچی تم نے مجھے جگایا کیوں نہیں"

"پچھلے تین روز محترم نے مسلسل ڈیوٹی دی ہے تو ہم نے سوچا کہ چلو آرام کر لو۔" وہ مسکرا کر اسے دیکھ رہی تھی۔

"شکریہ۔ اس مہربانی کا اب فوراً سے پہلے چائے پلواؤ تاکہ میں گھر کے لیے نکلوں۔ وہ صوفہ چیر پر بیٹھ گیا تھا۔

"صرف چائے کیوں بلکہ زبردست ناشتا تیار کیا ہے ماما نے۔ نہاری چنے وغیرہ۔ اور ہم آپ کے جاگنے کے انتظار میں اب تک صرف خوشبوؤں پر گزارہ کر رہے ہیں۔" وہ مسکرا کر اٹھی۔ "دس منٹ میں ناشتا لگ جائے گا۔ ڈرائیور کو ماما نے ابھی بھیجا ہے کلچے لینے تاکہ گرم گرم ہوں۔"

"تھینکس۔" اس نے ذرا سا سر خم کرتے ہوئے اخبار اٹھایا۔

میڈیکل کالج کے پہلے سال ہی عنایہ سے اس کی ملاقات ہوئی تھی اور جب گروپ بنے تو عنایہ بھی اس کے گروپ میں تھی۔ چار لڑکوں اور چار لڑکیوں کا گروپ تھا، سب ایک دوسرے کے لیے مخلص تھے ہمدرد تھے۔ ایک دوسرے کی مدد کرنا، دکھ سکھ میں شریک ہونا، پانچ سالوں میں وہ ایک فیملی کی طرح ہو گئے تھے۔ عنایہ کے لیے اس کا دل مختلف انداز میں کب دھڑکنا شروع ہوا تھا اسے یاد نہیں تھا۔ ان کے درمیان کوئی بہت لمبے چوڑے محبت کے عہد و پیمان نہیں ہوئے تھے۔ نہ ہی اظہار کے لیے بڑے بڑے بھاری بھرکم لفظوں کا استعمال کیا گیا تھا۔ بس ایک روز چوتھے سال میں اس نے بے حد سادہ لفظوں میں اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔ اور عمر بھر ساتھ نبھانے کی خواہش کی تھی۔ اور عنایہ جو خود بھی شاہ دل کو پسند کرتی تھی۔ اس نے اس کی محبت کو قبول کرتے ہوئے کہا تھا کہ فیصلہ اس کے والدین کریں گے۔ ہاؤس جاب کے بعد وہ اپنے والدین کو بھیج سکتا ہے۔ پھر اس کے بعد انہوں نے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی بس ایک انجانے سے تعلق کی ڈور تھی جو دونوں کے درمیان بندھ گئی تھی۔

آج وہ پہلی بار عنایہ کے گھر آیا تھا۔ ان کے ایک گروپ فیلو کا نکاح تھا۔ اس کی اور رقیب کی گاڑی میں سب جہلم گئے تھے۔ عنایہ اور مصباح کو گھر پہنچانے کی ذمہ داری اس نے لی تھی۔ لیکن جب وہ جہلم سے راولپنڈی واپس پہنچے تو موسم خراب ہو گیا۔ تیز جھکڑ اور بارش اچانک ہی شروع ہوئی تھی۔ مصباح کو اس کے گھر ڈراپ کر کے عنایہ کے گھر پہنچا تو بارش کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اور اسی وقت ابا جان کا فون آیا تھا کہ اسلام آباد کا موسم بہت خراب ہو گیا ہے۔ اگر وہ جہلم سے نکل آیا ہے تو بہتر ہے کہ شہر میں آپا جان کے گھر رک جائے۔ سگنل نہ ملنے کی وجہ سے زیادہ بات نہیں ہو سکی تھی۔

عنایہ کی ماما نے اسے جانے نہیں دیا تھا کہ موسم اچانک بہت خوف ناک ہو گیا تھا۔ بجلیاں کڑک رہی تھیں اور طوفانی ہوائیں چل رہی تھیں۔ کچھ دیر تو اولے بھی برستے رہے تھے۔ تب اس نے شاویز کو بتا دیا تھا کہ وہ راولپنڈی ہی ایک دوست کے گھر رک گیا ہے۔

کچھ ہی دیر بعد عنایہ واپس آ گئی تھی۔ خوب صورت لبوں پر دلکش مسکراہٹ سجائے اس نے شاہ دل کی طرف دیکھا۔

"ایک بات مانو گے شاہ دل۔"

"ساری زندگی اب تمہاری ہی ماننی ہے یار، کہو۔"

"آج اگر رک جاؤ کل چلے جانا۔"

"کوئی خاص بات ہے کیا۔" اس نے اخبار

ایک طرف رکھ دیا۔

تمہیں رات کو بتایا تھا نا بابا اور بھائی کسی کام سے ملتان گئے ہوئے ہیں۔ آج شام تک آجائیں گے تو بھائی جان تم سے ملنا چاہ رہے تھے۔ رات میری فون پر بات ہوئی تھی تو میں نے بتایا تھا کہ شاہ دل کے ساتھ آئی ہوں اور وہ موسم کی خرابی کی وجہ سے آج رات ادھر ہی رک گئے ہیں۔ وہ صوفہ چیئر پر بیٹھ گئی تھی۔

''لیکن میں تو ایک عام سا ہاؤس جاب یہ ڈاکٹر ہوں، کوئی مشہور سرجن نہیں۔ وہ بھلا مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔ ہاں ہو سکتا ہے مستقبل میں ایسا ہو کہ لوگ مجھ سے شاہ دل شکیل الزماں سے ملنا چاہیں۔'' اس کی خوش نما آنکھوں میں شریر چمک تھی۔

''تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ میں گھر میں کسی سے تمہارے اور اپنے متعلق پہلے ذکر کردوں پھر تم اپنے والدین کو بھیجو گے۔ یوں تو سب دوستوں کا ذکر گھر میں ہوتا رہتا ہے لیکن خاص اس حوالے سے تو تمہارے متعلق کبھی بات نہیں ہوئی تھی تو پھپھو سے میری بہت دوستی اور بے تکلفی ہے تو میں نے پھر انہیں تمہارے متعلق بتا دیا تھا، انہوں نے ہی بھائی جان سے بات کی ہوگی کہ ان دنوں ایک رشتہ آیا ہوا ہے۔ بھائی جان کے سسرالی عزیز ہیں۔

عنایہ کے بھائی کا نکاح ہو چکا تھا۔ آج کل میں شادی ہونے والی تھی۔

''اوہ، کہیں یہ تمہارے بھائی جان کے سسرالی عزیز رقیب روسیاہ ہی نہ بن جائیں۔ میں تو جیتے جی مارا جاؤں گا۔'' وہ کراہا تھا۔

''بس ایکٹنگ ختم کرو شاہ دل، اور اپنے ابا جان کو فون کرو، دیکھو سگنل آرہے ہیں تو انہیں بتا دو کہ آج کسی وجہ سے نہیں آسکتے۔

''تو کیا فیوچر میں بھی ایسے ہی حکم چلایا کرو گی مجھ غریب پر۔'' شاہ دل کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

''میں سنجیدہ ہوں۔''

''جو حکم میم۔'' اس نے ہلکا سا سر خم کیا۔

''آج ہی پھپھو نے مجھے بتایا ہے کہ بھائی جان اور بابا اس رشتے کو لے کر کافی سنجیدہ ہیں۔ انہیں وہ لوگ پسند آئے ہیں......'' عنایہ سنجیدہ بھی تھی اور اندر سے پریشان بھی ''میں چاہتی ہوں کہ اس سے پہلے کہ وہ کوئی فیصلہ کرلیں تم سے مل لیں۔ شاید پھپھو کے کہنے پر ہی بھائی جان نے تم سے ملنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ شاہ دل اگر بابا نے اسے اوکے کردیا تو۔ کتنا مشکل ہوتا ہے نا کہ آپ کے دل میں کوئی اور بستا ہو اور آپ کسی اور کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائیں۔ دل کی کتاب پر لکھا جانے والا پہلا نام کبھی نہیں مٹتا۔ چاہے لاکھ آپ اسے مٹانے کی کوشش کریں۔ اگر بابا نے تمہارے لیے منع کردیا تو میں کیا کروں گی۔ کیسے سروائیو کروں گی۔ منافقت بھری زندگی جینے سے تو مر جانا اچھا ہوتا ہے۔ تم جی لو گے میرے بغیر۔''

عنایہ کو اس طرح سنجیدہ بات کرتے اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔

''تم میری فکر نہ کرو کچھ نہ کچھ کر ہی لوں گا۔ میرے خاندان کی تاریخ میں ناکام عاشقوں کی مثالیں ہیں۔ کسی ایک کے نقش قدم پر چل پڑوں گا۔ میرے ابا جان کے چچا محترم تو گھر ہی چھوڑ کر چلے گئے تھے اس محبت کی خاطر اور خود میرے چاچو صحرا نورد ہو گئے۔ ملکوں ملکوں کی خاک چھانتے پھرتے۔ میں بھی گریبان چاک کرکے جنگلوں میں نکل جاؤں گا۔''

''تم مذاق سمجھ رہے ہو۔'' عنایہ کو اس کی شوخی اچھی نہیں لگی تھی...... ''مجھے تو اپنے والدین کا فیصلہ ماننا ہے چاہے جو بھی ہو۔''

''ہم نے محبت کی ہے یار۔ کوئی بھاڑ نہیں جھونکا۔ اتنی آسانی سے دست بردار نہیں ہوں گا۔ تمہارے والدین کا فیصلہ یقیناً ہمارے حق میں ہی ہوگا......'' وہ جھنجلایا تھا۔ ''اور مجھ میں بھلا کیا کمی ہے کہ تمہارے بابا اور بھائی مجھے رد کردیں گے۔ خوب صورت پڑھا لکھا، اعلیٰ خاندان کا ہونہار سپوت۔'' وہ

پھر شوخ ہوا تھا۔
"شاہ دل تم......"
"اوں ہوں۔ ذرا اپنی عادتیں ٹھیک کرلو۔ یہ "تم وم" نہیں چلے گا۔ "شاہ منزل" میں میری دادی جان ادب آداب کا بڑا خیال رکھتی ہیں۔"
"شاہ دل۔" عنایہ نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ وہ سنجیدہ نہیں ہو رہا تھا۔
"مجھے یقین ہے عنایہ، کہ شاہ کے دل کی مسند پر بیٹھنے والی شہزادی عنایہ ہی اس کے گھر پر بھی راج کرے گی۔ کیونکہ میں نے ہر روز ہر دعا میں تمہیں مانگا ہے۔ اور میرا رب میری دعائیں رد نہیں کرے گا۔" وہ پل بھر کو سنجیدہ ہوا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے پھر شوخ ہوا تھا۔
"ویسے ایک آپشن اور بھی ہے ہمارے پاس گھر سے بھاگ جائیں گے کتنا رومانٹک ہوگا نا۔"
"میں ایسی نہیں ہوں۔" اس نے ایک ناراض سی نظر اس پر ڈالی۔
"تو میں کب ایسا ہوں جاناں۔"
عنایہ کے رخسار گلگوں ہوئے شاہ دل دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا جب عنایہ کی ماما نے انہیں ناشتے کے لیے آواز دی۔ ڈائننگ روم ٹی وی لاؤنج سے ملحق تھا۔ ناشتے کی ٹیبل پر عنایہ کی ماما کے علاوہ اس کا چھوٹا بھائی اور چھوٹی بہن تھے۔ جن سے رات اس کی ملاقات ہو چکی تھی۔ ناشتا خوشگوار ماحول میں کیا گیا۔ عنایہ کی ماما کے ساتھ ہلکی پھلکی باتیں ہوتی رہی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ عنایہ کے گروپ کے ہر فرد کے متعلق ہم ایسے جانتے ہیں جیسے کئی بار مل چکے ہوں۔ عنایہ سب کا ہی ذکر کرتی ہے اور تمہارا تو بہت زیادہ ذکر کرتی ہے۔ اس لیے تم ہمیں بالکل اجنبی نہیں لگے۔ بلکہ عنایہ کے سب دوست بہت اپنے لگتے ہیں ہمیں۔
"ہم سب کے ہاں بھی یہ ہی حال ہے۔ میری اماں جان کتنی بار کہہ چکی ہیں کہ سب دوستوں کو کسی روز بلاؤ۔ لیکن بس میرے گروپ کے ست نکمے لوگوں نے کئی بار پروگرام بنا کے کینسل کر دیا۔
"چلیں، آج بارش کے طفیل ہماری تو آپ سے ملاقات ہوگئی......" عنایہ کی بہن میٹرک میں تھی اور مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھتی ہوئی کچھ شریر سی لگ رہی تھی۔ ورنہ ہمیں تو بس آپ کے ذکر پر ہی ٹرخا رہی تھیں آپی۔
"عنایہ! یہ تو تم نے بڑی زیادتی کی ہماری گڑیا سی بہن کے ساتھ۔ تم بتاتیں کہ اس گڑیا کو ہم سے ملنا ہے تو ہم سب سر کے بل چل کر آتے۔"
"ایک روز رک جاتے بیٹا، تو عنایہ کے بابا سے بھی ملاقات ہو جاتی لیکن تمہارے اماں، ابا بھی تمہاری راہ دیکھتے ہوں گے۔" عنایہ کی ماما نے چائے کا کپ اس کی طرف بڑھایا۔ شاہ دل کو وہ بڑی شفیق اور مہربان سی لگی تھیں۔
"وہ ماما! آج شاہ دل کو اس کے ابا جان نے کوئی کام کہا ہے تو یہ آج نہیں جائے گا۔ میں نے کہا ہے اسے، اب ہوسٹل جانے کے بجائے یہاں ہی رک جائے۔ عنایہ فوراً بولی تھی اور شاہ دل نے اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے کپ ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔
"یہ تو اچھی بات ہے بیٹا، عنایہ صحیح کہہ رہی ہے۔ اب ہوسٹل جا کر کیا کرو گے۔ دوست وغیرہ بھی تو گھروں کو چلے گئے ہوں گے۔
"جی، تقریباً سب ہی چلے گئے ہیں۔"
لاؤنج میں پڑے فون کی گھنٹی بجی اور عنایہ اٹھی تو وہ بھی چائے پی کر اٹھ کھڑا ہوا۔
"بابا کا فون ہے، ماما بات کرلیں۔" عنایہ نے ریسیور ماما کو پکڑا کر اس کی طرف دیکھا۔
"چلو تمہیں اپنا گھر دکھاؤں۔"
"رخصت ہو کر تم نے میرے گھر آنا ہے میں نے نہیں۔ جو......"
"بس فضول باتیں کرتے رہا کرو۔" عنایہ نے اسے گھورا تو اس نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگائے۔
"چلو دکھاؤ اپنا گھر، اب فضول باتیں نہیں

کروں گا۔" وہ شاہ منزل کی خاموشی اور اداسی بھرے ماحول سے آتا تو یوں ہی شوخیاں شرارتیں کر کے خود کو اس اداسی کے حصار سے باہر نکالتا تھا اور اب عادت سی ہو گئی تھی۔

گھر بہت خوب صورت اور ویل ڈیکوریٹڈ تھا۔

"میرے بابا نے بہت محنت کی ہے۔ تقریباً پندرہ سال پردیس میں مزدوری کی میری ماما سے ان کی شادی قطر میں ہی ہوئی تھی۔ بھائی جان کی پیدائش وہاں کی ہی ہے۔ ہم تینوں چھوٹے یہاں پاکستان میں پیدا ہوئے کہ بابا پردیس میں رہتے رہتے تھک گئے تھے۔ اگرچہ پاکستان میں اپنا کوئی تھا نہیں، والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ لیکن انہوں نے پاکستان میں سیٹل ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہاں ماما کے والدین رہتے تھے اور دوسرے عزیز و اقارب۔

ماما کی شادی کے دو تین سال بعد ہی میرے نانا ابو ریٹائرڈ ہو کر واپس پاکستان آ گئے تھے تو ماما کی خواہش تھی کہ یہاں نانا ابو کے گھر کے نزدیک ہی گھر لیا جائے جبکہ بابا کا ارادہ لاہور میں سیٹل ہونے کا تھا۔

"اور جیت تمہاری ماما کی ہوئی۔" وہ باتیں کرتے کرتے فرسٹ فلور پر آ گئے تھے۔ اور وہ آنکھوں میں شرارت لیے رک کر اسے دیکھنے لگا تھا۔

"یہ پھپھو کا بیڈ روم ہے۔" عنایہ نے اس کی بات نظر انداز کی۔

"اوہ ہاں۔ تم نے اپنی پھپھو سے تو ملاقات ہی نہیں کروائی جن کا ذکر کر کر کے تم کان کھا جاتی تھیں۔ اور ہم سب بڑے خلوص سے تمہیں سر عرفان اور پروفیسر کاظمی جیسے کنواروں کے رشتے بتایا کرتے تھے۔"

"دراصل پھپھو آج چھ بجے ہی کالج چلی گئی تھیں۔ انہوں نے ایک تعلیمی ٹرپ پر لڑکیوں کے ساتھ جانا تھا۔ تین دن کا ٹرپ ہے۔" اس نے دروازہ کھولا۔

"لیکن تم تو ابھی کہہ رہی تھیں کہ تمہارے بابا کوئی اپنا نہیں تھا پاکستان میں تو یہ پھپھو۔"

شاہ دل کمرے کو تنقیدی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ سادہ سا لیکن خوب صورت فرنیچر دیوار پر ایک چھوٹی سی شیلف۔

"ایلا پھپھو بابا کی سگی بہن نہیں ہیں۔ دادا ابو کی کزن کی بیٹی ہیں۔ میری دادو اور ماما گھر خریدنے کے بعد پاکستان آ گئے تھے۔ بابا تو بس چھٹیوں میں آتے تھے۔ تیرہ سال پہلے وہ ہمیشہ کے لیے آ گئے تھے۔ دادو کو ایلا پھپھو کے متعلق معلوم نہیں تھا۔ یہاں آنے کے دو سال بعد اچانک ان کی پھپھو سے ملاقات ہو گئی تھی چونکہ ان کے والدین کا بھی انتقال ہو چکا تھا تو وہ انہیں ساتھ لے آئی تھیں۔ میں جب پیدا ہوئی تو پھپھو ادھر ہی تھیں۔ ہمارے لیے وہ سگی پھپھو سے بڑھ کر ہیں۔ ہمارا واحد ددھیالی رشتہ۔ اور انہوں نے بھی ہمیں بہت محبت دی ہے۔ بہت لاڈ اٹھائے ہیں ہمارے عنایہ کے لہجے سے اپنی پھپھو کے لیے پیار جھلکتا تھا۔

"لکی ہو یار۔ یہ لاڈ اٹھانے والے رشتے بڑے انمول ہوتے ہیں۔ میرے ابا جان صرف تین بھائی ہیں۔ اپنی پھپھو سے کہنا تھوڑے لاڈ ہمارے بھی اٹھالیں۔ ہمیں تو حسرت ہی رہی کہ کوئی ہمارے بھی لاڈ اٹھاتا۔"

وہ اب شیلف میں سے کتابیں نکال کر دیکھ رہا تھا جو زیادہ تر شاعری کی۔

"لگتا ہے تمہاری پھپھو کو شاعری سے بہت دلچسپی ہے۔"

"ہاں۔ ایلا پھپھو پڑھاتی تو انگریزی ادب میں لیکن خود اردو میں شعر کہتی ہیں۔" عنایہ بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

"ارے یہ تو تم نے کبھی بتایا ہی نہیں کہ تمہاری پھپھو شاعرہ ہیں۔" وہ کتاب ہاتھ میں لیے لیے بیڈ کے پاس ہی پڑی بیڈ روم چیئر پر بیٹھ گیا۔

"نہیں پھپھو، کوئی مشہور شاعرہ نہیں ہیں۔ بس

کبھی کبھار کالج وغیرہ کے مشاعروں میں کوئی نظم یا غزل پڑھ لیتی ہیں۔ اور کالج میگزین میں ہی چھپوائی ہیں۔"

اس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑی ڈائری اٹھالی۔ اوراق پلٹنے لگی۔

"ہمارے خاندان میں کسی کو شاعری کا شوق نہیں ہے۔ ابا جان نے بتایا تھا کہ ان کے چچا جان کو شاعری سے بہت لگاؤ تھا لیکن پڑھنے کی حد تک البتہ میرے چاچو بقول ابا جان کے تک بندی کیا کرتے تھے اور اچھا شعری ذوق رکھتے تھے۔ البتہ میں تو بہت بدذوق ہوں پورا ایک ہفتہ شعر رٹتا رہا کہ پہلے تمہیں یہ شعر سناؤں گا اور پھر گلاب پیش کرتے ہوئے اپنی محبت کا اظہار کروں گا لیکن عین وقت پر شعر دماغ سے اڑ گیا۔ یاد کرنے کی کوشش میں ٹہنی کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور کانٹا انگلی میں چبھ گیا۔ جلدی سے گلاب ٹیبل پر پھینکا اور مسکرا کر تمہیں دیکھا۔ شعر پھر بھی یاد نہ آیا تو جلدی سے کہہ دیا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں کہ کہیں یہ جملہ بھی دماغ سے پھسل نہ جائے۔"

اس نے عنایہ سے ڈائری لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا جو ہنس رہی تھی۔

"لو بھلا اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔ پہلی پہلی محبت میں حال ایسا ہی ہوتا ہے بندے کا۔"

"اس ہنستے مسکراتے شخص کے سنگ زندگی کا سفر بہت خوب صورت ہوگا۔ عنایہ نے سوچا اور ڈائری اس کی طرف بڑھائی۔

"اس میں پھپھو کی اپنی شاعری نہیں ہے۔ دوسرے شعراء کی نظمیں غزلیں ہیں جو پھپھو کو پسند ہیں۔"

شاہ دل نے ڈائری کھولی۔ کسی نامعلوم شاعر کی بہت خوب صورت نظم تھی۔

کبھی فرصت میں آؤ تو میری ایک نظم سے ملنا۔

مگر اس نظم کا دھاگا۔

تمہاری یاد کا لہجہ بدلتے ہی۔

نہ جانے کیوں الجھ کر ٹوٹ جاتا ہے۔

کبھی تو اس کی سطریں جا بجا بکھری ہوئی ہیں۔

کوئی تکیے کی شکنوں میں۔

بہت ٹوٹی ہوئی نیندوں کی آنکھوں میں پڑی ہیں۔

کوئی دہلیز پہ آہٹ کی بالی کان میں ڈالے کھڑی ہے۔

کوئی رخسار پہ آنسو کی صورت جم گئی ہے۔

کوئی دل سے لبوں تک آتے آتے تھم گئی ہے۔

شاہ دل کے پڑھنے کا انداز اور لہجہ بہت خوب صورت تھا۔ عنایہ دائیں کہنی گھٹنے پر رکھے ہتھیلی پر تھوڑی ٹکائے بہت اشتیاق سے سن رہی تھی۔

"کوئی بک شیلف میں بے چین ہاتھوں سے اٹھا کر بن پڑھے رکھی کتابوں میں پڑی ہے۔

کوئی احساس کی آنکھوں میں کنکر کی طرح اٹکی ہوئی ہے۔

"بہت خوب صورت انتخاب ہے تمہاری پھپھو کا۔" شاہ دل نے آدھی نظم پڑھ کر ڈائری بند کر دی۔

اگر تمہاری پھپھو نے اجازت دی تو میں شاعری کے اس خوب صورت انتخاب کو پڑھنا چاہوں گا۔"

"میں پھپھو سے پوچھ کر تمہیں دوں گی پڑھنے کے لیے۔"

عنایہ نے ڈائری پاس رکھ دی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی اسے بابا جان کو فون بھی کرنا تھا۔ وہ پریشان ہو رہے ہوں گے۔

"ٹھیک ہے تم فون کرلو پھر ذرا نکلتے ہیں باہر۔" وہ تیار ہونے چلی گئی۔

اور واقعی جب اس نے اپنا فون اٹھایا جو نا شتے کے بعد لاؤنج میں اس نے چارجنگ پر لگایا تھا تو ان کی نو مس کالیں تھیں۔

"اوہ میرے خدا!" اس نے فوراً نمبر ملایا۔

معذرت کر کے اپنے آج نہ آنے کا بتایا تو وہ تھوڑے سے مایوس ہوئے۔

"تمہاری اماں جان تو صبح سے انتظار میں بیٹھی ہیں خیر کل جلدی نکل آنا۔" شکیل الزماں کم گو تھے۔ مختصر بات ہی کرتے تھے لیکن سگنلز نہ ملنے کی وجہ سے کال خود ہی ڈراپ ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد عنایہ تیار ہو کر آ گئی تو ماما کو بتا کر وہ گھر سے نکلے۔

آج کا دن اس کی زندگی کے خوب صورت دنوں میں سے ایک تھا۔ دسمبر کے وسط کے اس خوشگوار دن میں انہوں نے شاپنگ کی۔ اسلام آباد میں فیصل مسجد تک کا چکر لگایا اور اس کے لان میں بیٹھ کر ڈھیروں باتیں کیں۔ وہ باتیں جو انہوں نے پہلے کبھی نہیں کی تھیں، محبتوں کا اقرار، عمر بھر ساتھ نبھانے کی باتیں۔ اتنی فرصت سے بیٹھ کر تو انہوں نے کبھی باتیں نہیں کی تھیں۔ اور پھر واپسی پر ٹھہرتے ہوئے ایک آئسکریم کارنر سے آئسکریم کھا کر جب وہ واپس گھر جا رہے تھے تو ان کے دل خوشی اور محبت سے لبریز تھے۔ اور شاہ دل نے اس ساتھ اور خوشی کے دائمی ہونے کی دعا کی تھی۔ اور وہ لمحہ قبولیت تھا۔ دعا نے درِ قبولیت چھو لیا تھا۔ ان کا ساتھ دائمی ہونے والا تھا۔

جب وہ امین آباد پہنچا تو مدتوں بعد شاہ منزل کے در و دیوار پر خوشی پر پھیلائے بیٹھی تھی۔ لیونگ روم میں رونق تھی۔ جیسے آج شاہ منزل کے در و دیوار بھی ہنس رہے تھے۔ سلیم الزماں اور ان کی فیملی، دادا جان وہ سب سے باری باری مل رہا تھا۔ سلیم چچا کے دونوں بیٹوں سے مل کر اس نے شکیل الزماں کے پاس ہی صوفے پر بیٹھے ہوئے گریس فل سے شخص کو دیکھا تھا۔ کنپٹیوں کے پاس تھوڑے سے گرے اور سفید بالوں والے یہ صاحب کون تھے اس نے پہچاننے کی کوشش کی۔

"یہ شاہ دل ہے نورے۔" شکیل الزماں محبت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

"نور چچا"۔" وہ حیران سا ان کے گلے ملا تھا۔

"کل انہوں نے خوشگوار سرپرائز دیا۔" شکیل الزماں بہت خوش تھے۔

سلیم نے بتایا تو تھا کہ جلد سب آئیں گے لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ نور بھی ساتھ ہوگا۔

اس نے خاموشی سے سر جھکائے بیٹھے نور الزماں کو دیکھا تھا۔ مسافتوں کی تھکن ان کے وجود سے جھلکتی تھی۔ خوب صورت آنکھوں کا حزن دل کو مٹھی میں لیتا تھا۔ ابا جان سے اسے معلوم ہوا تھا کہ کئی ملکوں کی خاک چھاننے کے بعد نور چچا ان دنوں کراچی میں کسی کنسٹرکشن کمپنی میں جاب کر رہے تھے۔ سلیم چچا کو ایک روز اچانک اس کمپنی کے آفس میں مل گئے جہاں وہ کسی کام سے گئے تھے۔ بس سلیم چچا انہیں گھر لے آئے ابا جان اور اماں جان سے ملوانے اور پھر یہاں بھی لے آئے۔

دادا جان کی وفات کے بعد اتنے سالوں بعد انہوں نے شاہ منزل میں قدم رکھا تھا تو بیتی یادوں نے یلغار کر دی تھی۔ وہ گھبرا کر باہر نکل گئے۔ اندر چہل پہل تھی۔ ملازموں کے حصے میں بھی ایک رونق سی تھی کچھ پرانے ملازم دنیا سے رخصت ہو گئے تھے اور کچھ تھے جو دوسروں کو نور الزماں کے متعلق بتا رہے تھے۔ شکیل الزماں شہروز کو فون کر کے لیونگ میں آئے تو نور الزماں کو وہاں نہ پا کر انہیں تلاشتے ہوئے باہر آئے تو وہ باہر کے برآمدے میں دو پٹر کوچ پر بیٹھے سامنے احاطے میں نوکروں کے بچوں کو کھیلتے دیکھ رہے تھے۔

"نور! یہاں کیوں آ گئے ہو۔" شکیل الزماں، ان کے قریب ہی بیٹھ گئے تھے۔

"اندر پتا نہیں کیوں دل گھبرانے لگا تھا بھائی۔"

اور شکیل جانتے تھے کہ ان کا دل کیوں گھبرا رہا تھا۔ فون پر مہینوں بعد مختصر سی بات میں وہ بھی ان سے وہ سب کچھ نہیں کہہ سکے تھے جو آج کہنے لگے تھے۔

"رکو گے نا ابھی۔"

''نہیں دو دن تک چلا جاؤں گا۔ سلیم بھائی نے ضد کی اور میں انکار نہ کر سکا۔''

''شہروز بھی دو تین روز تک آنے والا ہے۔ سیٹ کنفرم کروا کے بتائے گا۔ شہری کی شادی تک تو رک جاؤ یار۔''

شہروز کی منگنی سلیم الزماں کی بیٹی سے ہو چکی تھی۔

وعدہ نہیں کرتا لیکن کوشش کروں گا کہ شادی میں شرکت کرلوں۔ سلیم بھائی کے پاس میرے آفس کا نمبر ہے۔ لیکن میں شاید وہاں بھی زیادہ دن نہ رکوں۔ شارجہ کی ایک کمپنی میں اپلائی کرر کھا ہے۔ جاب ہو گئی تو چلا جاؤں گا۔''

''وہ کہیں کسی ایک شہر یا ملک میں ٹک کر نہیں بیٹھتے تھے۔ ابھی تو محبت کی کونپلوں نے دل کی سر زمین پر جھکا ہوا سر بھی نہیں اٹھایا تھا کہ مسل دی گئیں۔ درد دل کا مکین ہو کر ہمیشہ کے لیے وہاں ہی ٹھہر گیا تھا۔

اور جب درد حد سے بڑھتا تو وہ رخت سفر باندھ لیتے لیکن سکون کہیں بھی نہیں تھا۔ پتا نہیں وہ کہاں تھی۔ کہیں بھٹک رہی تھی۔ تھی بھی یا نہیں۔ یہ احساس کئی کئی راتیں انہیں سونے نہیں دیتا تھا۔ اگر کہیں سے کوئی خبر مل جاتی کہ وہ کہیں کسی جگہ مطمئن اور خوش زندگی گزار رہی ہے تو ان کے دل کو بھی سکون آ جاتا۔

''نورے میری جان۔'' شکیل الزماں نے ان کے گرد بازو حمائل کیا۔ ''کب تک خود کو سزا دیتے رہو گے۔ ایسے جرم کی جس کے لیے آپ قصوروار نہیں ہو۔''

''میں نہیں لیکن میرے اپنے تو قصوروار ہیں نا اس کی تباہی میں۔ جانے کن غلط ہاتھوں میں چلی گئی ہوگی۔''

کئی سال انہوں نے ان جگہوں کے بھی چکر لگائے تھے جہاں یوں بے گھر اور کھو جانے والی لڑکیاں غلط ہاتھوں میں چلے جانے کے بعد پہنچادی جاتی تھیں۔

''آپ اچھا گمان بھی تو رکھ سکتے ہو نورے۔ میں نے ہر آن، ہر لمحہ اس کے لیے دعا کی ہے۔ اور دل سے نکلی دعائیں رائیگاں نہیں جاتیں۔ مجھے یقین ہے وہ جہاں بھی ہوگی اچھی جگہ پر ہوگی۔''

''لیکن میں تو دعائیں مانگتے مانگتے تھک گیا ہوں بھائی۔ دعائیں مانگتے مانگتے حلق میں کانٹے پڑ جاتے ہیں زبان سوکھ جاتی ہے لیکن......''

''ابا جان'' شاہ دل دروازہ کھول کر برآمدے میں آیا تو وہ اس کی طرف دیکھنے لگے۔

ابھی شاویز بھائی کا فون آیا ہے وہ شہر پہنچ چکے ہیں۔ چچا جان سے ملنے آ رہے ہیں۔ اور چچا جان آپ یہاں کیوں چلے آئے۔ اندر سب آپ کا پوچھ رہے ہیں۔ شہروز بھائی کی شادی کا پروگرام بن رہا ہے۔ آدھے لوگوں کا خیال ہے کہ بارات یہاں سے کراچی جائے جبکہ آدھے اس حق میں ہیں کہ سلیم چچا بھی یہاں آ جائیں۔ شادی یہاں شاہ منزل میں ہی ہو۔ آپ کا کیا خیال ہے۔''

''جو اکثریت کی رائے ہو۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''میں ذرا قبرستان جا رہا ہوں۔'' انہوں نے شکیل الزماں کی طرف دیکھا۔ ''آپ چلیں گے۔''

اور شکیل الزماں بھی سر اثبات میں ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

دو دن بعد جب سب سیٹنگ میں بیٹھے کھانے کے بعد قہوہ پی رہے تھے تو وہ چپکے سے سیکنڈ فلور کے ٹیرس پر آ گئے تھے۔ آج آسمان صاف تھا۔ اور ستارے بے حد روشن اور چمک دار۔ یہاں جہاں کبھی انہوں نے نجلہ کے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب دیکھے تھے۔ اب وہ نہیں تھی تو دل بہت گھبرانے لگا تھا۔ وہ جلدی واپس جانا چاہتے تھے لیکن سب کے محبت بھرے اصرار قدموں کو زنجیر کرتے تھے لیکن آخر کب تک۔ انہیں جانا تو تھا ہی۔ آج نہیں تو کل۔ اپنی طرف اٹھتی اماں جان کی ملتجی نظریں۔ وہ زبان سے کچھ نہیں کہتی تھیں لیکن

نظریں التجا کرتی تھیں مجھ سے باتیں کرو نور ے، میرے پاس بیٹھو۔ پہلے کی طرح میری گود میں سر رکھ کر لیٹ جاؤ۔ مجھ سے لڑو۔ شکوہ کرو۔ لیکن وہ نظریں چرا لیتے۔ یہ سب برداشت کرنا ان کے بس میں نہیں تھا۔

"بس میں صبح ہی چلا جاؤں گا۔" انہوں نے ٹیرس کے جنگلے پر کہنی ٹکتے ہوئے سامنے دیکھا تب ہی شاویز نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"چاچو! آپ یہاں ہیں۔ ابا جان آپ کو نیچے ڈھونڈ رہے تھے اور پریشان ہو رہے تھے۔"

"آ رہا ہوں۔"

ایک گہرا سانس لے کر وہ سیدھے ہوئے۔ کل تو یوں بھی چلے جانا ہے پھر زندگی میں شاید کبھی یوں ملنا نصیب نہ ہو۔ تو کچھ دیر سب کے ساتھ مل کر بیٹھ جاتے ہیں۔

"میں ابا جان کو بتاتا ہوں آپ اوپر ہیں۔ جلدی آیے گا۔ نیچے سب نے شاہ دل کو گھیرا ہوا ہے لیکن وہ بھی بہت پکا ہے دل کی بات نہیں بتا رہا۔"

شاویز مسکراتا ہوا واپس چلا گیا لیکن وہ کچھ دیر وہاں ہی کھڑے رہے تھے۔ انہیں وہ شام یاد آ رہی تھی جب اماں جان ٹھہر گئی ہوئی تھیں اپنی خالہ جان سے ملنے اور وہ نجلہ کے ساتھ یہاں کھڑے دور سے نظر آتے ہوئے پہاڑوں کو دیکھ رہے تھے اور انہوں نے نجلہ سے کہا تھا وہ کسی روز نجلہ کے ساتھ ان پہاڑوں میں جائیں گے جہاں نمک کی کانیں تھیں۔ اسے کان دکھائیں گیا ور کلر کہار جھیل پر جائیں گے اور حزار کے موروں کو دیکھیں گے اور اسی شام نجلہ نے انہیں ایک خوب صورت نظم سنائی تھی جو اسی روز اس نے کسی میگزین میں پڑھی تھی اور جس کی چند سطریں ابھی بھی ان کے ذہن میں تھیں۔ اسے شاعری سے بہت لگاؤ تھا اور وہ اپنے پسندیدہ شعر ڈائری میں لکھ لیتی تھی۔ انہیں نجلہ سے خوب صورت شعر سننا بہت اچھا لگتا تھا۔ اس کا لہجہ اور شعر پڑھنے کا انداز بہت خوب صورت تھا۔ اپنی مخف پڑھائی میں انہیں خود اچھی کتابیں اور شاعری پڑھنے کا وقت کم ہی ملتا تھا اور وہ نجلہ سے سن لیتے تھے۔

ان دنوں تو اماں جان کو بھی نجلہ کے پاس بیٹھنے اور باتیں کرنے پر اعتراض نہیں ہوتا تھا۔ پتا نہیں ان کے ذہن میں کیا کھچڑی پک رہی تھی اور وہ نجلہ کے ساتھ کیا کرنا چاہ رہی تھیں وہ جان نہیں سکے تھے۔ اس شام کے بعد پھر وہ کبھی نہ اس سے شعر سن سکے تھے نہ اسے دیکھ سکے تھے کہ جب وہ دوبارہ آئے تو وہ نہیں تھی۔ اگر دادی جان ان کے رشتے کی بات نہ کرتیں تو شاید اماں جان اس سے بھی برا کرتیں اس کے ساتھ لیکن۔ وہ دل ہی دل میں آخری بار سنی جانے والی اس نظم کی سطریں دہراتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے تھے۔

زباں کی دھول بن کر پاؤں سے لپٹی ہیں کچھ سطریں۔
کہیں ایک سطر کے اندر شکستہ مان سے بھیگی ہوئی پلکیں پڑی ہیں۔
کوئی اس ادھ جلے سگریٹ میں لپٹی رہ گئی ہے۔
جسے جانے کی جلدی میں پے بن ایش ٹرے میں تم نے چھوڑا تھا۔
اس کی دلکش آواز جیسے آج بھی ساعتوں میں ٹھہری ہوئی تھی۔
کہیں اک سطر میں وہ چاند اٹکا ہے۔
میرے کمرے کی کھڑکی سے جسے تم دیکھ کر شیشے میں الجھا چھوڑ آئے تھے۔

"کس قدر خوب صورت انتخاب تھا اس کا۔" انہوں نے زیر لب کہا اور لیونگ روم میں آ کر شکیل الزماں کے پاس بیٹھ گئے تھے۔

اماں جان اور ابا جان کے سوا سب ہی موجود تھے۔ اور موضوع گفتگو شاہ دل تھا۔

"دیکھیے چچا جان شاہ دل کو......" سلیم الزماں کے بڑے بیٹے ان سے کچھ بے تکلف تھے کہ کراچی میں ان کا سلیم الزماں کے گھر کئی بار آنا جانا ہوا

تھا۔" کتنے گھنے ہیں یہ کسی کو ہوا تک نہیں لگنے دی کہ اپنے لیے لڑکی پسند کیے بیٹھے ہیں۔ اور آج تایا جان سے کہہ رہے ہیں کہ کل اس لڑکی کے والدین کے گھر چلیں رشتہ مانگنے۔"

شاہ دل ہولے ہولے مسکراتا رہا۔ آج صبح ہی عنایہ نے فون کیا تھا بابا اور بھائی نے اسے اوکے کر دیا ہے لیکن حتمی فیصلہ تمہارے والدین سے ملنے کے بعد ہی ہوگا تم انہیں بھیج دو۔ اور اس نے اسی وقت اماں جان اور ابا جان سے بات کر لی تھی۔ انہیں کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ گیلانی سید نہ بھی ہوتے تو انہیں اعتراض نہ ہوتا۔ پہلے ہی سینے پر بہت زخم تھے جن سے خون رستا تھا اب تک۔ طے یہ ہوا تھا کہ کل صبح شکیل الزماں، بلقیس بیگم سلیم الزماں اور ان کی بیوی جائیں گی باقاعدہ رشتہ لینے۔

"چچا جان! آپ نے بھی جانا ہے سب کے ساتھ۔" شاہ دل کسی خیال کے تحت مسکرایا۔

"میں۔ میں بھلا جا کر کیا کروں گا۔" وہ جو غیر دلچسپی سے ان کی باتیں سن رہے تھے چونکے۔

"جو ہم کریں گے یار، بڑے ادب و احترام سے اپنے شہزادے کا رشتہ مانگیں گے۔" سلیم الزماں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"لیکن۔" انہوں نے بے بسی سے انہیں دیکھا۔ وہ تو کل صبح واپس کراچی جانے کا پروگرام بنائے بیٹھے تھے۔ "مجھے تو کل صبح واپس جانا ہے۔ اتنے زیادہ دن کی چھٹی نہیں لی تھی میں نے۔"

"ہرگز نہیں۔" شاویز اپنی جگہ سے اٹھا تھا۔ "ہم آپ کو ابھی کراچی واپس نہیں جانے دیں گے۔ کل شہروز بھی آرہا ہے۔ اور اس نے مجھے کہا ہے کہ اس کے آنے تک آپ کو ہرگز کہیں نہ جانے دوں۔ چچا جان پلیز، ہم پہلی بار آپ سے ملے ہیں اور ابھی جی بھر کر باتیں بھی نہیں کیں آپ کے ساتھ۔ آپ شہروز کی شادی میں شرکت کریں گے۔ اور شہروز آجائے تو شاید شاہ دل کے نکاح یا منگنی کا فنکشن بھی کر دیں تو آپ نے نہیں جانا ہے۔"

"وردی کا احترام کریں چچا جان۔" سلیم الزماں کے چھوٹے بیٹے نے مسکرا کر انہیں دیکھا۔ "گو اس وقت وردی میں نہیں ہیں لیکن ہیں تو وردی والے۔"

"بالکل بالکل شاویز بھائی کی بات مانی جائے۔" سب نے شور مچا دیا۔

"بچوں کا دل رکھ لو یار۔" شکیل الزماں نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"پھر تو چلے ہی جانا ہے کون سا کسی کے کہنے سے رک جانا ہے۔ آپ نے۔"

ان کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ "ٹھیک ہے۔"

"تھینک یو چچا جان۔ تھینک یو شاویز بھائی۔" یکدم شور ہوا۔ اور نم آنکھوں کے ساتھ انہوں نے نور الزماں کا ہاتھ دبایا۔

"شکریہ نور۔ اب صبح ہمارے ساتھ چلنا ہے تمہیں۔"

انہوں نے شکیل الزماں کی طرف دیکھا تو ان کا من بھیگنے لگا۔ اتنے پیارے رشتوں اور محبتوں سے دور رہ کر پتا نہیں وہ خود کو سزا دے رہے تھے یا انہیں۔ ان میں سے تو کسی کا کوئی قصور نہیں تھا۔ یہ تو فاخرہ تھیں۔ جنہوں نے شاہ منزل میں خزائیں بکھیر دی تھیں۔ لیکن جدائیوں کا دکھ تو سب کے ہی حصے میں آیا تھا۔ خاص طور پر شفیق الزماں کی آنکھوں میں جو کرب ٹھہر گیا تھا۔ ان کی طرف دیکھتے ہوئے ان کا دل پھٹنے لگتا تھا۔ لیکن وہ خود کو مجبور پاتے تھے۔

"چچا جان! آپ نے کبھی فیس بک کے ذریعے انہیں تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔" سلیم الزماں کی بیٹی نے جو اپنے فون کے ساتھ مصروف تھی یکدم سر اٹھا کر پوچھا۔

پچیس سالوں میں ٹیکنالوجی نے بے حد ترقی

کرلی تھی اور بڑی تیزی سے۔ پہلے موبائل فون۔ پھر انٹرنیٹ، سوشل میڈیا۔ اور یہ خیال نوجوان نسل کو ہی آسکتا تھا۔ شکیل الزمان نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔

"پورا نام لکھو، والد کا نام بھی۔"

سب ہی اپنے اپنے سیل پر کوشش کررہے تھے۔ لیکن یہاں اس دور دراز علاقے میں اکثر سگنلز کا پرابلم ہوجاتا تھا۔ حالانکہ سب کے پاس اپنا ڈیٹا تھا۔ لیکن نیٹ آن نہیں ہورہا تھا۔ لیکن سب نے سوچ لیا تھا کہ وہ کوشش کرتے رہیں گے۔

"اور پتا نہیں وہ ہے بھی یا نہیں۔"

نور افسردہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے آج تک اس طرح اسے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پتا نہیں انہیں یہ خیال نہیں آیا تھا یا کوئی خوف تھا۔ شرمندگی تھی۔ پھر ابھی تک فون اور انٹرنیٹ متعارف ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔

"میرا خیال ہے اب سب کو سونا چاہیے۔"

شکیل الزماں بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ دن چھوٹے ہیں اور سویرے نکلیں گے تاکہ شام تک واپس آجائیں اور پھر باری باری سب ہی اٹھ گئے تھے۔ شاہ دل نے کمرے میں آکر عنایہ کو فون کیا اور صبح کا پروگرام بتایا۔

"تم بھی آؤ گے کیا؟"

"تو تمہارے گھر تک گائیڈ تو مجھے ہی کرنا ہے احمق، یہ بتاؤ تمہاری پھپھو آگئی ٹرپ سے ہمیں ان خوب صورت خاتون سے ملنا ہے۔"

"ہاں آج شام کو ہی آئی ہیں۔"

"تو تم کل انہیں کالج مت جانے دینا۔ آخر کو تمہارے ہونے والی سسرالی رشتہ دار آرہے ہیں۔ تو ان کا گھر میں ہونا تو بنتا ہے نا۔"

"انہیں ویسے ہی کل ٹرپ کے بعد ریسٹ کی چھٹی ہے۔" وہ ہولے سے ہنسی تھی۔

پھر ٹھیک ہے ذرا کان ادھر لاؤ۔ میرے چچا جان بھی آرہے ہیں ساتھ۔ قسم سے سر عرفان اور پروفیسر کاظمی تو ان کے سامنے پانی بھرتے ہیں۔ کیا زبردست پرسنیلٹی ہے میرے چچا جان کی۔ تمہاری پھپھو کی طرح انہوں نے بھی اب تک شادی نہیں کی۔ ذرا سوچنا، بڑا اچھا کپل ہوگا۔

"دماغ مت کھاؤ، میری پھپھو شادی نہیں کریں گی کبھی بھی۔ غلطی ہوگئی تھی جو ایک بار میں نے گروپ میں شادی کی بات کردی تھی۔"

"خیر شادی تو میرے چچا جان بھی نہیں کریں گے لیکن اچھی بات سوچنے میں کیا حرج ہے۔"

اس نے قہقہہ لگایا تھا اور باہر سے گزرتے شکیل الزماں نے بے اختیار دعا کی تھی۔ "یا اللہ شاہ منزل نے سالوں بعد ایسی بے ساختہ ہنسی سنی ہے۔ ہماری خوشیوں کو سلامت رکھنا اور نور الزماں کے دل کو بھی سکون اور خوشی عطا فرما۔"

اور اپنے کمرے میں بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے نور الزماں بار بار اپنے سیل فون کی اسکرین کو دیکھتے تھے۔ گیلری کھلی تھی۔ دادا اور دادی جان کے ساتھ وہ کھڑی تھی۔ شرمائی شرمائی سی۔

پتا نہیں سلیم بھائی نے یہ تصویر کب بنائی تھی شاید جب وہ کالج میں تھی تب۔ انہیں فوٹو گرافی کا شوق تھا۔ وہ اکثر تصویریں بناتے رہتے تھے۔ ایک ماہ پہلے ہی انہوں نے کچھ تصویریں سینڈ کی تھیں انہیں، جن میں ایک یہ بھی تھی۔ اور پتا نہیں بچے اسے تلاش کر بھی پائیں گے یا نہیں اور اگر کرلیا تو میں اسے کیسے دیکھ پاؤں گا۔ میں ان لمحات کے پل صراط سے کیسے گزروں گا۔

انہیں لگا جیسے ان کے اندر نمکین پانیوں کا آتش فشاں ابل رہا ہے۔ باہر آنے کو بے تاب ۔انہوں نے آنکھیں موند لیں۔ اور کئی سالوں سے خشک ہوئی آنکھوں میں نمی پھیلنے لگی تھی اور سماعتوں میں اس کی دلکش آواز گونجی تھی۔

کوئی ایک سطر اس اک چائے کی پیالی میں
پڑی ہوگی۔
بے جانے کی خواہش میں رکھی ہی رہ گئی
ہے۔
کہیں اک سطر میں خوابوں کا وہ رستہ بھی رکھا
ہے۔
میں جس پر اپنی آنکھیں بھول آئی ہوں۔
کہیں اک سطر کے اندر میری وہ سانس رکھی
ہے۔
تمہاری بے نشاں مصروفیت کے بوجھ سے
جس کو میں اب تک جی نہیں پائی۔

ایک سسکی لے کر انہوں نے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبایا۔

"اور پتا نہیں تمہیں اب بھی شاعری کا شوق ہوگا یا نہیں۔ اور کیا تم اب بھی اپنی ڈائری میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر خوب صورت شعر لکھتی ہوگی۔"

وہ ہاتھوں کی پشت سے آنکھیں پونچھتے ہوئے اٹھ بیٹھے اور سگریٹ سلگا کر ہونٹ سے لگالیا۔ آج ایک اور رت جگا ان کے نصیب میں لکھا جاچکا تھا۔

اپنے بیڈ روم میں جاتے ہوئے عنایہ نے پھپھو کے کمرے میں جھانک کر دیکھا تھا۔

"آپ جاگ رہی ہیں پھپھو۔"

"بس یوں ہی نیند نہیں آرہی تھی تو یہ پڑھ رہی تھی۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑی ڈائری بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھی۔ "تم بھی نہیں سوئی ہو۔"

"میں ذرا نیچے بھائی جان کے کمپیوٹر پر ایک رپورٹ دیکھ رہی تھی دل کی بیماری پر اور یوں بھی مجھے تو لیٹ سونے کی عادت ہے۔" وہ اندر چلی آئی تھی۔ "شاہ دل کو آپ کے شعروں کا انتخاب پسند آیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا پھپھو سے پوچھ کر مجھے ان کی ڈائری دینا پڑھنے کے لیے۔"

"تو لے لو، کل آئے گا نا وہ بھی تو دے دینا۔" وہ مسکرا کر اسے دیکھنے لگیں۔

"اس نے اس میں سے ایک نظم پڑھی تھی بہت اچھی لگی تھی اسے۔ وہی جو ایک بار آپ نے مجھے سنائی تھی۔ وہ ایک نظم کی سطروں والی۔"

"اچھا وہ۔ کئی سال پہلے میں نے پہلی بار وہ پڑھی تھی۔ ایک میگزین میں اور اب چند ماہ پہلے ایک اسٹوڈنٹ کی ڈائری میں لکھی دیکھی تو لکھ لی۔"

ذرا سا غور سے سننا
ریسیور میں تمہارے فون کے شاید میری
آواز رکھی ہو۔
اسے اب پارسل کردو۔
تو میں اس سے بھی کچھ بھیگی ہوئی سطریں
بنالوں گی۔

انہوں نے مدھم آواز میں چند سطریں سنائیں۔ اور ڈائری اس کی طرف بڑھادی۔

"بہت خوب صورت ہے۔ لیکن یار پھپھو۔ مجھے اتنی شاعری کی سمجھ نہیں ہے بس جس لہجے اور انداز میں آپ نے اور شاہ دل نے انہیں پڑھا ہے وہ دل کو اچھا لگتا ہے۔"

"اچھی شاعری ہمیشہ دل کو گرفت میں لے لیتی ہے۔" انہوں نے ڈائری اس کی طرف بڑھائی "اور بے فکر رہو۔ شاہ دل سب کو اچھا لگا ہے اور پھر تمہاری پسند ہے تو اس کا بھی خیال رکھیں گے سب، تو پرسکون ہو کر سوجاؤ۔"

اسے تو پرسکون ہو کر سونے کا کہہ دیا تھا لیکن خود ان کی نیند اڑ گئی تھی۔ اس نظم نے یادوں کے کئی در کھول دیے تھے۔ کتنی خوب صورت شام تھی وہ جب نور نے پہلی بار کھل کر اظہار کیا تھا اور بتایا تھا کہ بہت جلد دادی جان ابا جان سے بات کریں گی۔ ہمارے متعلق۔ اور پھر وہ اذیت ناک رات، لفظوں کے وہ تیر جیسے آج بھی دل میں کھبے ہوئے تھے جو اس رات فاخرہ نے چلائے تھے اور آج بھی اتنی ہی اذیت دیتے تھے۔

اس روز جب ہاسپٹل کے کمرے میں اسے ہوش آیا تھا تو اس نے پروین سے کہا تھا۔ اب وہ

بھی شاہ منزل نہیں جائے گی جہاں اس پر کیچڑ اچھالا گیا تھا۔ اس کی ذات کی تحقیر کی گئی تھی۔ لیکن وہ کہاں جائے گی۔ کون ہے اس کا اس دنیا میں۔ کوئی بھی نہیں۔ کیا کس ادارے میں چلی جائے جہاں لاوارث لڑکیاں رہتی ہیں۔ لیکن اسے ایسے کسی ادارے کا علم ہی کہاں تھا۔ پروین رونے لگی تھی۔

"ایسی باتیں نہ کریں بی بی۔ بڑی بیگم صاحبہ آج تین دن بعد آپ کے ہوش میں آنے کے بعد گھر گئی ہیں۔ سب آپ سے محبت کرتے ہیں لیکن چھوٹی بیگم کے حسد اور جلن سے کیا ہوتا ہے اور میری اماں کہتی ہیں۔ باہر جگہ جگہ بھیڑیے اکیلی لڑکیوں کو ہڑپ کرنے کے لیے بیٹھے ہوتے ہیں۔"

اور وہ دیوار کی طرف کروٹ کر کے لیٹ گئی تھی اور رونے لگی تھی۔ ہولے ہولے۔

"یا اللہ! مجھے کوئی راستہ دکھا۔ میرے پاس اس گھر کے سوا اور کوئی محفوظ ٹھکانا نہیں ہے۔ اور وہاں میں واپس جانا نہیں چاہتی۔ اور تب دستک دے کر وہ سفید بالوں والا شخص اندر آیا تھا۔ پروین پتا نہیں کہاں تھی وہ ڈر گئی تھی۔ اور خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

"بیٹا! میں بخشی ہوں۔ اللہ بخش۔ آپ کے بابا کا ملازم، نوکر۔" وہ بتا رہا تھا اور وہ حیران سی سن رہی تھی۔

آپ کو تو یاد نہیں ہوگا۔ بچپن میں آپ کو گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتا تھا اور آپ بھی مجھے دیکھتے ہی کہنے لگتی تھیں۔ "بابا مجھے اٹھالو۔"

ذہن میں مبہم سے خاکے بن اور بگڑ رہے تھے۔ لیکن کچھ بھی واضح نہیں تھا۔

"مجھے کچھ یاد نہیں ہے پلیز، آپ مجھے بابا کے متعلق بتائیں وہ کہاں ہیں۔"

"بیٹا! آپ کے بابا تو اب اس دنیا میں نہیں ہیں......" بخشی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"نہیں آج شاہ منزل آپ کی ایک امانت آپ کو دینے گیا تھا۔ پتا چلا آپ ہاسپٹل میں ہیں تو پتا پوچھ کر چلا آیا۔

"کیسی امانت......؟" اس نے بے چینی سے پوچھا تھا۔

"آپ کا برتھ سرٹیفکیٹ اور ایک خط جو آپ کے بابا نے آپ کے نام لکھا تھا۔"

اور وہ یکدم کھڑی ہو گئی تھی۔ اسے خیال آیا تھا کہ وہ بخشی چاچا کے ساتھ چلی جائے اس سے پہلے کہ پروین آ جائے۔ وہ باہر شاید پانی لینے گئی تھی لیکن اس کی عادت تھی مریضوں سے گپ لگانے کھڑی ہو جاتی تھی۔

"چاچا! پہلے مجھے یہاں سے لے چلیں۔ مجھے واپس شاہ منزل نہیں جانا۔ مجھے اپنے گھر لے چلیں سارے سوال جواب وہاں جا کر کر لیجیے گا۔"

وہ شاہ منزل کیوں نہیں جانا چاہتی۔ کیا اس کے ساتھ وہاں اچھا سلوک نہیں کیا جاتا۔ یہ سب باتیں بخشی کے ذہن میں آئی تھیں لیکن اس وقت کوئی سوال کیے بنا اسے ہاسپٹل سے لے آیا تھا۔ چادر میں خود کو اچھی طرح لپیٹے وہ اس کے پیچھے چلتی ہوئی ہاسپٹل سے باہر نکل آئی تھی۔

"کیا آپ کا گھر ہے یہاں؟"

"نہیں میرا گھر راولپنڈی میں ہے۔ یہاں ایک سنگی (ساتھی) کے گھر ٹھہرا ہوا ہوں۔ ایبٹ آباد آپ سے ہی ملنے کے لیے جانا تھا۔"

"پھر چاچا......!" وہ پریشان ہو گئی تھی۔

میرا سنگی مزدوری کے لیے گیا ہوگا۔ بیوی بچے نہیں ہوتے یہاں تو ابھی وہاں ہی چلتے ہیں۔ مجھے ساری بات بتائیں کہ کیوں آپ وہاں جانا نہیں چاہتیں۔"

اور جب اس نے ساری بات بتائی تو وہ حیران رہ گئے تھے۔

"لیکن اب تو سب کو پتا چل گیا ہے نا کہ آپ بے نام و نشان نہیں شاہ منزل کے وارثوں

لیں سے ہیں۔ اب شاید فاخرہ بی بی کا رویہ آپ کے ساتھ ایسا نہ ہو۔"

"لیکن مجھے پھر بھی وہاں نہیں جانا چاچا۔ بس آپ مجھے اپنے ساتھ گھر لے جائیں۔ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہیں۔ بہت شدید نفرت اور مجھے ان کی نفرت سے ڈر لگتا ہے۔ میں نے بی ایس سی کیا ہے۔ کہیں جاب کرلوں گی آپ پر بوجھ نہیں بنوں گی۔"

"پتا نہیں اس نے غلط کیا تھا یا صحیح۔ لیکن اس وقت اسے یہ ہی صحیح لگا تھا اور وہ بخشی بابا کے ساتھ راولپنڈی آ گئی تھی۔ گھر میں اس کی بیوی تھی صرف، اولاد نہیں تھی۔ برسوں پہلے اس نے ایک بیوہ عورت سے شادی کی تھی۔"

وہ آ تو گئی تھی لیکن اسے سب یاد آتے تھے۔ دادا جان دادی جان، سلیم بھائی اور شکیل بھائی۔ اور راتوں کو اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگ جاتا۔ بخشی اس کی سرخ آنکھیں دیکھتا تو سمجھاتا تھا کہ وہ شاہ منزل چلی جائے۔ یہاں اس کے دو کمروں کے اس چھوٹے سے گھر میں وہ کیسے رہے گی جہاں زندگی کی کوئی آسائشیں نہیں ہیں۔

"میں رہ لوں گی چاچا۔"

"اب چھوٹی بیگم آپ کو کچھ بھی کہنے کی جرات نہیں کرسکتیں۔"

لیکن وہ انہیں دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ وہاں نورالزماں کے قریب رہ کر دوری کا عذاب نہیں سہنا چاہتی تھی۔ فاخرہ نے اس کے بابا اور ماما کے ساتھ جو کچھ کیا تھا وہ اسے معاف نہیں کرسکتی تھی کبھی بھی نہیں۔ وہ تب بہت بڑی نہیں تھی بیس سال کی ایک جذباتی سی لڑکی ہی تو تھی جس کے پندار پر سخت چوٹ پڑی تھی۔

شاید اس کا فیصلہ غلط تھا۔ اسے واپس چلے جانا چاہیے تھا۔ بعد میں کئی بار اس نے سوچا تھا۔ لیکن گزرا ہوا وقت واپس نہیں آسکتا تھا۔

"مجھے میرے بابا اور ماما کے بارے میں بتائیں چاچا۔" اس نے بخشی بابا کے گھر آنے کے دوسرے دن بعد پوچھا تھا۔

"آپ کے نانا مظفر گیلانی کالج میں پڑھاتے تھے اور آپ کی ماما ان کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ ایمن بی بی جنہیں سب گھر میں مینو کہتے تھے۔ آپ کے نانا سے آپ کے بابا کی ملاقات کب اور کیسے ہوئی اس کا مجھے علم نہیں ہے لیکن وہ اکثر ان کے گھر جایا کرتے تھے۔ بہت سارے اور لڑکے بھی جاتے تھے صاحب جی نے مجھے بتایا تھا۔ وہ بہت بڑے اسکالر ہیں اور ان کا مقصد حیات پاکستان کے نوجوان طبقے کو اسلام، اسلامی تاریخ اور پاکستان کے قیام کی وجوہات سے روشناس کرانا ہے۔ آج کا نوجوان نہیں جانتا کہ پاکستان کیوں نا گزیر تھا۔ بس وہ ان ہی موضوعات پر بات چیت کرتے ہیں۔ کسی کو کوئی کنفیوژن ہو تو لیکچر کے دوران سوال و جواب کا سلسلہ بھی چلتا رہتا ہے۔ ہمیشہ ان کی بیٹھک علم کے پیاسوں سے بھری رہتی ہے اور وہ بھر بھر کے جام لٹاتے ہیں بغیر کسی بخیلی کے ...... دو سالوں میں صاحب جی کا ان کے ساتھ تعلق بہت گہرا ہو گیا تھا۔ وہ اب ویسے بھی کبھی کبھی ویک اینڈ پر ادھر چلے جاتے تھے۔ ان کے متعلق میں نے پوری طرح تب جانا جب میں تقریباً ایک ماہ ان کے گھر رہا۔ وہ تو اس سے کہیں زیادہ بڑھ کر تھے جتنا صاحب جی نے بتایا تھا۔ اقبال کے اور قائداعظم کے پرستار۔ عاشق رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

ان کا تعلق کشمیری سید فیملی سے تھا۔ ان کا اپنا ذاتی کوئی گھر نہیں تھا۔ ہمیشہ کرائے کے گھر میں رہے۔ جب ان کی بڑی بہن جوانی میں بیوہ ہو گئیں تو چھوٹے بچے کے ساتھ وہ تنہا کیسے رہیں گی۔ تو اس خیال سے وہ بہن کے گھر کے ایک پورشن میں کرایہ دے کر رہنے لگے تھے۔ ایک کمرے اور بیٹھک پر مشتمل یہ حصہ ان کے بہنوئی

نے اپنی زندگی میں بھی کرائے پر چڑھا رکھا تھا۔

میں جب گیا ان کے گھر تو وہاں ان کی بیٹی مینو بٹیا، ان کی بہن اور بھانجا رہتے تھے، دراصل ان کے بھانجے کی شادی تھی۔ گھر میں کام بہت تھا تو صاحب جی نے کہا۔ میں ادھر ہی رہوں۔ گھر کا کچن اور دوسرا کام سنبھال لوں۔ تا کہ خالہ جان شادی کی تیاری کر سکیں۔ مینو بٹیا جتنی خوب صورت تھیں اس سے کہیں زیادہ خوب سیرت تھیں۔ وہ پورا گھرانہ ہی محبتوں سے گندھا ہوا تھا۔ سب ہی مجھے اتنی عزت اتنی محبت اتنا احترام دیتے تھے کہ میں شرمندہ ہو جاتا۔ آپ کی ماما دس سال کی تھیں جب ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ اور یہ سب مجھے اس ایک ماہ کے قیام دوران معلوم ہوا تھا۔ شادی کے بعد بھی میں آپا جی اور پروفیسر صاحب سے ملنے جاتا رہتا تھا۔ اور مینو بٹیا تو مجھے اپنی بیٹیوں کی طرح پیاری تھیں جب جاتا اتنی خاطر تواضع کرتیں جیسے میں ملازم نہیں ان کا کوئی عزیز ہوں۔ میں سوچتا رہتا تھا کہ اگر صاحب جی کی شادی مینو بٹیا سے ہو جائے تو کتنا اچھا ہو اور ایک دن میں نے یہ بات صاحب جی سے بھی کہہ دی تو وہ مسکرا دیے تھے۔

"ہمارے لیے دعا کیا کرو بخشی بھائی۔"

اور ایک روز میں نے آپا جی سے بھی یہ بات کہہ دی تھی اور وہ بھی مسکرا دی تھیں۔

"میرا خالد مینو سے تیرہ سال بڑا ہے ورنہ میں مینو کو اپنی بہو بناتی تمہارے صاحب جی بھی بہت اچھے ہیں۔ دعا کیا کرو کہ اللہ ہماری مینو کا نصیب اچھا کرے۔"

ایک روز مجھے صاحب جی نے بتایا کہ۔

"پروفیسر صاحب کو جھوٹا الزام لگا کر کالج سے نکال دیا گیا ہے کہ وہ طلباء کے ذہن خراب کر رہے ہیں۔ اور ان کے ذہن میں وطن سے نفرت کا بیج بو رہے ہیں۔ کیس چل رہا ہے۔ ان شاء اللہ جلدی بحال ہو جائیں گے۔" میں نے ان سے بڑھ کر وطن سے محبت کرنے والا اور کوئی نہیں دیکھا تھا۔

ان دنوں ایک بار پھر صاحب جی نے مجھے ادھر بھیج دیا تھا کہ خالد صاحب کا بیٹا پیدا ہوا تھا گھر میں بہت کام تھا۔ میں ادھر ہی تھا جب فاخرہ بی بی لاہور آئی تھیں اور صاحب جی انہیں پروفیسر صاحب کے گھر مینو بٹیا سے ملانے کے لیے لائے تھے۔ تب فاخرہ بی بی نے آپا جی سے رشتے کی بات بھی کی تھی۔ اور کہا تھا کہ جلد ہی وہ اپنے ساس سسر کے ساتھ باقاعدہ رشتہ لے کر آئیں گی اور انہوں نے تو مینو بٹیا کے ہاتھ پر جاتے ہوئے روپے بھی رکھے تھے۔ پھر میرا اللہ جانتا ہے کہ انہوں نے وہاں جا کر اتنے جھوٹ کیوں بولے تھے۔ صاحب جی کے تو پیپر ہونے والے تھے اور انور انہیں لینے آ گیا تھا۔ وہ بے حد پریشان تھے جب واپس آئے۔ لیکن انہیں امید تھی کہ بڑے صاحب کا غصہ جلد ہی اتر جائے گا تو وہ ایک بار پھر گھر جائیں گے اور ابا جان کو ساری بات بتائیں گے اور انہیں پروفیسر صاحب کے گھر لے کر آئیں گے۔ لیکن تقدیر تو دیکھو بیٹا۔ چند دن بعد آپا جی، پروفیسر صاحب اور خالد صاحب کہیں جا رہے تھے کہ ایکسڈینٹ ہو گیا۔ ٹرک نے ٹیکسی کو ٹکر ماری تھی۔ خالد صاحب، آپا جی اور ٹیکسی ڈرائیور موقع پر ہی ختم ہو گئے تھے لیکن پروفیسر صاحب تین دن زندہ رہے۔ وہ زندگی میں ہی مینو بٹیا کا ہاتھ محفوظ ہاتھوں میں دینا چاہتے تھے۔ غیر رسمی طور پر تو ایک طرح سے فاخرہ بی بی نے رشتہ مانگ ہی لیا تھا۔ وقت نہیں تھا کہ امین آباد جا کر بڑے صاحب جی کو مناتے۔ ہسپتال میں ہی صاحب جی اور مینو بٹیا کا نکاح ہو گیا تھا۔

نکاح کی خبر بڑے صاحب کو شیرے نے دی تھی اور بڑے صاحب نے شیرے کے ذریعے ہی پیغام بھجوا دیا تھا کہ صاحب جی آئندہ امین آباد میں قدم بھی نہ رکھیں۔ وہ انہیں خود اپنے ہاتھوں سے گولی مار کر خود پھانسی چڑھ جائیں گے۔

وہ بڑے مشکل دن تھے۔ صاحب جی نے پیپرز نہیں دیے تھے۔ میں ان دنوں مستقل مینو بٹی کے پاس ہی رہنے لگا تھا۔ صاحب جی نے خود ایک کمرا کرائے پر لے لیا تھا اور نوکری ڈھونڈ رہے تھے۔ عدت کے بعد خالد صاحب کی بیوہ گھر فروخت کر کے بچے کے ساتھ میکے چلی گئی تھیں۔ ظاہر ہے وہ اب اکیلی کیسی رہتیں۔ اچھی تھیں وہ بھی اور ان کے میکے والے بھی انہوں نے مینو کو بھی ساتھ لے جانا چاہا کہ جب تک رخصتی نہیں ہوتی وہ ان کے ساتھ رہے لیکن صاحب جی نے کہا۔

"وہ میری بیوی اور میری ذمہ داری ہے۔"

صاحب جی کو فیصل آباد میں ایک تعمیراتی ٹھیکے لینے والی کمپنی میں نوکری مل گئی تو ہم فیصل آباد آگئے۔ انہوں نے مجھے کہا تھا میں اگر جانا امین آباد چلا جاؤں لیکن میں کیسے چھوڑ کر جاتا۔ وہ مجھ سے عمر میں چند سال ہی چھوٹے تھے لیکن بڑے بھائی کا سامان دیتے تھے مجھے۔ میرا دل انہیں اتنی محنت کرتے دیکھ کر خون کے آنسو روتا تھا۔ مینو نے تو ابھی بی اے بھی نہیں کیا تھا۔ اس کے بھی بی۔ اے کے پیپر ہونے والے تھے۔ وہ کہتی تھیں میں بھی نوکری کر لیتی ہوں لیکن صاحب جی منع کر دیتے۔ گزر بسر ہونے لگی تھی۔ پھر تم پیدا ہوئیں تو ایک اور جگہ پہلے سے بہتر نوکری مل گئی۔ گھر بھی کچھ بہتر کرائے پر لے لیا تھا۔ وہ کوشش کر رہے تھے کہ کہیں باہر جا کر نوکری کر لیں۔ کہ ان دنوں بہت لوگ باہر جا رہے تھے عرب امارات میں لیکن اس سے پہلے ہی انہیں دل کی تکلیف ہو گئی۔ مجھے بیماری کی صحیح تفصیل تو نہیں معلوم لیکن وہ روز بروز کمزور ہوتے جا رہے تھے۔ نوکری چھوٹ گئی تھی۔ فیصل آباد میں مکان کا کرایہ دینا مشکل ہو گیا تو ادھر امین آباد سے نزدیکی شہر میں تھوڑے کرائے پر گھر بھی لے لیا اور صاحب جی نے ایک جگہ چھوٹی موٹی نوکری بھی کر لی۔ لیکن ان سے اب کام نہیں ہوتا تھا۔

مینو بٹی کے پاس تھوڑا بہت زیور تھا۔ ڈیڑھ دو سال وہ بیچ کر صاحب جی کی دوائیاں اور گھر کا خرچ چلا۔ میں روز ان سے کہتا کہ میں امین آباد جا کر بڑے صاحب اور بیگم صاحبہ سے بات کرتا ہوں۔ بیگم صاحبہ میری بات ضرور سنیں گی لیکن صاحب جی منع کر دیتے۔ پھر صاحب جی کی حالت خراب ہو گئی انہیں بڑے شہر کے بڑے ہسپتال میں داخل کروانا پڑا۔ ڈاکٹر نے فوراً آپریشن کا کہا تھا لیکن اتنے پیسے نہیں تھے۔ تب میں نے مینو بی بی سے منت کی تھی کہ وہ شاہ منزل جا کر بڑے صاحب سے بات کریں۔ وہ اتنے سنگ دل نہیں ہیں کہ صاحب جی کی حالت کا سن کر بھی ناراض ہی رہیں۔ میں قصبے تک ان کے ساتھ آیا تھا اور پھر امین آباد والی سوزوکی پر بٹھا کر واپس صاحب جی کے پاس ہسپتال چلا آیا تھا۔ ان دنوں قصبے سے اور شہر سے سوزوکیاں امین آباد تک جاتی تھیں۔ اس رات ٹوٹ کے بارش برسی تھی۔ جب دوسرے روز بھی مینو بی بی واپس نہیں آئیں تو میں نے صاحب جی کو بتا دیا۔ میں ڈر رہا تھا کہ وہ ناراض ہوں گے لیکن وہ ناراض نہیں ہوئے تھے بلکہ کہنے لگے۔

"چلو اچھا ہے۔ مرنے سے پہلے اپنے ابا جان اور اماں جان کو دیکھ لوں گا۔"

ہم نے شام تک ان کے آنے کا انتظار کیا۔ یقین تھا کہ صاحب جی کی بیماری کی خبر سنتے ہی شاہ منزل سے سب اڑتے ہوئے آئیں گے۔ لیکن یہاں تو مینو بی بی بھی واپس نہیں آئی تھیں۔ کہیں ان کو کوئی حادثہ نہ پیش آ گیا ہو۔ بارش تو شہر کے اڈے پر ہی شروع ہو گئی تھی انہیں کئی دنوں سے بخار بھی ہو رہا تھا۔ صاحب جی نے مجھے کہا۔

"بخشی، مینو کا پتا کر کے آؤ جا کر میری فکر نہ کرو۔"

اور میں امین آباد سے سب معلوم کر کے روتا ہوا الٹے قدموں واپس آیا تھا اور صاحب جی نے

کہا تھا۔
''چلو بخشی گھر چلیں۔ جس کے لیے ٹھیک ہونا چاہتا تھا۔ وہ ہی نہیں رہی۔ اب علاج کر کے کیا کروں گا۔ تھوڑی بہت جو سانسیں بچی ہیں وہ پوری کرنی ہیں۔''
''اور ایلا بے بی کیا انہیں آپ کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے روتے ہوئے پوچھا تھا تو وہ مسکرائے تھے۔
''وہ اپنے خاندان میں پہنچ گئی ہے بخشی۔''
مینو بی بی جاتے ہوئے کچھ پیسے جو ان کے پاس تھے مجھے دے گئی تھیں کہ ضرورت ہو شاید اور میں نے ہسپتال کا بل دیا اور ہم گھر آ گئے۔
میں ہر روز امین آباد جانے کے لیے تیار ہوتا لیکن ان کی طبیعت اتنی خراب ہوتی کہ اکیلا چھوڑ کر جانے کو جی نہ چاہتا۔
وہ کہتے تھے۔ ''ذرا طبیعت ٹھیک ہو جائے تو دونوں چلیں گے۔ میری وجہ سے ابا جان اور اماں جان کا دل دکھا اس کی معافی بھی مانگ لوں گا اور اپنی شہزادی کو بھی دیکھ لوں گا۔''
لیکن اس کی تو نوبت ہی نہیں آئی۔ ایک صبح انہوں نے مجھ سے کہا کہ امین آباد جا کر ایلا کے متعلق معلوم کرو۔ وہ وہاں کیسے رہ رہی ہے۔ اگر مطمئن ہو گئے تو ٹھیک ہے ورنہ ساتھ لے آنا۔
میں نے اجازت مانگی کہ میں بڑے صاحب سے مل کر سب بتا دوں لیکن انہوں نے منع کر دیا ابھی نہیں۔ پتا نہیں ان کے دل میں کیا تھا۔ میں سیدھا قبرستان گیا تھا پہلے مینو بی بی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے اور وہاں میں نے تازہ بنی ہوئی قبر کے پاس بیگم صاحبہ اور بڑے صاحب کو دیکھا تھا جنہوں نے آپ کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔ اور آپ کو پیار کرتے ہوئے کچھ کہہ رہے تھے ان کی آنکھوں میں آپ کے لیے محبت اور شفقت تھی۔ میں ذرا سا اور قریب ہوا تو سنا بیگم صاحبہ کہہ رہی تھیں۔
''شاہ جی! اللہ نے ہماری نجلہ مریم ہمیں لوٹا دی ہے۔'' دل بہت مچلا کہ بڑے صاحب کو جا کر بتا دوں کہ یہ جسے آپ نے گود میں اٹھا رکھا ہے آپ کا اپنا خون ہے۔ آپ کو گود میں لینے اور پیار کرنے کے لیے بخشی دل بے قرار ہوا تھا لیکن صاحب جی نے منع کیا تھا اس لیے واپس آ گیا۔ سب سن کر صاحب جی پر سکون ہو گئے تھے۔
''اب میں اطمینان سے مر سکوں گا بخشی۔''
اور پھر میرے ہاتھ جوڑنے اور اصرار کرنے پر مان گئے تھے کہ میں صبح انہیں امین آباد لے جاؤں۔ لیکن اس رات ان کی طبیعت بہت خراب رہی تھی اور انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ۔ ''ایلا جب سمجھ دار ہو جائے اٹھارہ سال کی ہو جائے تو اسے یہ دے دینا۔ اس کا برتھ سرٹیفکیٹ اسے کبھی نہ کبھی اپنی شناخت کی ضرورت پڑے گی۔ ابھی تو مجھے یقین ہے ابا جان اسے قانونی طور پر بھی اڈاپٹ کر لیں گے۔''
''لیکن ابھی کیوں نہیں صاحب جی۔'' میں نے پوچھا تھا تو انہوں نے کہا تھا۔
''سچ بتاؤں بخشی، میرے اندر خوف کا ایک سانپ چند دن سے کنڈلی مارے بیٹھا ہے جب بھی سوچتا ہوں کہ ایلا کی حقیقت ابا جان کو جا کر بتا دوں۔ سر اٹھا کر پھنکارنے لگتا ہے۔ مجھے فاخرہ بھابھی سے خوف آتا ہے۔ انہوں نے میرے ساتھ جو کیا میری بیٹی کے ساتھ نہ جانے وہ کیا کریں۔ شاید انہوں نے یہ سب جائداد کی خاطر کیا ہو تو۔ اگر میں زندہ نہ رہا تو بس یہ امانت اپنے پاس محفوظ رکھنا۔ یہ راز شاہ منزل والوں پر ایلا کے بڑے ہونے تک نہ کھولنا۔''
پھر انہوں نے آپ کی طرف خط لکھا تھا لیکن چند سطریں ہی لکھ پائے تھے۔ ان سے قلم پکڑا نہیں جا رہا تھا۔ اور پھر فجر کی نماز کے بعد انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔
اور چند دنوں بعد میں نے سامان فروخت کر کے گھر کا کرایہ ادا کیا اور لاہور آ گیا۔ خالد

صاحب کی بیوہ کے پاس اور کہاں جاتا میں۔ میں نے تمہارے متعلق یہ ہی بتایا تھا کہ تم دادا دادی کے پاس ہو۔ جب انہوں نے تمہارا پوچھا تھا۔ ان دنوں وہ کچھ پریشان تھیں میں نے محسوس کیا تھا کہ ان کے بھائیوں اور بھابیوں کا رویہ ان کے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہے اوکھے اوکھے سے لگتے تھے سب۔ تب انہوں نے بتایا تھا کہ مکان کی فروخت سے جو رقم ملی کسی اسکیم یا کاروبار میں بھائیوں کے کہنے پر لگائی تھی وہ سب ڈوب گئی تھی۔ وہ نوکری کر کے الگ گھر میں رہنا چاہتی تھیں لیکن ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ والد تھے نہیں والدہ مجبور تھیں۔ تنویر ان کا بیٹا ابھی چھ سال کا تھا اور بھائیوں نے اخراجات زیادہ ہونے کا کہہ کر ایک سرکاری اسکول میں بمشکل ڈالا تھا۔ میرے جانے کے چند ہی دن بعد والدہ سے اجازت لے کر انہوں نے ایک چھوٹا سا گھر کرائے پر لے لیا اور ایک پرائیویٹ اسکول میں نوکری کر لی۔ بمشکل گزارا ہوتا تھا لیکن ہو جاتا تھا۔ گھر پر چھوٹے بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھاتی تھیں۔ صرف بی اے تک تعلیم تھی ان کی کسی سرکاری اسکول میں تو نوکری نہیں مل سکتی تھی۔ تنویر سولہ سترہ سال کی عمر میں ہی بہت سمجھ دار تھا۔ خود بھی ٹیوشن پڑھانے لگا تھا۔ پھر میٹرک کیا تو باہر جانے کے پروگرام بنانے لگا۔ اور ایک دن باہر چلا گیا۔ ماں نے اپنا زیور بیچ کر رقم کا بندوبست کر دیا تھا۔ اور پھر چند سالوں بعد اس نے ماں کو بھی بلا لیا۔ جانے سے پہلے انہوں نے ضد کر کے اپنے اسکول کی ایک آیا سے جو بیوہ تھی میری شادی کروا دی۔ اچھا ہی ہوا۔ اکیلا آدمی تو پاگل ہی ہو جائے۔

ان کے جانے کے بعد میں راولپنڈی چلا آیا یہاں ایک پرانا سنگی تھا اس نے مل میں مزدور بھرتی کروا دیا۔ ان دنوں امین آباد جانے کا سوچ رہا تھا کہ مل میں جھگڑا ہو گیا۔ دو گروپوں میں لڑائی ہوئی تھی۔ میں تو بیچ بچاؤ کرا رہا تھا خواہ مخواہ پھنس گیا۔ اور دو سال سزا ہو گئی۔ اور اب رہا ہوتے ہی سیدھا امین آباد آ گیا۔"

اس نے بہت خاموشی سے بخشی چاچا کی تفصیلی بات سنی تھی۔ اور اتنی ہی خاموشی سے آنکھوں سے آنسو بہتے رہے تھے۔ جی چاہتا تھا دھاڑیں مار مار کر روئے۔ دیواروں سے سر پٹخے۔ اپنے ماں باپ کی تکلیف کا سوچ کر دل پھٹنے لگتا تھا۔ وہ اب شاہ منزل واپس جانا نہیں چاہتی تھی۔ بخشی چاچا اور ان کی بیوی سمجھاتے۔

"ہم بوڑھے ہو چکے کتنی زندگی ہے ہماری۔ ہمیں کچھ ہو گیا تو کیا کرو گی۔"

"جب مجبور ہو گئی تو چلی جاؤں گی امین آباد۔ لیکن ابھی نہیں۔ ابھی کچھ نہیں کہیں۔" اور وہ چپ کر جاتے تھے۔

آس پڑوس کی عورتیں تجسس کرتیں تو ایک روز انہوں نے وہ محلہ چھوڑ دیا۔ اور ایک قدرے بہتر علاقے میں گھر لے لیا۔ وہ گھر پر بچوں کو ٹیوشن پڑھانے لگی۔ یہاں سب کو یہ ہی پتا تھا کہ بخشی چاچا کی پوتی ہے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ یہاں آس پاس نچلے متوسط طبقے کے لوگ ہی رہتے تھے۔ ٹیوشن کی فیس کم دیتے تھے لیکن بخشی کی مزدوری اور اس کی ٹیوشن سے گھر کا کرایہ اور کھانے پینے کا خرچ نکل ہی آتا تھا۔ وہ ایک سال اس گھر میں رہی تھی پھر ایک روز بخشی چاچا کو مارکیٹ میں خالد ماموں کی امی اور ان کی بیوی مل گئیں۔ انہوں نے دو تین ماہ پہلے ہی یہاں گھر خریدا تھا۔ وہ اسے اور بخشی کو اپنے ساتھ گھر لے گئیں۔

"مینو میری رشتے کی نند ہی نہیں بہت اچھی دوست بھی تھی۔ مجھ سے جونیئر تھی ایک سال لیکن دوستی بچپن سے ہی تھی۔ پہلے ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ اور تمہارے واحد ننھیالی رشتہ دار ہم ہی ہیں۔ سو تم ہمارے ساتھ ہی رہو گی۔ میں نہ بھی رہی تو میرا تنویر تمہیں بہنوں والا مان دے گا۔

میری کوئی بیٹی نہیں تھی میں سمجھوں گی اللہ نے مجھے بنی بنائی بیٹی دے دی ہے۔"

اور ان کے بعد بھی تنویر نے اسے وہی عزت اور مان دیا۔ جو بھائی بہنوں کو دیتے ہیں۔ بخشی چاچا اور ان کی بیوی سرونٹ کوارٹر میں رہنے لگے تھے۔ آنٹی ہمیشہ کہتی تھیں کہ بخشی کے ان پر بڑے احسانات ہیں۔ انہوں نے اس وقت ساتھ دیا جب اپنوں نے منہ موڑ لیا تھا۔ تنویر بھائی کی بیوی بھی اچھی تھیں اور بچوں نے سگی پھپھو ہی سمجھا تھا۔ پھر بھابھی اور تنویر بھائی کے مشورے پر ماسٹر کیا اور ایک انٹر کالج میں لیکچرر شپ کرلی تھی۔

باہر ٹیرس پر بلی کودی تھی اس نے چونک کر وقت دیکھا۔ دو بجنے والے تھے۔ زندگی بہت پرسکون تھی لیکن کبھی کبھی دل بہت گھبراتا تھا جیسے آج...... اس نے تکیے پر سر رکھا اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ سب ہی یاد آرہے تھے اور وہ بھی جسے بھلانے کی کوشش میں کبھی کبھی نڈھال ہو جاتی تھی۔

آنسو نکل نکل کر تکیہ بھگونے لگے۔ پتا نہیں پھر وہ کب سوئی تھی۔ آنکھ پھر الارم کی آواز پر ہی کھلی تھی۔

نماز اور قرآن پڑھ کر وہ نیچے آگئی تھی۔ آج کا دن ان کی پیاری لاڈلی عنایہ کے لیے بہت خاص تھا۔ نہیں جانتی تھی کہ آج کا دن اس کے لیے بھی بہت خاص ہونے والا تھا۔ وہ کچن میں مصروف تھی جب عنایہ نے کھلکھلاتے چہرے کے ساتھ آکر بتایا تھا۔

"وہ لوگ آگئے ہیں۔ آپ بھی ڈرائنگ روم میں چلیں نا میرے ساتھ۔ یہ کام ملازم دیکھ لیں گے۔"

اس کو ان کی آمد کا پتا تو چل ہی گیا تھا۔ سوچ رہی تھی کہ کام پورا کر کے ہی جائے گی لیکن عنایہ گھبرا رہی تھی کچھ، تو وہ صافی سے ہاتھ پونچھ کر دوپٹا اچھی طرح سر پر لیتی ہوئی عنایہ کے ساتھ جب ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو وہاں ہی ٹھٹک کر رک گئی۔ بالکل سامنے صوفے پر شکیل الزماں بیٹھے ہوئے تھے۔

"دادا جان ......!" اس کے لبوں سے سرگوشی کی طرح نکلا تھا۔ وہ بالکل دادا جان کی طرح لگ رہے تھے لیکن وہ شکیل الزماں ہی تھے انہیں پہچاننے میں اسے چند ہی لمحے لگے تھے۔ پچیس سال پہلے ان کے بال اور مونچھیں سیاہ تھیں اور آج بالوں میں کہیں کہیں چاندی اتر آئی تھی۔ ان کے بالکل ساتھ سلیم بھائی اور ان کے ساتھ۔ اسے لگا جیسے اس کا دل بند ہو جائے گا۔

وہ بیس سالہ نجلہ مریم اب پینتالیس سال کی باوقار سی خاتون میں ڈھل گئی تھی۔ لیکن ایمن کی بہت زیادہ مشابہت تھی اس میں اور شکیل الزماں نے اتنی بار ایمن کی تصویر دیکھی تھی کہ سب سے پہلے ان کے لبوں سے نکلا تھا۔ "نجلہ ......" پھر سلیم الزماں بے اختیار کھڑے ہوئے تھے۔

"کہاں چلی گئی تھیں آپ...... ہماری محبتوں میں کیا کمی تھی۔ صرف ایک ہستی کی وجہ سے آپ نے ہم سب کی محبتوں سے منہ موڑ لیا۔"

وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ شکیل الزماں نے اس کا سر چوما تھا اور بلقیس بیگم اسے گلے سے لگائے کھڑی تھیں۔ گو بہت تھوڑا ساتھ رہا تھا اس کا ان سے...... بس ایک وہ تھے جو پتھر ہو گئے تھے۔ ساکت بیٹھے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اور اس کا دل جیسے اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ پیشانی پسینے سے تر ہو رہی تھی۔ ڈرائنگ روم میں شور تھا۔ سب بول رہے تھے۔ بلقیس بیگم نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔

تنویر شکیل الزماں کو بتا رہے تھے کہ کیسے وہ بخشی چاچا کے ساتھ رہ رہی تھی اور انہیں کیسے ملی۔ ان کا اس کے ساتھ کیا رشتہ تھا وہ ساری کہانی دہرائی جا رہی تھی جو بخشی چاچا نے اسے سنائی تھی۔ لیکن اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ سماعتیں جیسے

مفلوج ہوئی تھیں۔ نظریں دوسری بار نورالزماں کی طرف نہیں اٹھی تھیں۔ بس یکایک آنکھیں برس پڑی تھیں۔ شکیل الزماں بے اختیار اٹھ کر قریب آئے تھے۔

"بس اب نہیں رونا۔ بہت رو لیا سب نے، اب نہیں۔ اب نہیں۔"

خود ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ سب کی آنکھیں نم تھیں لیکن سب مسکرا رہے تھے۔ سب سے پہلے شاہ دل کی نظر نورالزماں پر پڑی تھی تو وہ تیزی سے اٹھ کر ان کے پاس جا کر بیٹھا تھا۔

"چچا جان۔"

اور وہ جیسے کسی خواب سے چونکے تھے۔ پھر سلیم الزماں بھی اٹھ کر ان کے قریب آ گئے تھے۔ عنایہ نے جو اس فلمی سی چویشن کو بہت انجوائے کر رہی تھی مسکرا کر ایلا پھپھو کی طرف دیکھا۔

"چلیں پھپھو! آپ منہ ہاتھ دھو کر آ جائیں۔ آج کا دن بہت مبارک ہے۔ خوشی کا دن ہے آپ کے لیے...... آپ کے وہ سارے اپنے مل گئے ہیں جنہیں آپ یاد کر کر کے روتی تھیں۔"

وہ ان کی کیفیت سمجھ رہی تھی۔ اس وقت انہیں تھوڑی تنہائی چاہیے تھی تا کہ وہ اس صورت حال کو قبول کر سکیں۔

اور وہ اس کے ساتھ چلتی ہوئی ڈرائنگ روم سے باہر نکلی تو نورالزماں کی نظروں نے اس کا تعاقب کیا وہ آج بھی دل و جان کو اسیر کر سکتی تھی وقت نے اس کا کچھ بہت زیادہ نہیں بگاڑا تھا۔

عنایہ اسے کمرے میں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اور منہ ہاتھ دھوتے ہوئے اس نے ڈھیروں آنسو بہائے تھے۔ دل کچھ ہلکا ہوا تو کمرے میں آ گئی تھی۔ نیچے جانے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا تو ٹیرس پر آ گئی۔ اب جب عمر کی نقدی ختم ہونے والی تھی تو یہ زندگی کے کس موڑ پر...... "اور پتا نہیں نورالزماں کی بیوی کون تھیں۔" اس نے جیسے خود سے ہی کہا تھا۔

"کوئی بھی نہیں......" پیچھے سے عنایہ کی آواز آئی تھی۔ "کیونکہ انہوں نے شادی ہی نہیں کی اور نیچے فیصلہ ہو رہا ہے کہ دونوں نے بہت بن باس کاٹ لیا۔ اب شہروز کی شادی کے ساتھ انہیں بھی ایک کر دیا جائے۔"

"پاگل ہو گئی ہو عنایہ، اب اس عمر میں۔"

"آپ کی عمر کو کیا ہوا ہے۔ میری پھپھو کے لیے تو آج بھی ان کی کولیگز اپنے بھائیوں اور کزنوں کے رشتے لے کر آ جاتی ہیں۔ قسم سے تیس پینتیس سال سے زیادہ عمر کی نہیں لگتیں آپ...... اور یہ ہی حال ہے نور انکل کا ہے۔ بہت شاندار کپل ہو گا آپ کا۔"

اس کے رخساروں پر ہلکی سی سرخی نمودار ہوئی اور اس نے مڑ کر عنایہ کو کچھ کہنا چاہا اور عنایہ کے پیچھے نورالزماں کو کھڑے دیکھ کر فوراً رخ موڑ لیا۔ عنایہ مسکراتی ہوئی واپس مڑ گئی۔ نورالزماں ہولے ہولے چلتے ہوئے اس کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

"نجلہ! سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں۔ کچھ باتیں انسان کے اختیار میں نہیں ہوتی ہیں۔ شاید ہمارے جذبوں میں وہ صدق نہیں تھا۔ محبت میں وہ کشش نہیں تھی جو تمہیں پلٹ آنے پر مجبور کرتی۔ شاید تم نے بھی سوچا بھی نہ ہو کہ تم اپنے پیچھے شاہ منزل میں صرف آنسو چھوڑ آئی تھیں۔ ساری خوشیاں، ساری ہنسی اپنی ساتھ لے آئی تھیں۔ اماں جان کو ان کے جرم کی پاداش میں سب نے اکیلا کر دیا۔ میرے سمیت۔ میں ان سے کبھی نفرت نہیں کر سکا لیکن میں انہیں معاف بھی نہیں کر سکا نجلہ، تو خود کو ان سے دور کر لیا۔"

"میں نے معاف کر دیا تھا، آپ بھی کر دیتے۔" اس نے تڑپ کر انہیں دیکھا تھا۔

"معاف کر دیں انہیں۔ ماؤں کو ان کے قصور کی سزائیں دی جاتی۔"

"تم کہتی ہو تو کر دیا لیکن تم نے معاف کر دیا

تھا تو پلٹ کر یوں نہیں آئیں۔ یوں اتنی کڑی سزا دی سب کو۔ دادی جان کتنا تڑپتی تھیں تمہارے لیے۔ بھائی جان بتاتے تھے تو سوچتا تھا تم نے کیسے سب کو بھلا دیا۔"

"پتا نہیں شاید میں مجرم ہوں۔ آپ سب کی ان آنسوؤں کے لیے سزاوار ہوں جو میری وجہ سے شاہ منزل والوں کی آنکھوں میں آئے۔" اس نے نچلا لب دانتوں تلے دبایا۔

"شاید ہم سب ہی کہیں نہ کہیں اس جرم کے سزاوار ہیں جو ہم میں سے کسی نے نہیں کیا تھا۔ نیچے سب ہمیں ایک کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ اتنا وقت گزر جانے کے بعد شادی اب ایک چھوٹی سی بات ہے۔ میں تمہارے فیصلے کا احترام کروں گا۔ سب ہی کریں گے لیکن تمہارا جو بھی فیصلہ ہوگا۔ تمہیں اب شاہ منزل میں آنا ہے جو تمہارا اپنا گھر ہے۔ مالکوں میں سے ہو تم۔"

وہ خاموش ہو گئے تھے۔ کتنے ہی لمحے خاموشی میں گزر گئے۔ تب بہت آہستہ سے وہ بولے تھے۔

"یاد ہے نجلہ، وہ شام جس کے بعد پھر ایسی شام کبھی نہیں آئی۔ تم نے وہ نظم سنائی تھی۔ وہ تمہاری آواز اور وہ سطریں میری سماعتوں میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئی تھیں۔ کبھی کبھی جب میں بیڈ پر لیٹتا تو مجھے تمہاری مدھ بھری آواز سنائی دیتی تھی۔ یہ میرے تصور کا کمال تھا یا...... اور کل رات جب میں بیڈ پر لیٹا ہوا تھا تو تب بھی اس نظم کی سطریں میری سماعتوں میں اتر رہی تھیں۔"

ابھی دل کی ہتھیلی پر بھی کچھ سطریں پڑی ہیں
بہت نازک ہیں لفظوں سے چھوا تو ٹوٹ جائیں گی
بندھی رکھی ہیں امیدوں کے آنچل سے بھی کچھ سطریں

انہوں نے آہستگی سے بہت نرم لہجے میں پڑھا تو بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔

تمہیں اک سطر کی آنکھوں میں میرا خواب رکھا تھا
تمہاری بے رخی کے پاؤں سے کچلا پڑا ہے
میرے اس خواب کا تاوان کیا دو گے
مجھے تاوان کیا دو گے

وہ اب ان کی طرف دیکھ رہی تھی

"اپنی پوری زندگی اپنی باقی ماندہ زندگی کا ایک ایک لمحہ۔ میں نے اپنی حکمرانی تمہیں سونپی۔ اب تمام عمر مجھ پر حکومت کرنا نجلہ، میری زندگی تمہاری ہوئی۔" وہ پورے جذب سے بولے تھے۔

اور نجلہ مریم کی آنکھوں میں آنسو چمکے تھے اور لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ اور آنسوؤں اور مسکراہٹ کے اس امتزاج کو وہ مبہوت سا ہو کر دیکھ رہے تھے۔ اور ان آنسوؤں اور مسکراہٹ نے قبولیت کی سند دے دی تھی انہیں۔

کہو اس نظم کو عنوان کیا دو گے۔

زیر لب کہتے ہوئے انہوں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

نیچے تاریخیں طے ہو رہی تھیں اور امین آباد کے آسمان پر بادل اکٹھے ہو رہے تھے۔ پانی سے بھرے بادل...... اور شفیق الزماں نے جو شاہ دل کا فون سننے اوپر آئے تھے ٹیرس کی ریلنگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے سامنے پہاڑوں کے اوپر سیاہ امڈتی گھٹاؤں کو دیکھا۔ آج پھر ٹوٹ کر بارش برسنے والی تھی۔ لیکن آج کی بارش شاہ منزل کے لیے سالوں بعد خوشیوں کا پیام لے کر آ رہی تھی۔

نیچے سٹنگ میں شور تھا۔ شاویز اس کی بیوی، سلیم الزماں کے بچے سب مل کر بلند آواز میں گا رہے تھے، تالیاں بجا رہے تھے اور بشارت آنکھوں میں نمی لیے سب کو نجلہ مریم کے متعلق بتاتا پھر رہا تھا۔

شاہ منزل میں قہقہے تھے، ہنسی تھی، شور تھا اور راولپنڈی کے اس گھر میں نجلہ اور نور ابھی تک ٹیرس پر کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے تھے جیسے عمر بھر کی پیاس بجھاتے ہوں۔

☆☆

سالگرہ نمبر



نظیر فاطمہ

عیدی

رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ اپنا نصف مکمل کر چکا تھا۔ روزے اور عبادتوں کے ساتھ ساتھ عید کی خریداری اور عیدی دینے دلانے کا اہتمام بھی کیا جا رہا تھا۔

"فیصل! اس دفعہ طاہرہ کی عیدی کا کیا کرنا ہے؟ کل امی جان پوچھ رہی تھیں۔" نسرین نے فیکٹری جانے کے لیے تیار کھڑے شوہر کو مخاطب کیا۔

مہنگائی نے تو سفید پوش لوگوں کی کمر ہی گویا توڑ دی تھی۔ جن لوگوں کو اچھا بھلا گزارا ہو رہا تھا وہ بھی بے چارے تنگ ہوئے پڑے تھے۔

"کرتے ہیں کچھ، آج فیکٹری میں میٹنگ ہونی ہے جس میں یہ فیصلہ ہوگا کہ اس دفعہ ورکرز کو عید بونس ملے گا یا نہیں۔"

حالات تنگ تھے یا کیا اس دفعہ فیکٹری مالکان کے لیے ورکرز کو ہر سال دیا جانے والا عید بونس دینا مشکل محسوس ہو رہا تھا۔

"اللہ کرے مل ہی جائے بونس، نہیں تو بہت مشکل ہو جائے گی۔ میری اور آپ کی تو خیر ہے مگر طاہرہ کی عیدی اور بچوں کے نئے کپڑے اور جوتے تو چاہییں نا۔" نسرین فکر مند تھی۔ پیسہ دانتوں سے پکڑ کر خرچ کرنے کے باوجود بھی اس دفعہ اس کے پاس کوئی خاص بچت نہیں تھی۔

☆☆☆

"نسرین! طاہرہ کو اس دفعہ عید میں کیا دینا ہے، تم نے کچھ بتایا ہی نہیں۔ میں نے کل بھی بات کی تھی۔" ناصرہ بیگم اکلوتی بیٹی کی عیدی کے لیے فکر مند تھیں۔

"امی جان! فیصل کہہ رہے تھے شاید آج بونس ملنے کے بارے میں پتا چل جائے تو پھر کچھ کرتے ہیں۔"

نسرین کے کہنے پر ناصرہ نے سر ہلا دیا وہ بہو بیٹے کے حالات سے بخوبی واقف تھیں۔ ہر سال تو نسرین رمضان شروع ہونے سے پہلے ہی سب کی عید کی خریداری کر لیا کرتی تھی اور پہلے عشرے میں ہی طاہرہ آپی کی عیدی ان کو دے آتی تھی۔ اس سال پہلی دفعہ ایسا ہوا تھا کہ آدھا رمضان گزر گیا تھا اور کسی کے کپڑے جوتے نہیں آئے تھے۔

☆☆☆

طاہرہ کی شادی کافی کھاتے پیتے گھرانے میں ہوئی تھی۔ اس کے شوہر کا آڑھت کا کاروبار تھا۔ سو مالی خوش حالی اور آسودگی کا راج تھا۔ طاہرہ کا شوہر ذکی دل اور ہاتھ کا کھلا تھا۔ اپنے اردگرد لوگوں اور رشتہ داروں کا خیال رکھتا تھا اور خاموشی سے دوسروں کی مدد بھی کر دیتا تھا۔ طاہرہ کو بھی اس نے کبھی کسی چیز سے نہیں روکا تھا مگر طاہرہ کو ہر سال اپنے میکے سے آنے والی عیدی کا انتظار رہتا تھا۔

"ذکی! اس دفعہ میری عیدی نہیں آئی امی جان کی طرف سے، کل مجھے صبح امی کی طرف چھوڑ دیجیے گا میں ذرا پتا تو کروں، یہ لوگ کیا سوچ بیٹھے ہیں۔" طاہرہ نے رات کو نماز اور نوافل سے فراغت کے بعد اپنے خاوند سے بات چیت کے دوران کہا۔

"اچھا، تم تیار رہنا میں منڈی کا چکر لگا کر تمہیں چھوڑ آؤں گا۔ اب سو جاؤ صبح سحری کے لیے اٹھنا بھی ہے۔" ذکی لیٹ گیا۔

☆☆☆

طاہرہ نے حسب عادت زوردار سلام کر کے اپنے آنے کی اطلاع دی تھی۔ ناصرہ بیگم نے خوشی سے بیٹی کو گلے لگایا اور نسرین نے طاہرہ کو پھیکی سی مسکراہٹ سے دیکھا۔ دونوں نند بھابھی کے تعلقات روایتی نہیں تھے۔ نہ کبھی نسرین نے طاہرہ کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی اور نہ ہی کبھی طاہرہ نے ان کے معاملات میں بے جا دخل اندازی کی تھی۔

"فیصل کی فیکٹری والوں نے اس دفعہ عید بونس دینے سے انکار کر دیا ہے۔ دونوں میاں بیوی پریشان ہو رہے تھے بچوں کے کپڑوں کے لیے۔"

دوپہر کو دونوں ماں بیٹی کو تنہائی میسر آئی تو ناصرہ نے طاہرہ کو فیصل کے حالات سے آگاہ کیا۔

"تمہیں تو پتا ہے دونوں تمہاری عیدی پہلے

عشرے میں ہی دے آتے تھے۔ اس دفعہ ان کا ہاتھ واقعی تنگ ہے تب ہی ابھی تک انہوں نے عیدی کا انتظام نہیں کیا۔"

ناصرہ بیگم کا دل اُداس ہو رہا تھا۔ ان کے ہاں ہر سال اپنی استطاعت کے مطابق سب کے نئے کپڑے، جوتے اور دیگر ضروری سامان آتا تھا مگر اس دفعہ یہ سب ہوتا مشکل لگ رہا تھا۔

طاہرہ نے خاموشی سے ساری باتیں سنیں۔ چار بجے ذکی طاہرہ کو لینے آ گیا۔

"ارے ایسے کیسے جا رہے ہو تم دونوں، افطاری کر کے جانا۔" نسرین کو ان کا یوں جانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"بھابھی! آج نہیں، پرسوں ہفتہ ہے نا تو میں اور ذکی آپ کی طرف افطاری کریں گے۔" طاہرہ نے رسان سے کہا۔

☆☆☆

ہفتے کے روز طاہرہ اور ذکی سامان سے بھرے ڈھیروں شاپر اُٹھائے چلے آئے۔ طاہرہ نے کھانے پینے والی چیزوں کے شاپر نسرین کے ہاتھوں میں دیے اور باقی سارا سامان امی جان کے کمرے میں رکھ دیا اور خود افطاری کی تیاری میں نسرین کا ہاتھ بٹانے لگی۔

افطاری کے بعد نماز اور کھانے کے بعد ذکی واپس چلا گیا۔ طاہرہ ایک دن کے لیے رُک گئی تھی۔ طاہرہ، نسرین اور فیصل امی جان کے کمرے میں بیٹھے ہوئے۔ نسرین کے تینوں بچے باہر برآمدے میں بیٹھے کھیل رہے تھے۔ طاہرہ نے انہیں بھی آواز دے کر اندر بلا لیا۔ سامان سے بھرے شاپر اپنے سامنے رکھے اور ان میں سے سب کے جوڑے، جوتے اور دیگر چیزیں نکال نکال کر دینے لگی۔

"طاہرہ! یہ سب کیا ہے؟" فیصل کو اچھا نہیں لگ رہا تھا یوں چھوٹی بہن سے سب چیزیں لیتے ہوئے۔

"یہ امی جان کا سوٹ ہے، یہ آپ کا، یہ نسرین بھابھی کا اور یہ بچوں کے۔" طاہرہ نے ایک ایک چیز کی طرف اشارہ کر کے گنوایا اور ہنس دی۔

"یہ سب آپ لوگوں کی عیدی ہے۔" طاہرہ نے امی جان کے کندھے پر سر رکھا۔

"بھائی بہنوں کو عیدی دیتے ہیں، بہنوں سے لیتے تھوڑی ہیں۔" فیصل شرمندہ سا تھا اور نسرین بالکل خاموش۔

"میں تو ہر دفعہ ہی عیدی لیتی ہوں آپ لوگوں سے۔ اس دفعہ میں نے سوچا کہ میں آپ سب کو عیدی دے دیتی ہوں۔ جس طرح بہن کا بھائی پر حق ہوتا ہے، اسی طرح بھائی کا بھی بہن پر حق ہوتا ہے اور یہ کہاں لکھا ہے کہ بہن بھائی کو عید نہیں دے سکتی۔"

نسرین طاہرہ کی اچھی سوچ اور نیت کی قائل ہوئی تھی۔ جس نے بھائی اور بھابھی کے حالات کو احساس کر کے ان کے مسائل کو بڑی محبت اور خوب صورتی سے حل کر دیا تھا۔

"مگر پھر بھی۔ ذکی کیا سوچتا ہوگا۔" فیصل نے کچھ کہنا چاہا۔

"ذکی کی طرف سے پریشان نہ ہوں آپ، یہ سب کچھ انہوں نے اپنی خوشی سے مجھے دلوایا ہے۔ اب میں ایک بات نہیں سنوں گی، آپ سب اپنی اپنی چیزیں سنبھالیں، میں عید کے روز آؤں تو آپ سب نے یہی کپڑے پہنے ہوں۔"

طاہرہ نے ہاتھ اُٹھا کر سب کو خاموش کروایا۔

"اور ہاں بھابھی! میں عید پر آؤں تو میرے لیے اچھا سا اہتمام کرنا کھانے پر، آخر کو آپ کی اکلوتی نند ہوں۔ ذرا سی بھی کمی ہوئی تو رولا ڈال دوں گی میں۔"

طاہرہ نے شرارت سے کہا تو نسرین مسکرا دی۔ جانتی تھی کہ نند جب "اچھا سا اہتمام" کہتی تھی تو اس سے مراد مٹر پلاؤ اور رائتے سلاد کے ساتھ آلو کی ٹکیاں ہوتی تھیں۔ یہ دونوں چیزیں اسے بہت پسند تھیں اور وہ یہی کھا کر خوش ہو جاتی تھی۔ گوشت اسے زیادہ پسند نہیں تھا۔

طاہرہ نے بچوں کے چمکتے ہوئے چہرے دیکھے تو اس کے دل میں سکون سا اتر گیا۔

☆☆



قرۃ العین خرم ہاشمی

دیئے ماتھے

"مسز جہانگیر! آپ نے سب ٹیسٹ کروا لیے؟"

عاصمہ فائل ہاتھ میں تھامے پریشان چہرے کے ساتھ ڈاکٹر فرخ کے کمرے میں داخل ہوئی تو انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔ درمیانی عمر کے ڈاکٹر فرخ اپنے شعبے میں بہت مشہور تھے۔ ان کے پاس بہت دور دور سے مریض آتے۔ جہانگیر اور عاصمہ بھی بہت امید لے کر ان کے پاس آئے تھے۔

"جو ٹیسٹ آپ نے لکھے تھے سب کروا لیے ہیں۔ جہانگیر ٹھیک تو ہو جائیں گے ناں؟ انہیں کیا مسئلہ ہے؟ پچھلے ایک مہینے میں ہم کئی ڈاکٹروں کے پاس گئے ہیں مگر آرام نہیں ملا اور......!" فکرمندی سے اپنی کالی چادر کو سر پر ٹھیک کرتے ہوئے وہ بغیر رکے بول رہی تھی۔

"ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ اللہ سے دعا کریں۔"

انہوں نے فائل کھولتے ہوئے سنجیدگی سے کہا تو وہ کرسی پر بیٹھ کر دل میں دعائیں مانگنے لگی۔

"میں نے سب رپورٹس دیکھ لی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ دوائی سے ضرور فرق پڑے گا مگر دوائی ٹائم پر اور بغیر ناغہ کیے دینی ہے۔"

تفصیل سے سمجھاتے ہوئے وہ دوائی لکھنے لگے۔ عاصمہ نے توجہ سے ان کی بات سنی اور سر ہلایا۔

"نیورو ڈس آرڈر کا علاج آسان نہیں ہوتا۔ اس میں کافی وقت اور پیسہ لگتا ہے۔ آپ کو صبر اور تحمل سے یہ ٹائم گزرنا ہوگا۔" انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

"میرے لیے یہ ہی بہت ہے کہ کسی بھی دوائی یا علاج سے جہانگیر تندرست ہو جائیں۔ پچھلے کئی مہینوں سے ہم اس خدشے کے تحت زندگی گزار رہے تھے کہ شاید انہیں برین ٹیومر ہے۔ کئی طرح کے ٹیسٹ اور علاج کے بعد شکر ہے کہ یہ خدشہ اپنی موت مر گیا۔" اس نے پرسکون ہو کر سانس لی۔ ڈاکٹر نے اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"بعض اوقات ایک تکلیف، کسی دوسری تکلیف سے جڑی ہوتی ہے۔ اس لیے بھی صحیح مرض کی تشخیص نہیں ہو پاتی۔ بہر حال آپ نے تمام



ہدایات پر عمل کرنا ہے۔"

انہوں نے فائل بند کر کے عاصمہ کی طرف بڑھائی جسے اس نے ایسے تھام لیا جیسے اس میں زندگی کا نسخہ بند ہو۔ وہ ہسپتال سے باہر نکلی تو امید کے کئی جگنو اس کی بند مٹھی میں جگمگا رہے تھے۔

"کیا کہا ڈاکٹر نے؟"

وہ کونے میں بنے کمرے میں داخل ہوئی تو بستر پر نڈھال لیٹے جہانگیر نے پوچھا۔ وہ مسکرائی اور نرم لہجے میں بتانے لگی۔

"کیا سچ میں میری تکلیف ختم ہو جائے گی؟" وہ ابھی تک بے یقین تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"شکر ہے کہ آپ کی رپورٹس ٹھیک ہیں۔ ہم اس خوف کے سائے میں جی رہے تھے کہ آپ کو برین ٹیومر ہے مگر ایسا نہیں اور......" وہ تفصیل سے بتانے لگی۔

جہانگیر نے نم آنکھوں کے ساتھ رب کا شکر ادا کیا۔

"کل صبح آپ کو ڈسچارج کر دیں گے۔" اس نے کہا تو وہ سر ہلانے لگا۔

"میری بیماری کی وجہ سے ہمارے بچے بہت متاثر ہوئے ہیں۔" اس نے افسردگی سے کہا۔

"وہ دونوں اپنی نانی کے گھر بہت خوش ہیں۔" عاصمہ نے تسلی دی۔

"اور جو پیسے علاج پر قرض لے کر خرچ ہوئے۔ یہ پیسے بھی تو واپس کرنے ہوں گے۔" ایک اور فکر سامنے کھڑی تھی۔

"زندگی ہے تو سب کچھ ہو جائے گا۔ آپ پریشان مت ہوں۔" اس نے تسلی دی تو وہ سر ہلاتا خاموش ہو گیا۔

عاصمہ کی نگاہیں فائل پر لگے نیچے پرچے پر جمی ہوئی تھیں جس پر ڈاکٹر نے نئی دوائیاں لکھی تھیں۔ وہ یہ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ یہ دوائیاں نجانے کتنے میں آئیں گی؟ اس کے پاس پیسے تیزی سے ختم ہو رہے تھے۔

☆☆☆

"بہت تھک گئی ہو؟"

اماں بی نے فکر مندی سے اپنے پاؤں بستر پر رکھ کر نرم ہاتھوں سے دباتے عاصمہ کی طرف دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"شوہر کی بیماری، چھوٹے بچوں اور گھر کی ذمہ داری... میں ہی جانتی ہوں کہ یہ وقت کیسے گزرا ہے۔ ہر لمحہ یہ ڈر کہ جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ میرے سر سے سائبان ہٹ جائے گا، میرے بچے یہ۔ت......!" وہ کہتے ہوئے چپ ہو گئی کہ اپنے بچوں کو یتیم کہنے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔

"اللہ سے اچھی اور خیر کی امید رکھو۔ زندگی میں آزمائشیں آتی اور چلی جاتی ہیں۔ بس اس آزمائش کے دوران ملنے والے سبق اور احساس کو یاد رکھنا۔ یہ زندگی میں بہت کام آتا ہے۔" اماں بی نے نرمی سے بیٹی سے کہا۔

"کیسا سبق؟ بس آزمائش تو اندھیری رات کی طرح سر پر مسلط ہو کر امید کے اجالوں کو چھپا لیتی ہے۔ اس میں کیا یاد رکھنے والا ہوتا ہے۔" اس نے بیزاری سے کہا۔ وہ مسکرا دیں۔

"سب سمجھ میں آ جاتا ہے۔ کسی کے بتانے یا سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ یہ بتاؤ کہ جہانگیر کو ہسپتال سے چھٹی کب ملے گی؟" انہوں نے موضوع بدل دیا۔

''کل تک۔ بس ایک دن اور آپ بچوں کو دیکھ لیجیے گا۔ سچ کہوں تو اس مشکل وقت میں یہ تعاون بہت بڑا تھا۔ عادل اور دعا پانچ، سات سال کے بچے ہیں جو باپ کی بیماری سے پریشان رہتے ہیں کہ ان کا باپ پہلے کی طرح، ان کے ساتھ کیوں نہیں کھیلتا؟ کیوں آؤٹنگ پر نہیں لے کر جاتا۔ میں ان کے معصوم سوالوں کا کیا جواب دوں؟'' اس نے بے بسی سے کہا۔

''تم فکر مت کرو۔ میں انہیں سنبھال لیتی ہوں۔ بچے ہیں پریشان تو ہوں گے۔'' اماں بی خوش تھیں کہ ایک بڑا مرحلہ گزر گیا تھا اور جہانگیر کے گھر آنے سے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

☆☆☆

برآمدے میں موسم سرما کی نرم دھوپ نے اپنا رنگ جمایا تو وہ مالٹوں کی ٹوکری لے کر وہاں آبیٹھی۔ جہانگیر جو پھیلی دھوپ میں امید کا کوئی رنگ تلاش رہا تھا اس کی آمد پر چونک گیا۔ وہ مسکرائی۔ نرم مسکراہٹ چہرے پر سجا کر مالٹا چھیلتے ہوئے ادھر اُدھر کی عام اور سادہ سی گفتگو کرنے لگی۔ اس کی باتوں میں کوئی بھی ایسی بات نہیں تھی جو جہانگیر کے کمزور اعصاب پر بوجھ بن کر اترتی۔ پچھلے گزرے کچھ مہینے بہت مشکل تھے جن کے اثرات آنے والے دنوں پر بھی پڑ رہے تھے مگر پھر بھی وہ ہمت سے زندگی کو بہتر گزارنے کی کوشش کر رہی تھی تاکہ اپنے ساتھ چلنے والوں کو سہارا دے سکے۔ کچھ دیر میں جہانگیر بھی اس کی باتوں میں حصہ لینے لگا۔ وہ مسکرا کر ماضی کی بہت سی باتوں کو دہرا رہا تھا۔

بچے اسکول گئے ہوئے تھے۔

ابھی انہیں باتیں کرتے ہوئے کچھ دیر ہی گزرے تھی جب کال بیل کی آواز پر وہ تیزی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ کچھ لمحوں کے بعد واپس آئی تو اس کے ساتھ بڑی نند شبانہ اور جیٹھانی عالیہ موجود تھیں۔ دونوں جہانگیر کی خبر لینے آئی تھیں۔

''ہم قریبی مارکیٹ آئے تھے۔ سوچا جہانگیر کو بھی دیکھتے جائیں۔ جب سے یہ بیمار ہوا ہے میرا دل بہت بے چین رہتا ہے۔'' شبانہ نے شاپنگ بیگز ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

عاصمہ انہیں جہانگیر کے پاس چھوڑ کر جلدی سے چائے کا انتظام کرنے لگی۔ ویسے تو دونوں پہلے اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ جہانگیر کی خبر لے کر جا چکی تھیں مگر آج ان کا آنا کسی خاص مقصد کے تحت تھا جس کا اندازہ عاصمہ کو جلد ہی ان کی باتوں سے ہو گیا۔ وہ چائے لے کر آئی تو ان تینوں کے درمیان پھیلا تناؤ محسوس کر کے پریشان ہو گئی۔

''اچھا ہوا آپ ملنے چلی آئیں۔ جہانگیر بھی گھر میں اکیلے رہ کر بور ہو جاتے ہیں۔ ان شاء اللہ کچھ دنوں تک دوبارہ آفس جوائن کر لیں گے۔'' عاصمہ نے چائے پیش کرتے ہوئے کہا۔

''بور کیوں ہوتے ہیں؟ تم تو گھر میں ہی ہوتی ہو، کیا شوہر کو کمپنی نہیں دیتیں؟'' عالیہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''خیر عاصمہ کے ہوتے جہانگیر کبھی بور نہیں ہو سکتا۔ ہاں ہمارے یہاں آنے سے شاید بور ہو جائے۔'' شبانہ نے منہ بنا کر کہا۔

''شبانہ باجی! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ میں تو بہت خوش ہوا ہوں آپ کو دیکھ کر۔'' جہانگیر نے جلدی سے کہا۔

''کیا خاک خوش ہوئے ہو؟ بہن کی بات کا مان تو رکھا نہیں۔ جھٹ سے منع کر دیا۔ کہا ہی کیا ہے میں نے؟ یہی کہ تمہاری اکلوتی بھانجی کا اگلے مہینے نکاح ہے۔ تم کوئی چھوٹی گولڈ کی چیز ڈال دینا اپنے وعدے کے مطابق تاکہ میری بیٹی کے سسرال پہ اچھا تاثر پڑے۔ عالیہ تو سونے کا بریسلٹ دے رہی ہے اور......!''

انہوں نے باری باری کر کے سب کے تحفے گنوا دیے۔

جہانگیر کے چہرے پر بے بسی سے ایک رنگ آ رہا اور ایک جا رہا تھا۔ کبھی یہ خواہش اس نے خود ظاہر کی تھی کہ وہ اپنی اکلوتی بھانجی فروا کو ضرور سونے کا تحفہ دے گا مگر تب وہ نہیں جانتا تھا کہ آنے والے وقت کیا دکھائے گا۔

''مگر ہمارے حالات تو آپ کے سامنے ہیں۔

جہانگیر کی بیماری پر بہت پیسہ خرچ ہوا ہے۔ شکر ہے کہ یہ اب ٹھیک ہیں مگر......" عاصمہ نے پریشانی سے کہا۔

"بس رہنے دو۔! حالات کس کے اوپر نیچے نہیں ہوتے۔ اب اس وجہ سے زندگی رک تو نہیں جاتی۔ شادی کون سا روز روز ہوتی ہیں۔" انہوں نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"میں نے تو اسی لیے پہلے ہی کمیٹی ڈال دی تھی تاکہ فردا کی پسند کا تحفہ دے سکوں۔" عالیہ نے خوشامدی لہجے میں کہا۔

دراصل شبانہ کا تعلق بہت امیر گھرانے سے تھا۔ سسرال میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ ان کا احساس کمتری تھا کہ اپنے میکے والوں کا بھرم رکھنے کے لیے ایسی فرمائشیں کرتی رہتی تھیں تاکہ سسرال میں ان کی ناک اونچی رہے۔ عاصمہ اور جہانگیر نے بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ شبانہ باجی کچھ دیر ان کے گھر بیٹھیں اور پھر ناراض ہو کر چلی گئیں۔ جہانگیر بہت دل برداشتہ ہو گیا۔

عاصمہ جو اسے پرسکون کرنے کی کوشش کر رہی تھی سب کچھ ایک لمحے میں بیکار ہو گیا تھا۔

آزمائش کی سب سے بڑی خامی یہ ہوتی ہے کہ یہ کبھی اکیلے نہیں آتی، ایک ساتھ کئی مسئلے ساتھ لے کر چلتی ہے۔ مگر خوبی یہ ہے کہ جب جاتی ہے تو سب خام اپنے ساتھ لے جاتی ہے پھر چاہے وہ خام نیتوں کا ہو، لوگوں کا یا دلوں گا......!

آزمائش کے بعد آنے والی زندگی کبھی بھی پہلے جیسی نہیں رہتی یا تو پہلے سے بہت بہتر ہو جاتی ہے یا پہلے سے بہت بری......!

☆☆☆

"تحفے پیک کر لیے؟"

جہانگیر نے تیار ہوتے ہوئے شیشے میں نظر آتے عاصمہ کے خوب صورت عکس کو دیکھا۔ نفاست سے تیار وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اس کی بات سن کر چونک کر سر ہلایا۔

"پتا نہیں شبانہ باجی کو یہ تحائف پسند آتے بھی ہیں یا نہیں؟" اس نے پریشانی سے کہا۔

"میں نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر مہنگے تحفے خریدے ہیں۔ ہاں سونے کی چیز گفٹ نہیں دے سکا مگر ان تحفوں میں میرا اخلاص شامل ہے۔"

اس نے سنجیدگی سے کہا تو وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

آج فردا کا نکاح تھا۔ وہ ہال میں پہنچے تو ان کا استقبال بہت سرد مہری سے کیا گیا۔ شبانہ کا رویہ بہت سرد تھا جبکہ دوسرے بھائی اور بھابھی کے وہ آگے پیچھے پھر رہی تھیں کیوں کہ وہ دونوں مالی طور پر مستحکم تھے۔ جہانگیر کو محسوس تو ہوا مگر وہ خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

"جہانگیر ماموں! شکر ہے آپ ٹھیک ہو گئے۔ میں نے آپ کے لیے بہت دعا کی تھی۔" اچانک فردا نے پاس آ کر محبت سے اس کے گلے میں بازو ڈالے تو وہ چونک گیا۔

"میری بیٹی کی دعا ہی تھی جو میں ٹھیک ہو گیا۔" اس نے محبت سے کہا۔ ماں کے برے رویے کی تلافی بیٹی نے کر دی تھی۔

"یہ کچھ عام سے تحفے ہیں میری خاص بھانجی کے لیے۔" اس نے کہتے ہوئے خوب صورتی سے سجی باسکٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"اور یہ میرے لیے انمول ہیں۔ کیوں کہ آپ نے محبت سے دیے ہیں۔" وہ خوشی سے کہنے لگی۔ پاس کھڑی شبانہ نے سر جھٹکا اور پھر بہانے سے اسے وہاں سے اپنے ساتھ لے گئیں۔

"شکر ہے یہاں آنے کا مقصد تو پورا ہو گیا۔ فردا کو خوش دیکھ کر۔" اس نے مطمئن ہو کر مسکراتے ہوئے کہا تو عاصمہ نے بھی سر ہلایا۔

دونوں آس پاس سے بے نیاز خود میں مگن باتیں کرنے لگے۔

زندگی میں اکثر دوسروں کا نظر انداز کرنا بہت فائدہ مند ثابت ہوتا ہے کہ نگاہ خود پر مرکوز رہنا سیکھ جاتی ہے۔ ہم جان جاتے ہیں کہ ہماری ذات کا ہونا کتنا اہم ہے پھر چاہے دنیا ساتھ چلے نہ چلے۔

"شکر ہے آج میں نے آخری قرضہ بھی ادا کر دیا۔ یہ سال میرے لیے بہت مشکل ثابت ہوا مگر اللہ نے آسانی عطا کر دی۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ کوئی میٹھی چیز ضرور بانٹ دینا۔" جہانگیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ عاصمہ بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ وہ چونکا۔

"کیا ہوا؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"آپ سچ میں خوش ہیں؟" اس نے سنجیدگی سے سوال کیا۔ جہانگیر نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ حسن بھائی کو فالج کا اٹیک ہوا ہے۔ پچھلے دس دن سے وہ ہسپتال میں داخل ہیں۔" اس نے شبانہ کے شوہر کا نام لیتے ہوئے کہا۔ جہانگیر نے نگاہ چرائی۔

"میں ہسپتال گیا تھا۔ کل دوبارہ چکر لگا لوں گا۔ ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ ان کے علاج میں کافی ٹائم لگے گا۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"میری شبانہ باجی سے بات ہوتی رہتی ہے۔ وہ بہت پریشان ہیں۔ آپ بھی ان سے رابطے میں رہیں۔ اس وقت انہیں ہماری ضرورت ہے۔" عاصمہ نے سنجیدگی سے کہا تو وہ طنزیہ ہنس پڑا۔

"غریب بھائی کی کیا ضرورت ہوگی؟ میں ان کے لیول کا نہیں۔ کیا بھول گئیں کہ چھ مہینے پہلے فروا کے نکاح پر ان کا ہمارے ساتھ کیا سلوک تھا؟" اس نے دکھی لہجے میں کہا۔

"کوئی بات نہیں! درگزر کرنا سیکھیں۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

"تم کیوں سائیڈ لے رہی ہو؟ تمہیں تو خفا ہونا چاہیے تھا۔" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"اماں بی نے آپ کی بیماری کے دوران ایک بات کہی کہ آزمائش سے ملنے والا سبق اور احساس ہمیشہ یاد رکھنا۔ تب مجھے ان کی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی مگر اب جان گئی ہوں جب شبانہ باجی کو بھی اپنی جیسی پریشانی سے گزرتے دیکھا۔ اچانک سے آنے کو پریشانی اور دکھ میں بدل دے، اسے جھیلنا آسان نہیں ہوتا۔ جب کسی دوسرے کو ایسی آزمائش سے گزرتے دیکھو تو کبھی خوش ہو کر یہ مت سوچو کہ یہ ان کا مکافاتِ عمل ہے۔ یہ مکافاتِ عمل نہیں ہوتا بلکہ ان کی آزمائش، ہمارے لیے ری مائنڈر ہوتی ہے۔ ہمیں یہ یاد دلانے کے لیے برا وقت کسی پر بھی آسکتا ہے۔ اس لیے ہمیشہ استغفار کرتے ہوئے لوگوں سے نرم رویہ رکھنا چاہیے۔ باقی ہر ایک اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔"

اس کی بات سن کر وہ کتنی ہی دیر کچھ بول نہیں سکا۔ یہ سچ تھا کہ شبانہ باجی کو پریشان دیکھ کر پہلا خیال اسے مکافاتِ عمل کا ہی آیا تھا مگر اپنی چھوٹی اور گھٹیا سوچ پر شرمندہ ہو کر رہ گیا۔

"بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو آزمائش کے بعد خام سے خالص بنتے ہیں۔ تم ان میں سے ایک ہو۔" اس نے مسکرا کر کہا تو وہ بھی مسکرا دی۔

کچھ دیر کے بعد وہ دونوں ہسپتال پہنچے تو شبانہ بھائی کو دیکھتے ہی تڑپ کر لپٹ کر رونے لگیں۔ جہانگیر بھی نم آنکھوں سے بہن کو تسلی دے رہا تھا۔ اس لمحے شبانہ کو احساس ہوا کہ بہن، بھائی کا رشتہ کتنا خوب صورت اور ہر غرض سے پاک ہوتا ہے۔ انہیں اپنی کچھ مہینے پہلے والی سوچ یاد آئی تو شرمندہ ہو گئیں۔

"اس خوب صورت رشتے کے ترازو کے دونوں پلڑے میں اگر سونے، ہیرے جواہرات سے بھی تول دو تو اس کا پلڑا بھاری ہی رہے گا۔"

بہن بھائی کو ایک کونے میں بیٹھ کر باتیں کرتا دیکھ کر عاصمہ نے مطمئن ہو کر گہری سانس لی تھی۔

"شکر ہے میری آزمائش نے مجھے بے حسی کا پتھر نہیں بنایا بلکہ میرے دل میں ہمیشہ کے لیے احساس کا ری مائنڈر سیٹ کر دیا ہے۔ جو کسی دوسرے کو تکلیف میں دیکھ کر شور مچا دیتا ہے۔"

☆☆

کرن کرن خوشبو

القرآن

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ تمہارے دلوں میں کیا ہے۔ اگر تم صالح بن کر رہو تو وہ ایسے سب لوگوں کے لیے درگزر کرنے والا ہے جو اپنے قصور پر متنبہ ہو کر بندگی کے رویہ کی طرف پلٹ آئے۔ (سورۃ الاسراء-25)

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"قیامت کے دن ایک شخص کو لایا جائے گا اور آگ میں پھینک دیا جائے گا اس کے پیٹ کی انتڑیاں باہر نکل پڑیں گی وہ ان کے گرد ایسے چکر لگائے گا جیسے گدھا چکر لگاتا ہے۔ اہل جہنم اس کے گرد جمع ہو جائیں گے اور کہیں گے، اے فلاں تجھے کیا ہوا ہے تم تو لوگوں کو نیکیوں کی تلقین کیا کرتے تھے اور لوگوں کو برائی سے روکتے تھے تو وہ شخص جواب دے گا کہ، میں لوگوں کو نیکی کی تلقین کیا کرتا تھا پر خود نیکی نہیں کیا کرتا تھا اور لوگوں کو تو برائی سے روکتا تھا پر خود برائی کا ارتکاب کیا کرتا تھا۔ (صحیح مسلم: 7483، جلد نمبر 5)

استقامت کرامت سے بڑھ کر ہے

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک شخص دور سے آپ کی خدمت میں بیعت کرنے کے لیے آیا اور ایک دو ماہ آپ رحمتہ اللہ علیہ کے پاس رہنے کے بعد بیعت کیے بغیر واپس جانے کے لیے تیار ہوا تو آپ نے دریافت کیا:

"کس غرض سے آئے تھے، واپس کیوں جا رہے ہو؟"

"اس نے عرض کی: حضرت بیعت کی غرض سے آیا تھا اب واپس جا رہا ہوں کیونکہ میں نے اتنی مدت آپ کے پاس رہنے کے باوجود آپ کی کوئی کرامت نہیں دیکھی۔"

حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ نے دریافت فرمایا: "کیا تم نے اتنی مدت میں میری زندگی کا ایک لمحہ بھی خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی میں گزرتے دیکھا؟"

اس نے جواباً عرض کیا: "نہیں۔"

آپ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا: "ہمارے پاس اس سے بڑھ کر کوئی کرامت نہیں۔"

یہی سبب ہے کہ صوفیاء کرام کے ہاں یہ قول مشہور ہے کہ:

"استقامت کرامت سے بڑھ کر ہے۔"

افشاں سمیع۔ کراچی

ہمت مرداں

فرانسیسی ناول نگار جان ڈومینیک مکمل طور پر مفلوج تھا، وہ بول بھی نہیں پاتا تھا۔ اس نے تقریباً ایک سو پچاس صفحات پر مشتمل ایک کتاب لکھی، اپنی بائیں آنکھ کی پلک کو حرکت دے کر۔ ایڈیٹر ہر بار اسے حروف تہجی کے ترتیب سنائی جس حرف کو وہ چاہتا کہ لکھا جائے وہ بائیں آنکھ کو جھپکاتا یہاں تک کہ حروف الفاظ بنے، الفاظ جملے اور جملے مضمون بن کر کتاب کی تکمیل کرتے رہے وہ روزانہ چھ گھنٹے

صرف آدھے صفحے کی لکھائی میں گزارتے۔ اس ناول کا نام تھا ”ڈائیونگ بیل اینڈ بٹر فلائی۔“
فوزیہ ثمر بٹ۔ گجرات

مظلوم کون

شوہر کا میسج آیا ”پاستا نہیں ہے۔“
بیوی کا ریپلائی: ”ہاں تو کیا ہوا روز روز مرے تو نہیں ہو سکتے نا۔ کبھی لنچ میں سینڈوچ بھی چل جاتا ہے۔ آپ نے تو مجھے فوڈ فیکٹری سمجھ لیا ہے۔ نیت ہی نہیں بھرتی آپ کی۔ کبھی بروسٹ کبھی تکہ کبھی زنگر کبھی پزا۔ بچوں کا لنچ الگ سے بنانا ہوتا ہے پھر صبح کی اٹھی گھر کے لاتعداد کام۔ آپ کے ابو کا پرہیزی کھانا بھی بناتی ہوں۔ کپڑے آپ کو لانڈری کے نہیں پسند اتنے خوب صورت ہاتھ تھے میرے۔ برتن کپڑے دھو کر بالکل ستیاناس ہو گیا۔ گھر چمکتا ہونا چاہیے۔ ماسی پر اعتبار نہیں۔ اتنا نہیں ہوتا کہ چھٹی والے دن جالے ہی اتار دیں یا بچوں کو نہلا دیں۔ میرا ماسٹرز تو بیکار گیا۔ میری نوکری چھڑوا کر اپنے گھر کی ملازمہ بنا لیا ہے۔ کسی ٹیوٹر سے آپ مطمئن نہیں ہوتے۔ بچوں کی پڑھائی بھی میری ذمہ داری۔ آئے دن آپ کے خاندان والوں کی مہمان نوازی۔ انسان ہوں میں روبوٹ نہیں۔ اگر آپ کسی کی بیوی ہوتے تو پتا چلتا۔“
شوہر کا جواب آیا: ”تم نے جو آفس سے واپسی میں سامان لانے کی لسٹ دی تھی اس میں پاستا نہیں ہے، باقی سب لے لیا ہے۔“

معلومات عامہ

☆ جنت ساتوں آسمانوں کے اوپر ساتوں آسمانوں سے جدا ہے کیونکہ ساتوں آسمان قیامت کے وقت فنا اور ختم ہونے والے ہیں جبکہ جنت کو فنا نہیں۔ وہ ہمیشہ رہے گی۔ جنت کی چھت عرش رحمٰن ہے۔
☆ جہنم ساتوں زمین کے نیچے ایسی جگہ ہے جس کا نام ”سجین“ ہے۔ جس زمین پر ہم رہتے ہیں یہ پہلی زمین ہے، اس کے علاوہ چھ زمینیں اور ہیں جو ہماری زمین کے نیچے، ہماری زمین سے علیحدہ اور جدا ہیں۔
☆ ”سدرۃ المنتہیٰ“ سدرۃ عربی میں بیری کے درخت کو کہتے ہیں۔ المنتہیٰ یعنی آخری حد، یہ بیری کا درخت وہ آخری مقام ہے جو مخلوقات کی حد ہے۔ اس سے آگے حضرت جبرائیل علیہ السلام بھی نہیں جاتے۔
طیبہ شوکت۔ مریدکے

غدار

سلطان محمود غزنوی کے پاس ایک شخص ایک چکور لایا جس کا پاؤں نہیں تھا۔ جب سلطان نے اس سے چکور کی قیمت پوچھی تو اس شخص نے اس کی قیمت بہت مہنگی بتائی۔
سلطان نے حیران ہو کر اس سے پوچھا: ”اس کا پاؤں بھی نہیں ہے پھر بھی اس کی قیمت اتنی زیادہ کیوں بتا رہے ہو؟“
وہ شخص بولا: ”جب میں چکوروں کا شکار کرنے جاتا ہوں تو یہ چکور بھی شکار پر ساتھ لے جاتا ہوں وہاں جال کے ساتھ اسے باندھ لیتا ہوں تو یہ بہت عجیب سی آوازیں نکالتا ہے اور دوسرے چکوروں کو بلاتا ہے۔ اس کی آوازیں سن کر بہت سے چکور آ جاتے ہیں اور میں انہیں پکڑ لیتا ہوں۔“
سلطان محمود غزنوی نے اس چکور کی قیمت اس شخص کو دے کر چکور ذبح کر دیا۔
اس شخص نے پوچھا: ”اتنی قیمت دینے کے باوجود اس کو کیوں ذبح کیا؟“
سلطان نے اس پر تاریخی الفاظ کہے۔
”جو دوسروں کی دلالی کے لیے اپنوں سے غداری کرے اس کا یہی انجام ہونا چاہیے۔
اقراء خضر۔ تونسہ شریف
☆☆

بشریٰ محمود



طیبہ شوکت کی ڈائری میں تحریر ایک خوب صورت غزل

تم گزرو اور وقت نہ ٹھہرے، ایسا تھوڑی ہوسکتا ہے
یاد آؤ اور درد نہ بھڑکے، ایسا تھوڑی ہوسکتا ہے

صبر کیا ہے، شکر کیا ہے، راضی ہو کر دیکھ لیا ہے
لیکن دل کو چین آ جائے، ایسا تھوڑی ہوسکتا ہے

ترک محبت کر لینے سے ترک محبت ہو بھی جائے
کوئی اسے جا کر سمجھائے، ایسا تھوڑی ہوسکتا ہے

جب تم نے سب راز کی باتیں، گوش موج ہوا سے کہہ دیں
شاخ و شجر تک بات نہ پہنچے، ایسا تھوڑی ہوسکتا ہے

گزرا لمحہ گزر گیا ہے، اس پر اشک بہانا کیسا
مٹھی میں پانی آ جائے، ایسا تھوڑی ہوسکتا ہے

پہلے جیسا نہیں کچھ بھی، اس پہ تعجب کرنا کیسا
دھوپ ڈھلے اور رنگ نہ بدلے، ایسا تھوڑی ہوسکتا ہے

فشاں سمیع کی ڈائری میں تحریر

امجد اسلام امجد کی غزل

جیون کھیل نہیں جاناں!
آگ اور پانی، پھول اور شبنم، دھرتی اور اس نیل گگن کا
کوئی میل نہیں جاناں!
جیون خواب نہیں جاناں
ہم کو بھی معلوم ہے لیکن اب اس غم کو سہہ جانے کی
دل میں تاب نہیں جاناں!
جیون روگ نہیں جاناں!
لیکن وہ جو مرہم بن کر ہر ایک زخم سلا دیتے تھے
اب وہ لوگ نہیں جاناں!
جیون شام نہیں جاناں!
سورج سے مجبور ہو تم بھی شاید سمت بدل لینے پر
یہ الزام نہیں جاناں
جیون آگ نہیں جاناں!
اپنی سندرتا کی لو میں اپنے آپ ہی جل جاتے ہیں
جن کے بھاگ نہیں جاناں!
جیون ڈھول نہیں جاناں!
تیز ہوا کی آہٹ سن کر شاخ سے اپنی کٹ جائے
یہ ایسا پھول نہیں جاناں!

اقصیٰ شہزاد کی ڈائری میں تحریر

مجذوب ثاقب کی غزل

یہ میری آنکھ کا پانی اور میں
کتنے مخلص ہیں، تیری ہجر کہانی اور میں

اب تیری یاد میں روتے ہیں بہت ہم تینوں
گھر کے کمرے کا دیا، رات کی رانی اور میں

مجھ کو تنہائی، اسے شہر کے چوراہے سے عشق
لڑتے رہتے ہیں سدا میری جوانی اور میں

کوئی بھی در مجھے پابند نہیں کر پایا
ساتھ رہتے میری نقل مکانی اور میں

ایک دوجے کو بہت دیر تلک تکتے رہے
اس کی آنکھوں میں اترتے ہوئے معنی اور میں

پھر نئے عشق کا انجام ہوا تنہائی
پھر وہی دشت وہی راہ پرانی اور میں

☆☆

کچھ موتی چنے ہیں...... ادارہ

موذی

ہمیں غور وفکر کی لت لگانے کے بعد انہوں نے آنا جانا موقوف کر دیا جو اس بات کی علامت تھی کہ وہ واقعی تائب ہو گئے ہیں اور کسی سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے، بالخصوص سگریٹ پینے والوں سے (انہی کا قول ہے کہ بڑھیا سگریٹ پیتے ہی ہر شخص کو معاف کر دینے کو جی چاہتا ہے خواہ وہ رشتے دار ہی کیوں نہ ہو) میں گیا بھی تو کھنچے کھنچے رہے اور چند دن بعد ایک مشترکہ دوست کے ذریعے کہلوایا کہ ”میں نے برائے مجبوری سگریٹ پینے کی قسم کھائی تھی تو آپ سے اتنا بھی نہ ہوا کہ زبردستی پلا دیتے۔ میں ہوں مجبور مگر آپ تو مجبور نہیں۔“

سات مہینے تک سگریٹ اور سوسائٹی سے اجتناب کیا لیکن خدا بڑا مسبب الاسباب ہے، آخر ایک دن جب وہ وعظ سن کر خوش خوش گھر لوٹ رہے تھے تو انہیں بس میں ایک سگریٹ لائٹر پڑا مل گیا۔ چنانچہ پہلے ہی بس اسٹاپ پر اتر پڑے اور لپک کر سگریٹ کا ڈبا خریدا (ہمیں اس واقعے پر قطعاً تعجب نہیں ہوا۔ اس لیے کہ گزشتہ کرسمس پر انہیں کہیں سے نائلون کے موزے چار آنے رعایت سے مل گئے تھے جن کو ”میچ“ کرنے کے لیے انہیں ایک دوست سے قرض لے کر پورا سوٹ سلوانا پڑا) سگریٹ اپنے جلتے ہوئے ہونٹوں میں دبا کر لائٹر جلانا چاہا تو معلوم ہوا کہ اندر کے تمام پرپرزے غائب ہیں اب ماچس خریدنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا۔ ہم نے اکثر یہی دیکھا کہ مرزا پیمبری لینے گئے اور آگ لے کر لوٹے۔ دوسرے دن اچانک غریب خانے پر گاڑھے گاڑھے دھوئیں کے بادل چھا گئے جن میں مرزا کا مسکراتا ہوا چہرہ رفتہ رفتہ طلوع ہوا۔ گلے شکوے تمام ہوئے تو نتھنوں سے دھواں خارج کرتے ہوئے بشارت دی کہ سگریٹ میرے لیے موجب نشاط نہیں، ذریعہ نجات ہے۔

(مشتاق احمد یوسفی۔ چراغ تلے)
نوشی مغل...... جلال پور بھٹیاں

ہم لوگ

ہم پیمانے بناتے رہتے ہیں لیکن خود کو ماپنے کا وقت نہیں رکھتے۔ شاید حوصلہ نہیں رکھتے۔ ہم آئینے بناتے ہیں۔ آئینوں میں خود نہیں جھانکتے۔ ہم توقعات رکھتے ہیں کہ لوگ ہمارے معیار پر پورا اتریں، ہمارے تقاضوں کو پورا کریں لیکن ہم خود کسی کی خواہش پر پورا نہیں اترتے ہم اپنی خامیوں کو بھی تقدیر بھی کہہ لیتے ہیں اور اپنی قسمت کو تو اپنا حق سمجھتے ہیں۔

(واصف علی واصفؒ...... حرف حرف)

تنزل

”دنیا میں قومیں اور جماعتیں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ اور بظاہر یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ قومیں ابھرتی ہیں تہذیبیں پیدا ہوتی ہیں پھر مٹ جاتی ہیں۔ افراد اور جماعتیں اٹھتی ہیں اور نئی ہل چل پیدا کر دیتی ہیں پھر آہستہ آہستہ ان میں انحطاط پیدا ہو جاتا ہے پھر ان کا شیرازہ آہستہ آہستہ بکھرنے لگتا ہے۔ افراد باہمی تعاون وتعامل کمزور پڑ جاتا ہے۔ طوائف الملوکی کا دور آتا ہے اور پھر یہ چھوٹی چھوٹی تنظیمیں اور حکومتیں امتداد زمانہ کے ساتھ آبی بلبلوں کی طرح ایک ایک کر کے بیٹھ جاتی ہیں۔ اور ایک بار سلطنت میں زوال آنا شروع ہو گیا تو اس میں نئی زندگی ڈالنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ جس طرح ہر چیز کی ایک عمر ہوتی ہے اس طرح حکومتوں کی بھی عمر ہوتی ہے۔

(مقدمہ ابن خلدون)
صائمہ ریاض...... فیصل آباد

رمضان اور صحت

رمضان المبارک میں صحت کا خیال رکھنا چاہتی ہیں تو ان احتیاطی تدابیر پر عمل کیجیے آپ کے چھوٹے بڑے مسائل چٹکی بجاتے حل ہو جائیں گے۔

☆افطاری کا آغاز تین کھجوروں سے کریں کیونکہ کھجوریں فائبر حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں اہم وٹامنز اور نیوٹریئنٹس کے لیے سبزی کا استعمال کریں۔ کھانا آہستہ آہستہ اور چبا کر



کھائیں۔اس طرح آپ زیادہ کھانے سے بچ سکتے ہیں۔

☆دہی انسانی صحت کے لیے مفید ترین غذا میں سے ایک ہے، خاص طور پر پیٹ کی تکلیف میں دہی بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ اور معدے کی تیزابیت کا امکان کم ہوتا ہے۔سحر و افطاری میں آپ دہی کی یہ لسی بنا کر پئیں۔

ترکیب:۔دہی ایک پیالی، چھوٹی الائچی دو عدد، ثابت پودینہ ایک چمچہ۔ برف ڈال کر بلینڈ کریں۔

☆رمضان المبارک میں انجیر ضرور استعمال کریں۔

☆رمضان میں لوکی ضرور استعمال کریں۔اس میں چھیانوے فیصد پانی ہوتا ہے اس لیے یہ پیاس بجھاتی ہے۔ایک عدد لوکی ابال لیں۔ سفید زیرہ ایک چمچہ، ٹھنڈا پانی ایک پیالی، نیاز بو کے 25 پتے، تخم بالنگا ایک چمچہ۔ان سب کو بلینڈ کر کے افطار میں پئیں۔

☆آپ کا روزہ اچھا گزرے اور آپ کو پیاس بھی نہ لگے۔اس کے لیے سحری میں یہ شربت پئیں

تلبینہ

ملیٹھی پاؤڈر دو چمچے، گلوکوز دو چمچے، پودینہ 25 سے 30 پتے، تخم بالنگا ایک چمچہ اور ٹھنڈا پانی ڈیڑھ لیٹر۔ان تمام چیزوں کو گرینڈ کر کے ٹھنڈے پانی میں مکس کر کے پئیں۔

☆افطار کے لیے یہ شربت بنائیں۔ املی آدھا کپ۔ آلو بخارا ایک کپ۔ سفید زیرہ ایک چمچہ (پاؤڈر) سونٹھ ایک چمچہ (پاؤڈر) اور مصری دو چمچے۔آلو بخارا بھگو کر اسے مل کر پیسٹ بنا لیں۔املی کو بھگو کر اس کا پلپ الگ کریں۔ایک لیٹر پانی میں، میں تمام اجزاء ملا کر شربت بنائیں۔اور ٹھنڈا ٹھنڈا پئیں۔

☆رمضان میں پانی کم پینے سے اکثر قبض ہو جاتا ہے اس کے لیے جو کا دلیہ بہترین ہے۔جو سے تیار کی جانے والی سب سے بہترین غذا "تلبینہ" ہے اس میں غذائیت بہت ہوتی ہے۔ سحری میں اسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔اس کے لیے جو سو گرام دودھ اور شہد حسب ذائقہ۔جو کے دلیہ کو پکائیں جب گل جائے تو اس میں دودھ ملا کر گھوٹیں اور آخر میں شہد ملا کر میٹھا کریں۔

☆☆

کرنچی چیز اسٹک ◊ دہی بڑا مسالا

کرنچی چیز اسٹک

اجزاء

چکن	ڈھائی سو گرام
پیاز	ایک عدد درمیانی
بڑی ثابت لال مرچ	چھ عدد
چیز سلائس پیکٹ	ایک عدد
نمک	حسب ضرورت
تیل	تلنے کے لیے
پسی کالی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
مکھن	ایک کھانے کا چمچہ
کارن فلیکس	دو پیکٹ
انڈا	ایک عدد
اسٹک	حسب ضرورت

ترکیب:۔

انڈے میں ایک چٹکی لال مرچ اور نمک ملا کر پھینٹ لیں۔ چیز سلائس کو ایک انچ اسکوائر میں کاٹ لیں۔ کارن فلیکس کو ہاتھ سے موٹا موٹا کوٹ لیں۔

چاپر میں لہسن، پیاز اور لال مرچ کو چاپ کر لیں۔ پھر اس میں چکن ڈال کر مزید چاپ کریں۔ چکن کو ایک پیالے میں ڈال کر۔ نمک، کالی مرچ اور مکھن ڈال کر اچھی طرح ملائیں۔ اور اس کے چھوٹے چھوٹے بالز بنائیں۔ اسٹک میں پہلے چکن بال ڈالیں پھر چیز کا چھوٹا اسکوائر ٹکڑا اور پھر ایک اور چکن بال ڈالیں۔ اس طرح تمام بالز کی اسٹک تیار کر لیں۔ اسٹک کو پہلے انڈے میں ڈبوئیں اور پھر کارن فلیکس اچھی طرح لپیٹ کر سنہرا ہونے تک تل لیں۔

☆☆

دہی بڑا مسالا



اجزاء

زیرہ	تین کھانے کے چمچے
ثابت دھنیا	تین کھانے کے چمچے
ثابت لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
اجوائن	آدھا چائے کا چمچہ
لونگ	چار عدد
ناٹری	چار عدد
کھٹائی پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
کالا نمک	ایک چائے کا چمچہ
پسی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	آدھا چائے کا چمچہ
چکن پاؤڈر	آدھا کھانے کا چمچہ

ترکیب:۔

زیرہ، ثابت دھنیا اور ثابت لال مرچ کو ہلکی آنچ پر دو منٹ بھون لیں اور گرائنڈر میں دردرا پیس لیں۔ اجوائن، لونگ اور کالی مرچ کو ہلکی آنچ پر دو منٹ بھونیں۔ اور گرائنڈر میں باریک پیس لیں۔ پھر اس میں باقی سارے مسالے ملائیں۔ اور آخر میں زیرہ ثابت دھنیا اور لال مرچ والے مسالے میں ملا دیں۔

اسپیشل پزا رول



ہالف مون سموسہ

اجزاء

آلو	چار عدد
پیاز	دو عدد
شملہ مرچ	ایک عدد
کیچپ	چار کھانے کے چمچے
کٹی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
ہری مرچ	پانچ عدد
ہرا دھنیا	دو کھانے کے چمچے
میجک مسالا (میگی)	ایک پیکٹ
پسی کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
اوریگانو	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ضرورت
ٹماٹر	دو عدد درمیانے
بریڈ سلائس	پانچ عدد
موزریلا چیز	100 گرام
میدہ	آدھا کپ
کارن فلور	آدھا کپ
آئل	تلنے کے لیے

ترکیب:۔

آلو کو کدوکش کر لیں پیاز، شملہ مرچ، ہرا دھنیا، ہری مرچ اور ٹماٹر کے بیج نکال کر باریک کاٹ لیں۔ بریڈ سلائس کے کنارے نکال کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیں۔ ایک پین میں آلو ڈالیں۔ پھر اس میں چیز کے علاوہ تمام اجزاء ملا دیں۔ اگر آمیزہ نرم ہو تو بریڈ سلائس اور ملا دیں۔ اچھی طرح ملا کر اس میں چیز شامل کر دیں۔ چیز کو بھی اچھی طرح ملائیں۔ چھوٹے چھوٹے تین انچ لمبے رول بنا لیں۔ ایک پیالے میں میدہ، کارن فلور میں پانی ملا کر گاڑھا سا بیٹر بنا لیں۔ رول کو اس بیٹر میں ڈبو کر تیل میں سنہرا ہونے تک تل لیں۔

☆☆

اجزاء

میدہ	آدھا کپ
آئل	حسب ضرورت
پیاز	ایک عدد
پسا ادرک لہسن	ایک چائے کا چمچہ
چکن	ڈیڑھ سو گرام
تل یا بریڈ کرمب	حسب ضرورت
ہری مرچ	دو عدد
پسی کالی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
کٹی لال مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
شملہ مرچ	ایک کپ
گاجر	ایک کپ
کارن فلور	دو کھانے کے چمچے
ڈبل روٹی کے سلائس	حسب ضرورت

ترکیب:۔

میدہ میں پانی ملا کر گاڑھا سا بیٹر بنا لیں۔ شملہ مرچ، گاجر، ہری مرچ اور پیاز کو چوکور باریک کاٹ لیں۔ ایک پین میں دو چمچ تیل کے ڈالیں۔ اس دو منٹ پیاز بھونیں پھر چکن ملا دیں۔ اس میں تیس سیکنڈ کے لیے ادرک لہسن کے پیسٹ کو بھونیں پھر اس میں چکن ڈالیں۔ مسلسل ہلاتے ہوئے چکن کا رنگ سفید ہونے تک بھون لیں اس میں ہری مرچ ۔شملہ مرچ، گاجر دیسی کالی مرچ کٹی لال مرچ ملا دیں۔ تین سے چار منٹ کے بعد ایک پیالی پانی میں کارن فلور ملا کر چکن میں ملا دیں۔ جب یہ آمیزہ گاڑھا ہو جائے تو چولہا بند کر دیں۔ ڈبل روٹی کے سلائز کو بیلن کی مدد سے چپٹا کر لیں اور ان کو کسی گلاس کی مدد سے گول کاٹ لیں۔ اس میں چکن کی فلنگ رکھیں اور میدے کے بیٹر سے اسے پیک کر دیں۔ اس میدے کے بیٹر میں ہالف مون کو ڈپ کریں اور بریڈ کرمب یا تل لگا کر تیل میں سنہرا ہونے تک تل لیں۔

☆☆

چہرے پر کیل مہاسے، دانے ہونا سننے میں تو عام سی بات لگتی ہے لیکن پاکستانی معاشرے میں اکثر افراد بالخصوص خواتین کو انتہائی نامناسب باتیں سننے کو ملتی ہیں۔

کیل مہاسوں کے مہنگے علاج پر توجہ دینے کے بجائے آپ مختلف سستے گھریلو نسخوں کے نتیجے میں جلد قدرتی طریقے سے شفاف ہوجاتی ہے۔

لہسن کے ایک جوے استعمال سے قبل اس پر چند کٹس لگائیں پھر اسے دانوں پر مسل لیں۔

مولی کے پانی کو چہرے پر لگانے سے بھی کیل مہاسوں کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔

کیلے کو پیس کر تھوڑے سے خربوزے کے بیجوں میں شامل کرکے چہرے پر لگانے سے بھی کیل مہاسوں کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔

سبز چائے میں جراثیم کش اور اینٹی آکسائیڈنٹس اجزاء ہوتے ہیں جو کیل مہاسوں کے خلاف مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اس کا فائدہ اٹھانے کے لیے سبز چائے کو ایک کپ پانی میں ابال کر ٹھنڈا کرکے فیس واش کے طور پر استعمال کریں یا کسی کپڑے میں بھگو کر متاثرہ جگہ پر رکھ دیں۔

ایک چائے کے چمچے شہد کو متاثرہ جگہوں پر لگائیں یا آدھے کپ شہد کو ایک کپ دلیے میں مکس کرکے ماسک بنائیں اور آدھے گھنٹے تک چہرہ پر لگا رہنے دیں۔

پودینہ چہرے کے مساموں پر اکٹھا ہوجانے والے تیل کو ہٹانے میں مدد دیتا ہے اور کیل مہاسوں کو بننے ہی نہیں دیتا۔ دو چائے کے چمچے باریک کٹے تازہ پودینے کو دو چائے کے چمچے دہی اور جو کے دلیے (جسے پیس کر سفوف کی شکل دے دیں) میں ملا لیں۔ اس مکسچر کو چہرے پر دس منٹ تک لگا رہنے دیں اور پھر پانی سے دھولیں۔

اسپرین میں موجود سیلی کائی لیک ایسڈ کیل مہاسوں کے لیے بہترین ثابت ہوتا ہے اور مہاسوں کو خشک کرکے سوجن کو کم کرتا ہے۔ اس کے فائدہ اٹھانے کے لیے اسپرین کو چند بوند پانی میں ڈال کر ایک پیسٹ بنالیں، یا اسپرین کی چار گولیوں کو دو چائے کے چمچے پانی میں ملادیں اور متاثرہ جگہ پر لگائیں۔

گھیکوار بھی کیل مہاسوں کے لیے فائدہ مند ہے، جو انفیکشن کے خلاف لڑتا ہے اور زخموں کے نشانات بھی مندمل کرتا ہے۔ گھیکوار کے پودے سے لیس یا جیل کو ایک چمچے میں لیں اور متاثرہ جگہ پر لگائیں۔

لیموں نئے کیل مہاسوں کو ابھرنے کی روک تھام کرنے کے ساتھ ساتھ جلد کی شفافیت کے لیے بہترین ہے۔ لیموں کے عرق میں روئی کو ڈبوئیں اور کیل مہاسوں پر دبا کر رکھ لیں اور کچھ دیر بعد اسے ٹھنڈے پانی سے دھولیں۔

سیب کے سرکے اور پانی کی یکساں مقدار کو ملائیں اور اسے روئی کے ذریعے جلد پر لگائیں، تاہم ہر بار استعمال سے قبل اسے اچھی طرح ضرور ہلالیں۔

اور میگا تھری فیٹی ایسڈز میں سوجن کش خوبیاں ہوتی ہیں جو کیل مہاسوں کو کم کرتی ہیں۔ اس کے لیے مچھلی اور اخروٹ وغیرہ کو اپنی غذا کا حصہ بنا کر آپ یہ فائدہ حاصل کرسکتے ہیں۔

☆☆



مدیرہ کرن

نامے میرے نام

اقصیٰ شہزاد...... تلہ گنگ

اس بار کرن 18 کو ملا سرورق بس ٹھیک ہی تھا۔ "اداریہ" آپ کی باتوں سے سو فیصد متفق ہیں۔ آس پاس جو کچھ ہو رہا ہے سن کے روح کانپ جاتی ہے۔ پتا نہیں لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ "حمد و نعت" پڑھ کے اپنا "مقابل آئینہ" پڑھا۔ سب کو کیسا لگا ضرور بتایئے گا۔ "انمول رتن" ماں کی دعا، جنت کی ہوا۔ آخر یہ روحیل ہی کام آیا۔ "تاش گھر" پتا نہیں باریشہ کے ساتھ کیا ہوگا۔ آپی التمش کا ذکر دوبارہ ہوگا یا وہ باب ختم ہو گیا۔ "کبھی مسکراؤ" اس طرح مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ دلہن کی سلامی تو دلہن کی اپنی ہی ہوتی ہے اس کی مرضی وہ کسی کو دے یا نہ دے۔ "شب ہجر" ام اقصیٰ کا ناولٹ بس ٹھیک ہی تھا۔ ویسے ان کے زیادہ تر اسٹوریز کے ایسے ہی نام ہوتے ہیں۔ "تیری یاد آئی تیرے جانے کے بعد" یہ سچ ہے انسان کی قدر اس کے جانے کے بعد ہی آتی ہے۔ "ایک لمحہ جاؤداں" عقیلہ ہاشمی کا مکمل ناول کوئی خاص نہیں تھا۔ موضوع وہی پرانا۔ ہاجرہ عمران کا افسانہ اچھا تھا۔ اتنی شیخیاں مارنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جیسے ہو ویسے ہی نظر آؤ۔ "سانس گزار" اب آئینور مل جائے گی سموئیل کو آئینور کی جاب کرنے کی وجہ سے اس کی رخصتی نہ ہوئی ہوگی رائٹر جی اینڈ پر آئینور اور سموئیل کو ملا دیجیے گا۔ ویسے شمشاد بھی کوئی ایسا برا تو نہیں تھا۔ "گوگل اسسٹنٹ" گاؤں میں رہنے والوں کو کیا پتا کہ گوگل کس بلا کا نام ہے۔ میں خود اگر موبائل سے ناول پڑھوں تو اماں کہتی ہیں...... اب موبائل سے پڑھ لیا ہے تو جو ہر مہینے منگواتی ہو وہ نہ منگوانا ہاہاہا۔ "دامن سحاب" مارچ میں لاسٹ قسط ہوگی چلو پھر تب ہی تبصرہ کریں گے۔ ویسے مہوش جی اسفند اور سلوئی کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ اس مہینے سب سے اچھی اسٹوری جو تھی وہ "کسوف" ویسے اس کا مطلب کیا ہے......؟ حمرہ نے اپنا بدلہ لے ہی لیا۔ بالکل ٹھیک کیا۔ سکندر خان اور پچھلے مہینے سرفراز۔ اس دنیا میں ایسے لوگ مل سکتے ہیں۔ خیر میں آپ کو ایک واقعہ بتاتی ہوں۔ ہمارے تلہ گنگ شہر کے ایک گاؤں ددھیال میں آمنہ نامی لڑکی کا بہت بے دردی سے قتل ہوا ہے۔ شادی کو ابھی ایک ہفتہ ہی ہوا تھا۔ کوئی نقاب پوش لڑکی ان کے گھر آئی اور چھری سے

اس کا سر ہی تم سے اللہ کر دیا اور اس کے خون سے لکھا۔ میں جیت گئی تم ہار گئیں۔ "استغفر اللہ" دیکھ کے اتنا خوف آتا تھا۔ بہت بے رحم ہوگئی ہے دنیا۔ خوف خدا ہی نہیں رہا۔ ہم سے تو ایک چوہی بھی نہ مرے۔ آخری افسانے کی بالکل سمجھ نہ آئی کہ رائٹر کہنا کیا چاہتی ہے۔ "یادوں کے دریچے سے" محبت ریت جیسی تھی۔ اچھی لگی۔ "کچھ موتی چنے ہیں" پہلا اور دوسرا موتی اچھا تھا کرن کتاب چھوڑ کے "نامے میرے نام" پہلا خط میرا۔ خوشی سے کہیں ہارٹ اٹیک ہی نہ آجائے۔

ثناء شہزادی کی طرف سے سب بہنوں کو السلام علیکم! مسکان نور ثناء کی طرف سے آپ کے لیے پیغام۔ کہ میں (یعنی ثناء) آپ کو بہت مس کرتی ہوں۔ اقصیٰ شہزاد کے نام بھی ایک پیغام ہے کہ اقصیٰ سے کہنا ثناء اس سے بہت محبت کرتی ہے۔ ثناء آپی بہت بہت شکریہ مجھے بھی آپ سے بہت محبت ہے "I Love u Sana appi"

عتیقہ، مجھے آپ کا تھینکس کہنا تھا۔ یار اتنا تکلف کیوں کیا تم نے بس منہ سے ہی تھینکس بول دیتیں۔ قارئین میں بتاتی ہوں آپ کو میرے ایک خط میں عتیقہ کا ذکر تھا اس نے مجھے جیولری گفٹ کی ہے جو میں نے اس کا نام ڈائجسٹ میں لکھا بہت نفیس جیولری تھی۔ عتیقہ تمہارا شکریہ۔ فائزہ آپی آپ کہاں غائب ہوگئی ہیں اپنی خیریت ہی بتادیں۔

آپی اس بار مجھے اتنا انتظار تھا کہ کرن کی سالگرہ میں میں بھی حصہ لوں گی لیکن اس بار آپ نے قارئین سے سوال کیے ہی نہیں۔ خیر کوئی بات نہیں۔

ج: اقصیٰ: اگلے سال آپ ضرور شرکت کیجیے گا کافی سالوں سے ہم قارئین سے ہی سروے کررہے تھے۔ کسوف "سورج گرہن کو کہتے ہیں۔"

نوشی مغل...... جلال پور بھٹیاں

فروری کی ماڈل ماشاء اللہ کیوٹ لگ رہی تھی اور ہیئر اسٹائل بھی اچھا لگا۔ ماشاء اللہ کرن چھیالیس سال کا ہوگیا مطلب گبرو جوان (ہاہاہا) میں تو تب دنیا میں بھی نہ آئی تھی جب کرن کا آغاز ہوا۔ کرن کے تمام اسٹاف اور مدیرہ جانو جی میری طرف سے کرن کی سالگرہ مبارک۔ ان شاء اللہ اس خوشی میں مارچ میں چاکلیٹ کیک منگواؤں گی اور میں بھی سیلیبریٹ کروں گی یہ خوشی (بہ شرطیہ زندگی) عائزہ خان سے ملاقات اچھی رہی۔ فائزہ جی اپنی عمر وی بیادیتے سانوں (ہی ہی ہی) "مقابل ہے آئینہ" اقصیٰ شہزاد اللہ عزوجل آپ کی تینوں خواہش ان شاء اللہ جلد پوری کرے گا۔ کہانیوں پر تبصرہ کرنے سے پہلے میں کچھ بتانا چاہتی ہوں رکو پہلے ہنس لوں میں (ہاہاہا) میری دو فروری کو منگنی تھی شکر ہے اس دفعہ انجام کو پہنچی۔ جہاں اب رشتہ ہوا کسی کو کوئی ایشو نہیں (شکر اللہ پاک کا) تو میں مشکل سے ہنسی کنٹرول کر کے بیٹھی ہوئی تھی فوٹو گرافر سیفی بھائی ہی تھے کہ مہمانوں نے پیسے دینے شروع کر دیے (ہاہاہا) ہجار ہجار (ہزار ہزار) کے نوٹ دیکھ کر مشکل سے کنٹرول کیا (ہاہاہا) پچھلی بار منگنی ہونے سے پہلے ہی خاندانی رنجشوں کی وجہ سے رشتہ ٹوٹ گیا تھا (خیر چنگا ہی ہویا) اور تین فروری کو ڈاکٹر صاحب سیفی بھائی واپس دبئی چلے گئے۔ آپی میری اس خوشی کو ایڈٹ نہ کیجیے گا پلیز۔ اب بات ہو جائے "انمول رتن" کی، بے شک ماں کی دعا بہت قیمتی ہوتی ہے۔ اشعر اور منیر کتنی اچھی تربیت کی تھی ثمینہ آنٹی نے آپ کی۔ لیکن توانوں تے سوریاں نوں اس گھر میں لاتے ہوئے شرم آئی ہے ناں، پاگلوں ماں کی دعا سے بڑھ کر قیمتی اثاثہ کوئی بھی نئی۔

"جویریہ مریم" کا افسانہ (ہاہاہا) عمر کے اماں ابا کی حد درجہ کنجوسی پر رج کے ہاسا آیا (ہاہاہا) اور عمر کی ساس تو ان سے وی چار پیر آگے نکلی (ہاہاہا) لیکن خیر ہوتا ہوگا، رواج بھی اپنا اپنا ماحول ہے (اسی کی کہہ سکدے ہن) "عطیہ خالد" کا افسانہ بھی نکالنے کے لیے انگلی ٹیڑھی کرنی ہی پڑتی ہے (ہاہاہا) بس عمر نے اسی محاورے کو چنا اور عمل کیا۔ ماں جی شکرانے دے نفل پڑھو کہ بہو زبان

درازی نہیں کرتی "کبھی کبھار" سارہ بہن کھوڑیاں چھڈ یا کرو۔ میرے خیال سے تو اکثر لڑکیاں میکے کی عزت رکھنے کے لیے خود سے بہت کچھ کرتی ہیں۔ ویلڈن شادی شدہ کڑیوں (آئی ایم پراوڈ آف یو) "گوگل اسسٹنٹ" شبو نام تو فرازانہ امین آپی نے میرا رکھا تھا نا! شبو کے اماں ابا کی حد درجہ سادگی پر بہت پیار بھی آیا اور کھل کر ہاسا وی (ہاہاہا) یقین کریں بار بار افسانہ پڑھنے کو دل کر رہا ہے (ہاہاہا) گڈ رائٹر صاحبہ بس مجھے ایسی ہی کہانیاں پسند ہیں۔ "شب ہجر" داؤد فی سابندہ لگا مجھے میرے خیال سے ہر لڑکے کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ غم کو پشت میں ڈال کر چلنے والا (اہم مم اف! یہ لڑکی کی عزت حالانکہ شانو نے کچھ کیا بھی نہیں فروی اپنے اوپر اٹھتی لوگوں کی نگاہیں برداشت کر رہی ہے اور بہادری ہے مشعل کی جو وہ خود اپنے شوہر کی شادی کر رہی ہے۔ اس دفعہ میرا دل تو بہت کیا کہ میں بھی بن کر بچی پنسل سے لکھوں (ہاہاہا) "تاش گھر" فٹے منہ زویا تیرے۔ اب تو جان چھوڑ دو صندل کی بیٹی کی اور کج شرم کرو وہ تمہاری بھتیجی بھی تو ہے۔ اور میرے خیال سے یہ لڑکا جو باریشہ کو پستول کے ذریعے ڈرا رہا ہے ناں یہ زویا کا ہی بیٹا ہے اور مزے کی بات شاید اسی لڑکے کو باریشہ سے محبت ہو جائے زویا نوں لگسی پتا (ہاہاہا)۔ "دامن سحاب" اسفند نوں سب پتا لگ گیا (گریٹ مہوش جی) اللہ مجھ سے تو سلوی کی یہ حالت نہ پڑھی گئی بس دلاور صاحب تو انوں میرے سمیت بہت سی بددعائیں لگ چکیں۔ بچھالے مصلاتے کرلے توبہ اور اسفند اب پچھتاوے کیا ہوت جب دے دی تم نے طلاق (امینہ) "اک لمحہ جاوداں (ہاہاہا) وحیدن ماسی تواڈی انی عمر ہو گئی کج دماغ سے وی کام لیا کرو آپ۔ خیر طیب تمہارا نام جتنا سوہنا ہے اتنی ہی گھٹیا حرکت کی تم نے۔ طیب اس اوچھی حرکت پر میری طرف سے در فٹے منہ قبول کرو۔ یہ کہانی بھی اچھی لگی مجھے۔

کدے ہس وی لیا کرو" جو رہی سو بے خبر رہی ہاہاہا نئی ایہہ مذاق سی مطلب کہ اس کی امی ہی اس سے تفتیش کر رہی تھیں شاید (ہاہاہا) درمیان والا سارا سین دکھی تھا اور لاسٹ پہ آ کے مجھے ہنسی سی آ گئی۔ (ہاہاہا) "کرن کرن خوشبو" میں گجرا اور گاجریں پسند آئی۔ "یادوں کے دریچے" سے خوب صورت نظم جس کا شاعر لاپتا تھا (ہاہاہا) ہی دل کو بھائی "کچھ موتی چنے ہیں" یہاں پہنچی تو "ناشکری" اور "فرق" "تحریر اچھی لگیں۔ صحت خانہ گئے تو وہاں ورزش کا بتایا جا رہا تھا۔ امی جی سے میری بےعزتی ہی میری ورزش ہے (ہاہاہا) جب تک خود کی تعریف میں امی جی سے دو چار گالیاں نہ سن لوں (ہاہاہا) ورزش نئی ہوتی، بٹ آئی ریئلی لو مائی مام (او مینوں وی انگریجی بولی آندی) ہاہاہا "تا ے میرے نام" مدیرہ جانو یار فرازانہ آپی سونیا ربانی، لائبہ ملک، ثمرین اسلم اور باقی سب کو واپس لائیں ورنہ میں جرمانہ لگا دینا (ہی ہی ہی) اللہ پاک آپ سب کڑیوں کو کرن میں لکھنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ تو مارچ کو میرے بھائیوں کی شادی کو تین سال ہو جائیں گے سو مدیرہ جی اینورسری دی مبارک دے دیں مینوں۔ نئی میری بھابھیاں نو (ہی ہی ہی) اقرا خضر، لبنیٰ اور حسینہ کو میری طرف سے دل کی گہرائیوں اور مینار پاکستان کی لمبائیوں سے خوش آمدید۔ مدیرہ جی مزے کی بات میرے دونوں بھائیوں کو پتا چل چکا کہ میں لکھتی ہوں۔ بس ابو جی کو نئی پتا۔ حسینہ کرم ڈیئر میں نے کون سا دوستی پہ ٹیکس لگایا ہوا (ہاہاہا) لیکن پیاری دوستی کرنا آسان اور نبھانا مشکل ہے نبھاؤ گی؟ اب شعر کے ساتھ خط کو ختم کروں گی کیا پتا کس کس کو شعر سمجھ آ جائے۔

ہنسنا سیکھنا پڑتا ہے نوشی
رونا تو پیدائش سے ہی شروع ہو جاتا ہے

ج:۔ نوشی سب سے پہلے تو منگنی کی ڈھیروں مبارک باد۔ اللہ تعالیٰ آپ کی زندگی میں خوشیاں ہی

خوشیاں عطا فرمائے آمین۔ آپ کے بھائیوں اور بھابھیوں کو شادی کی سالگرہ مبارک۔ "جو رہی تو بے خبری رہی" میں اس کی ماں بیٹے کے سلوک کی وجہ سے سب کچھ بھول گئی تھی۔ اس لیے بیٹی کو بھی نہیں پہچانتی تھی۔ آپ ماہنامہ کرن کے نمبر 021-3276617 پر فون کر سکتی ہیں۔

طیبہ شوکت......مرید کے

ٹائٹل گرل اتنی کیوٹ خاص کر آنکھیں بہت اٹریکشن والی تھیں۔ حمد و نعت ہمیشہ کی طرح پرفیکٹ۔ عائزہ خان سے ملاقات اچھی رہی۔ "تاش گھر" باریشہ اپنے ساتھ بہت غلط کر رہی ہے۔ "شب ہجر" پیاری کہانی تھی شاہ نور کا کردار پسند آیا۔ "ایک لمحہ جاوداں" کچھ خاص پسند نہیں آیا آفٹر آل میں پڑھا ہی نہیں۔ "سپاس گزار" میں دوبارہ اس عورت کو دکھایا ہی نہیں جو دو بچوں کے ساتھ انگلش سونگ گاتی جاتی ہے۔ اذکار کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ کیا مائیں ایسی بھی ہوتی ہیں۔ "دامن سحاب" اب دیکھنا کیسے پچھتاتا ہے یہ اسفند۔ پہلے کہا تھا یقین کرلو تب کیوں نہیں کیا۔ آخری قسط کا انتظار رہے گا۔ مہوش جی بس ایک خواہش ہے جرار اور حیا کا آخر یہ سین ضرور لکھیے گا۔ "کسوف" پڑھ کے تو دل ہی اداس ہو گیا۔ دل کیا کہ جیسے کہانی کے اینڈ پہ جیسے لڑکی کے گردن پہ نشان تھا۔ ایسے ہی ولی احمد اور اس کے باپ کی گردن پہ گلا دبا کے بنا دوں۔ حرام خور۔ سوری کچھ زیادہ بول گئی۔ بس ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ٹرپ پہ جب حمرہ جنگل میں چلی جاتی ہے۔ وہاں کون تھی یا اسے وہم ہوا تھا کیونکہ گل تو وہ خود تھی۔

افسانے سب ہی اچھے تھے۔ اب مہوش جی کے بعد کوئی اچھی سی رائٹر سے لکھوائیں جیسے فرحت اشتیاق نازیہ کنول نازی، ام مریم، منعم ملک وغیرہ۔

ج:۔ طیبہ خط لکھنے کا بہت بہت شکریہ۔ گل کو اپنا ماضی یاد آ گیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ہی دیکھ رہی تھی۔

صائمہ ریاض ہاشمی......فیصل آباد

کرن 16 فروری کو میرے ہاتھ لگا۔ شہر سے دور آ بسے ہیں اس لیے کرن اب 13 یا 14 کے بجائے سولہ پہ چلا گیا آپا جی کافی لمبے عرصے بعد حاضر ہوئی لیکن کرن کے ساتھ رابطہ رہا۔ کرن کی خوشبو ہمیشہ دل میں روح میں رچی بسی رہی۔ جی تو سب سے پہلے "حمد و نعت" سے دل کو ٹھنڈک ملی پھر عائزہ بیوٹی گرل کا انٹرویو نو ڈاؤٹ اچھا لگا۔ پھر افسانے پڑھے بھی ٹھیک لگے۔ لیکن "انمول رتن" میں سیٹھ صاحب تو مجھے اپنے گھر کی کہانی ہی لگی۔ میرے گھر میں بھی "انمول رتن" ہے اللہ اسے زندگی تندرستی دے کامیاب کرے میرا بیٹا احسن علی۔ آپی، کہانیاں سب اچھی تھیں سلسلہ وار ناول میں "تاش گھر" میں باریشہ کے ساتھ اچھا ہو یار اور اس کے دل سے کیوں چاند امی کے لیے میل نہیں نکل رہی۔ "دامن سحاب" کو اتنا طویل کر دیا ہے میں تو بیزار ہو گئی ہوں "سپاس گزار" ڈھیرے ڈھیرے عروج پہ۔ میمونہ صدف ویلڈن۔ لفظوں کا انتخاب سپر تالیاں ہاہاہا۔ ناولٹ کی بات ہو جائے (ہم ہم) جی تو ام اقصیٰ جی نے بازی جیت لی۔ نام ہی کافی ہے کہانی کا موضوع پرانا بٹ تحریر اچھی تھی۔ خیر سارا رسالہ پڑھا نہیں ابھی خطوط بھی پڑھے لیکن سب نام پرانے تھے۔ نئی پرانی سب بہنوں سلام سلام۔ بس ہم پھر حاضر ہیں محفل میں۔ آپی، وہ سلسلہ دوبارہ شروع کریں جس میں۔ قصے زندگی کے مختلف واقعات بھیجے جاتے ہیں کرن کے لیے ڈھیروں دعائیں۔

پرانی قاری بہنوں مجھے یاد نہیں کیا۔ شکوہ ہے دل میں ہاہاہا۔ مذاق کر رہی ہوں۔

ج۔ صائمہ بہت دن بعد آپ اس محفل میں شریک ہوئیں۔ اولاد اچھی ہو تو دنیا میں جنت مل جاتی ہے۔ اللہ آپ کے بیٹے کو کامیاب و کامران کرے۔ آمین۔ کچن کی ریسپیز میں نام نہیں لگ سکتا۔ ایسا پیٹرن نہیں ہے۔

☆☆